''چہارسُو''

...... جنت جہنم اور دوسرے افسانے ......

اے خیام بسیار نویس فنکار نہیں ہے۔ وہ افسانے کے بیج کو اپنے تخلیقی باطن میں پالتا رہتا ہے حتیٰ کہ زندگی کی واقعاتی رپورٹ افسانہ بن کر فن کا شاہکار کہلانے کی مستحق ہو جاتی ہے۔ وہ چیخوف کے اس نظریے سے متفق ہے کہ افسانہ بُت تراشی کا فن ہے۔ فن کار نے فن کا جوت اپنے ذہن میں تخلیق کر رکھا ہے، وہ پتھر کے تودے میں موجود رہتا ہے جسے فن کار تراش تراش کر بازیافت کرتا ہے۔ اے خیام نے مثال اچھی دی ہے لیکن میرے خیال میں افسانہ بت تراشی کے مقابلے میں ایک سیّال فن ہے جو تمام تر حقیقی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ فن کار واقعات کو گیلی مٹی سے اٹھاتا اور اپنے تخلیقی چاک پر گردش دے کر افسانے کا روپ دیتا ہے۔ کبھی وہ ایک ہی کہانی کی مختلف صورتیں بدلنے کا فریضہ ادا کرتا ہے اور کبھی چاک کی گردش ہر مرتبہ کہانی کا روپ برآمد کر دیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر آغا نے اے خیام کے افسانوں کے پہلے مجموعے ''کپل وستو کا شہزادہ'' کے پیش لفظ میں تو اول الذکر نقطے کو ہی اے خیام کی انفرادیت قرار دیا ہے۔ انہوں نے لکھا:

''کپل وستو کا شہزادہ'' میں اے خیام نے ایک ایسی بہت پرانی کہانی سنائی ہے جو آج تک پرانی نہیں ہوئی۔ ہر زمانے اور ہر یگ میں یہی ایک کہانی روپ بدل بدل کر سامنے آئی ہے۔''

وہ ''کپل وستو کا شہزادہ'' سے چل کر جب ''خالی ہاتھ'' کے آخری افسانے تک پہنچتا ہے تو ارتقائے فن کے اگلے سفر پر گامزن نظر آتا ہے اور میں اب کہہ سکتا ہوں کہ افسانہ اے خیام کی شخصیت میں داخل بھی ہے اور یہی اس کا خارج بھی ہے۔

یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ اے خیام نے ''جس عہد میں سانس لیا ہے، اسی عہد میں اپنے فن کی اساس پر زندہ رہنے کی کوشش کی''، اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا۔

......ڈاکٹر انور سدید

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۴۵۰ روپے، دستیابی: ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی۔

...... مسافرت ......

''مسافرت'' افسانوں کا مجموعہ ہی نہیں انسان کی ذات سے کائنات کا سفر، سوچ کو کردار میں ڈھالنے کا سفر، مکاں سے لامکاں کا سفر، اندھیروں سے اجالوں کا سفر، خودغرضی سے بے خودی کا سفر، بت پرستی سے بت شکنی کا سفر، اور شرک سے الوہیت کا سفر، یہی نہیں بلکہ جذبۂ شوق سے عشق مجازی کا سفر اور عشق مجازی سے عشق حقیقی ہے جو قاری کو نہ صرف ساتھ لے کر چلتا ہے بلکہ اسے رموز ذات، رموز کائنات اور خالقِ کائنات سے آشنا کرتا ہے۔ ان کے افسانے انسانی عمومی رویوں پر مشتمل وہ کہانیاں ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں ہمارے ارد گرد جنم لیتی ہیں جنہیں انہوں نے سپردِ قلم کرتے ہوئے اپنے خلوص اور صادق جذبوں کی روشنائی سے اس طرح روشن کیا ہے کہ معرفت کا نور کبھی اپنے جلالی اور کبھی جمالی رنگ میں ظاہر ہو کر قاری کو روشنی عطا کرتا ہے۔ ایسی روشنی جو درون خانہ کے مخفی اندھیروں کو مسافرت عطا کر کے اجالوں کے نگر میں لے جاتی ہے۔ افسانوں میں بین السطور مصنف کا درددل، ہمدردیٔ خلائق، تعلق باللہ، عشقِ حقیقی اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک افسانہ نگار سے بڑھ کر ایک ناصح اور مصلح محسوس ہوتا ہے۔

معاشرتی ناہمواریوں، معاشی عدم استحکام، ذہنی کشمکش اور قلبی کیفیات کو متحرک اور جاندار کردار ادا کر کے اصلاحِ معاشرہ اور اصلاحِ نفس عام فہم زبان میں اس روانی اور سلاست کے ساتھ کی گئی ہے کہ قاری اس مسافرت میں خود کو بھی مسافر محسوس کرتا ہے اور اس صوفی افسانہ نگار کے آستانے سے نصائح اور معرفت کے گوہر انمول لئے بامراد لوٹتا ہے۔

......شفیق مراد

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، دستیابی: دعا بک ایجنسی، امین پور بازار، فیصل آباد۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۵،شمارہ:نومبر،دسمبر۲۰۱۶ء

رابطہ:537/D-1‘ گلی نمبر 18، ویسٹریج-III‘ راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون:5490181-51-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز
اقبال مجید
کے نام

قلم کمان

فاری شا

(اسلام آباد)

نام : اقبال مجید
تاریخ پیدائش: ۱۲۔جولائی ۱۹۳۴ء، مرادآباد، یوپی۔
تعلیم : ایم۔اے۔پولیٹیکل سائنس
بی ایڈ

عملی زندگی:

۱۔ ۱۹۷۵ء میں آل انڈیا ریڈیو، بھوپال میں بطور پلانر/پروڈیوسر، اردو پروگرام۔
۲۔ ۱۹۹۰ء میں ترقی پاکر اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر (کلاس ا پوسٹ، گورنمنٹ آف انڈیا)

تعلیمی خدمات:

۱۔ ۱۹۷۵ء سے قریب پندرہ سال یوپی کے محکمہ تعلیم میں بطور ہائی اسکول ٹیچر خدمات انجام دیں۔
۲۔ ۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۳ء میں بطور سیکریٹری (ایم پی) اردو اکیڈمی سے ریٹائرمنٹ
۔

ادبی خدمات:

۱۔ ۱۹۵۳ء میں بطور افسانہ نگار ادبی دنیا میں قدم رکھا اور اب تک سو کے قریب اردو کہانیاں برصغیر کے معیاری ادبی جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔

تخلیقات:

افسانے

۱۔ دو بھیگے ہوئے لوگ ۱۹۷۰ء
۲۔ ایک حلفیہ بیان ۱۹۸۰ء
۳۔ شہر بدنصیب ۱۹۹۷ء
۴۔ تماشا گھر ۲۰۰۳ء
۵۔ آگ کے پاس بیٹھی عورت ۲۰۱۰ء

ناول:

۱۔ کسی دن
۲۔ نمک

تراجم:

۱۔ پوشاک روسی، ہندی، مراٹھی زبانوں میں منتخب کہانیوں کے تراجم
۲۔ میراث ہندی اور انگلش میں منتخب کہانیوں کا ترجمہ
۳۔ دو بھیگے ہوئے لوگ ترجمہ چوہدری محمد نعیم
۴۔ پیٹ کا کیچوا منتخب کہانیوں کا ترجمہ از محمد عمر میمن

ڈرامے:

۱۔ کتّے مدھیہ پردیش میں پانچ اسٹیج شو
۲۔ چاندنی کا زہر بھوپال، لکھنؤ، مہشو میں چار شو
۳۔ ٹسر پھوسنا مدھیہ پردیش میں پانچ اسٹیج شو
۴۔ تکیہ سنگیت ناٹک اکیڈمی، لکھنؤ کا منتخبہ
۵۔ جرم اور سزا روسی ناول ''جرم اور سزا'' سے متاثر ہو کر

اعزازات:

۱۔ اتر پردیش اور مدھیہ پردیش میں بی۔اے کے نصاب میں اقبال مجید صاحب کی چند کہانیاں شامل کی گئیں۔
۲۔ ڈاکٹر جگدمبا دوبے نے الہ آباد یونیورسٹی اور شکیل احمد خان نے برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال سے اقبال مجید صاحب کی کہانیوں پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

انعامات:

۱۔ میر تقی میر نیشنل ایوارڈ، ایم پی اردو اکیڈمی ۹۲۔۱۹۹۱ء
۲۔ شیکھر سمن اسٹیٹ ایوارڈ، ادارہ ثقافت، ایم پی ۰۰۔۱۹۹۹ء
۳۔ غالب ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اردو ڈرامہ
۴۔ بہادر شاہ ظفر قومی ایوارڈ، اردو اکیڈمی، دہلی ۰۷۔۲۰۰۶ء
۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ، یوپی اردو اکیڈمی، لکھنؤ ۲۰۱۵ء
۶۔ ریڈیو کے لیے بے شمار فیچر لکھنے پر مختلف ایوارڈ
۷۔ آکاشوانی سالانہ ایوارڈ، گیس کے سانحے پر اختراعی فیچر ۸۸۔۱۹۸۷

نشرواشاعت:

- کئی درجن ادبی، معلوماتی اور ڈاکومنٹری فیچرز کی تحریر و ہدایت۔
- کئی ادبی اور ثقافتی پروگرام ترتیب دیے
- انتظامی کنٹرولر، اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر (۹۲۔۱۹۹۰ء)
- آل انڈیا ریڈیو پر بارہا ماہر مقرر کے طور پر مدعو کیے گئے۔
- پچاس سے زیادہ ریڈیو کے ڈرامے تحریر کیے جن میں سے کئی آل انڈیا ریڈیو کے نیشنل پروگرام میں نشر کیے گئے۔

موبائل: 0091-9893764746

رابطہ:

مکان نمبر ۲، سورج فارمز، نارتھ ادتیہ ایونیو، ائیرپورٹ روڈ، بھوپال۔ 462031، ایم پی۔

نسبتِ قلبی

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

الہ آباد
۱۸۔جولائی ۲۰۰۳ء

پیارے اقبال مجید، السلام علیکم۔

تمہارے دو خط ملے، شکریہ۔ میرا خیال ہے ہم دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھنے یا سمجھانے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ میری طبیعت ہرگز تم سے کبیدہ نہیں ہے لیکن ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے گویا تم کچھ اس خیال کے ہو کہ میں اگر تمہارا ہم خیال ہو جاؤں تو دنیا کے سب کام ٹھیک چلیں گے۔ لیکن دنیا کم بخت اتنی آسانی سے مانتی نہیں ہے۔ میرے خیال میں اتنا ہی کافی ہے کہ میں تمہیں اعلیٰ درجے کا افسانہ نگار سمجھتا ہوں اور تم مجھے ایک شریف آدمی اور اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے ہو۔ باقی اور کسی کو کسی سے لینا دینا کیا ہے۔ دوسری بات یہ انسان کے دل میں درد ہو اور وہ کچھ چیزوں کو خلوص کے ساتھ محسوس کر سکتا ہو تو یہی کافی ہے۔

شمس الرحمن فاروقی

دہلی
۱۱۔جون ۱۹۸۶ء

مکرمی اقبال مجید صاحب، السلام علیکم۔

میں لکھنؤ گیا تھا انجمن کی گولڈن جوبلی میں بلا بلاوے کے۔ بلا واقمر رئیس صاحب نے اتنی دیر کو بھیجا کہ میں لکھنؤ جا چکا تھا۔ انجمن کی اکثریت جو دنیا بھر کے مظلوموں کے غم میں گھلی جاتی ہے وہ اردو کے لیے ذرا بھی ہمدردی کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اردو والوں نے بائی کاٹ کر رکھا تھا۔ احتجاج جاری رہنا ضروری ہے۔ سردار جعفری نے طویل عرصے تک اردو کے لیے لیش پال سے لڑائی لڑی تھی۔

آپ کا دہلی آنا ہو تو فون کر کے پوچھ لیجیے گا۔ میں ہوں تو ملاقات ضرور کیجیے۔ میں تو اپنے پرانے ساتھیوں کو بھولتا نہیں ہوں۔

حیات اللہ انصاری

دہلی
۳۔مئی ۱۹۹۸ء

محبی اقبال مجید، تسلیم۔

کتاب پڑھ ڈالی اتنی توجہ اور محبت سے جو تمہارا حق ہے۔ مگر کیا کروں۔ میں عدّو وچچا سے لے کر پوشاک تک ہی سے اقبال مجید کا رسیا ہوں اس سے آگے پیچھے میرا اقبال مجید کہیں کھو گیا ہے اور مجھے ڈھونڈنے سے نہیں ملتا البتہ کہیں کہیں کچھ پرچھائیاں سی ملتی ہیں اور بس۔ وہی حال اس کتاب کا بھی ہوا۔ باوجود خوش پوشاکی اور دیدہ زیبی کے وہ دردمندی وہ بے محابا طرز تحریر کیا ہوا۔ میرا اقبال مجھے واپس کر دو اور باقی سب کچھ اعزازات، انعامات اور سرفرازیاں تم لے جاؤ۔ بقول فیضؔ:

آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہو پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمر گزشتہ کی کتاب

اقبال مجید میرا خیال ہے کہ ہم فسطائی دور میں زندہ ہیں اس لیے اب حق گوئی اور راست گوئی خطرناک بھی ہے اور ضروری بھی۔ اس پر غور کرنا۔

محمد حسن

علی گڑھ
۲۱۔اکتوبر ۲۰۰۳ء

برادرم اقبال مجید صاحب، سلام مسنون۔

مجھے ندامت ہے کہ کتاب کی رسید بر وقت نہ بھیج سکا۔ ادھر ذاتی الجھنوں کے باعث کچھ ایسا مصروف رہا کہ تمام افسانے پڑھنے کے باوجود اپنا تاثر لکھ کر بھیجنے کی نوبت نہ آئی۔ ''تماشا گھر'' تقریباً دو ماہ قبل مل گیا تھا۔ آپ کے دوسرے افسانوں کی طرح میں نے تمام تحریریں نہایت انہماک اور توجہ سے پڑھیں۔ آپ کے بیانیہ کی ہمہ جہتی اور کہانی کے بنیادی خاکے پر آپ کی گرفت کا ہمیشہ سے قائل ہوں۔ اس مجموعے میں افسانہ نگاری کے بعض اور بھی عقدے کھلے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ کے فکشن پر تفصیلی اور تجزیاتی کام ہونا چاہیے۔ کوئی اچھا ریسرچ اسکالر ملے تو اس کو آپ کی تحریروں پر تحقیقی اور تجزیاتی موضوع دیا جائے اور سلیقے سے اردو ادب کو آپ کی دین کا احاطہ کرنے کی سبیل نکلوائی جائے۔ ویسے میں بھی بہت دنوں سے اپنے تاثرات لکھنا چاہتا ہوں۔ کسی ایک کتاب ناول/افسانہ کے حوالے سے۔ انشاء اللہ جلد ہی کچھ لکھوں گا۔

میں نے آپ کا تبصرہ نہیں دیکھا۔ کہیں سے حاصل کر کے پڑھوں گا۔ ویسے ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ پر یہ کرم کیا۔ پچھلے دنوں شہریار صاحب اور رضوان صاحب سے آپ کا تذکرہ رہا۔ خدا کرے آپ ہر طرح بعافیت ہوں۔

ابوالکلام قاسمی

حیدرآباد
۲۴۔جولائی ۱۹۹۸ء

اقبال صاحب، آداب عرض۔

آپ نے انعام کی مبارکباد دی۔ آپ کے خلوص کا شکریہ کیا ادا کروں۔ آپ نے لکھا ہے یہ انعام ڈاک میں ہونے والے خرچ سے کم ہے۔ لیکن اخراجات تو اور بھی ہیں۔ میں اگر ایک ویمن کالج کی آفر قبول کر لیتی تو پروفیسر شپ سے ریٹائر ہوتی۔ مگر بقول انور کے ایک پاگل پن سر پر سوار ہے کہ اپنی سُدھ بُدھ کھو کر سارا دن سر جھکائے لکھتی رہتی ہوں۔ نہ تو کبھی اپنے آپ کو کیش کروانے

کا خیال آیا نہ دہلی کی ادبی سیاست کی طرف دیکھا۔ آپ کی نئی کہانی کہاں آ رہی ہے اسے منتظر ہوں پڑھنے کے لیے۔

جیلانی بانو

لندن

۳۱۔جنوری ۱۹۹۷ء

محبی ومکرمی اقبال صاحب، بہت بہت سلام، محبتیں اور دعا ہائے صحت وسلامتی قبول فرمائیے۔

ایک اور دلچسپ اور ناقبل فہم صورت بھی توجہ طلب ہے۔ میں ہندوستانی ہوں، پاکستان جانے میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ میری بیگم حیدر آبادی ہیں وہ لوگ بھی پاکستان جانے سے گریزاں رہے۔ میری بیٹی حیدر آباد میں پیدا ہوئی اس نے دہلی اور لندن میں پڑھا۔ ہمارے داماد حیدر آبادی ہیں۔ وہ امریکہ یورپ میں زیرِ تعلیم رہے وہ بھی پاکستان نہیں گئے بلکہ اہلِ پاکستان کے بارے میں ناک سکوڑ کر بات کرتے ہیں تاہم ہمارا نواسہ جو یہیں پیدا ہوا سفر اس نے ہندوستان، لیبیا، جاپان، امریکہ اور یورپ کے کیئے آج تیرہ برس کی عمر پر زبردست پاکستانی ہے شلوار قمیض پہنتا ہے گھر میں اردو بولتا ہے قرآن شریف ختم ہوگیا ہے مگر انگریزی میں ترجمہ پڑھا کرتا ہے یورپ اور مسیحیت سے بنیاد پرستوں والی نفرت اور حقارت ہے، صرف وہی کرکٹ میچ دیکھتا ہے جس میں پاکستانی کھیل رہے ہوں۔ اب اس پاکستانیت کی توضیح وتوجیہ کیا ہوسکتی ہے آپ بھی سوچئے گا۔

قیصر تمکین

کراچی

۶۔جنوری ۱۹۹۹ء

برادرم اقبال مجید، تسلیمات۔

آرٹ عام زندگی سے زیادہ پُرمایہ اور پیچیدہ ہوتا ہے چونکہ اس میں زندگی کی مرقع نگاری کے ساتھ مصنف کا زاویہ نظر بھی شامل ہوتا ہے اور یہ زاویہ نظر جو ایک واقعہ، ایک کردار اور ایک منظر کو زیادہ متمول یا زیادہ غریب بنا سکتا ہے۔ تم چیزوں کو دیکھتے ہی اس طرح سے ہوکہ خول سے زیادہ گودے میں گھُس جاتے ہو اور جس کے بارے میں لکھتے ہو وہ خود اپنے اندرون کو دیکھ کر اکثر شرمندہ اور بہت کم شاداں ہوسکتا ہے۔ تم انسان کے اندر چھپی ہوئی کمینگیوں کے شکاری ہو اور کبھی کبھی خود بھی بھول جاتے ہو کہ اگر یہ کام مستقل بنیادوں پر کیا جانے لگے تو اس کام میں ایک نوع کی Morbidity آ جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑا فنکار وہی ہے جو بدصورتیوں، کمینگیوں اور ناہموار رویّوں میں بھی حسن تلاش کر سکے بلکہ اس سے مڈبھیڑ کروا سکے تاکہ وہ خفت نہ ہو جو ممنوعہ علاقوں میں گھومنے والے کو جواب دہی کے عذاب سے ہوتی ہے۔ جدید دور کی ترقی پسندی میں اب ابلاغ بھی ناقابلِ ابلاغ سچائیوں کی معرفت ہی میں مضمر ہے۔۔۔

محمد علی صدیقی

دہلی

۶۔دسمبر ۲۰۰۱ء

ڈیئر اقبال مجید، السلام علیکم۔

بات یہ ہے کہ اب شعر وادب پر لکھنے کی تحریک اور ترغیب نہیں ہو رہی۔ عجیب سی بیزاری پیدا ہوگئی ہے۔ ہاں کچھ دوسرے مسائل اور دوسرے موضوعات پر لکھنے کی خواہش زور پکڑ رہی ہے جیسے قدیم ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی اساطیر (ان سے میں تاشقند میں خاصہ مانوس ہوگیا اور کئی لکچر بھی دیئے) میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب، فلسفہ، ادب اور علم الاصنام کو نظر انداز کر کے اچھا نہیں کیا۔ وسطی ایشیا ہو، انڈونیشیا ہو یا ایران اور دوسرے ممالک وہاں کے مسلمان ماقبل اسلام کی اپنی تہذیبی روایت پر فخر کرتے ہیں۔ بہرحال یہ لمبی بحث ہے۔۔۔

قمر رئیس

لکھنؤ

۷۔فروری ۲۰۰۱ء

پیارے اقبال مجید۔

تمہارا خط ملا۔ تم نے لکھنؤ کو شہرِ نگاراں لکھا ہے۔ مجھے پڑھ کر بڑا مزہ آیا۔ کبھی ٹیگور کی کابلی والا پڑھی تھی وہ یاد آ گئی کہ وہ افغانی جب پندرہ سال کے بعد جیل سے چھوٹا تو اس نے سب سے پہلے پانچ سال کی مُنّی کے لیے چوڑیاں خریدیں۔ اس کے ذہن میں یہ نہیں آیا کہ وہ اب بیس سال کی جوان لڑکی ہوگی۔ اسی طرح جس نگار کی وجہ سے تم اس کو شہرِ نگاراں کہتے ہو وہ بیچاری کب کی بوڑھی ہو گئی، دانت گر گئے، آنکھوں کے پپوٹے لٹک آئے۔ اس کے عشاق بھی اب نیم کور، گراں گوش اور گھٹنوں کے درد سے معذور ہوگئے ہیں۔ نہ کوئی دانش محل رہ گیا، نہ نعمت اللہ روڈ نہ ادبستان۔ سبطِ اختر آیا تھا اسی کابلی والے کی طرح بچپن۔ ہم سب سے مل کر چلا گیا۔ ہم میں اتنا بھی نہیں کہ ایک دوسرے کو دیکھنے جائیں لکھنؤ میں تو لوگ ایک دوسرے کو فون بھی نہیں کرتے۔

شارب ردولوی

انسانیت

مانا کہ آپ بحرِ علوم و فنون ہیں
اصنافِ شش جہات کے شہکار ہیں تو کیا
انسانیت کا گوہرِ مطلوب چاہیے
اسنادِ علم و فضل کے انبار ہیں تو کیا

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

میں نقشِ پا کی طرح

اقبال مجید

تخلیقی سفر کا سفر نامہ لکھنا ان لوگوں کے لیے بڑا مشکل کام ہے جنہوں نے نہ تو کبھی کوئی ڈائری رکھی اور نہ جن کی یادداشت ہی مضبوط ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے ایک دلچسپ بات یہ ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ یہ سفر نامہ اپنی لاعلمی، جہالت اور ان اعتقادات کے سوائے اور کیا ہوسکتا ہے جو بنتے گئے اور ٹوٹتے گئے۔ دراصل ہماری نسل جب سن بلوغ کو پہنچی تو وہ زمانہ سن پچاس پچپن کا زمانہ تھا اور اس وقت تابندہ ادیب شاعر اپنا اپنا مشن پورا کر کے اور اپنی اپنی فتوحات کی ٹرافیاں اپنے ڈرائنگ روموں کی دیواروں پر سجا چکے تھے۔ سجاد ظہیر اور سردار جعفری وغیرہ کو جو کچھ اچھا برا ملنا تھا مل چکا تھا، آزادی دلانے والے ایک ایک کر کے ملک سے اٹھتے جا رہے تھے اور جو خواب کچھ دنوں پہلے تک خاصے صاف ستھرے دکھائی دے رہے تھے انہوں نے دھندلانا شروع کر دیا تھا۔

اس بات پر آج نہ افسوس کرنا چاہیے اور نہ خوشی کہ اس وقت کے ہمارے ساتھ کے نوجوان ادیبوں کی جو پہچان بنی اس کی تروتازگی، اس کی چمک دمک، اس کی انفردیت (اگر کچھ ذرا سی بھی تھی اور وہ قائم ہو رہی تھی) نئے عہد کے آشوب زمانہ اور تغیراتِ وقت کی آندھی کے سبب ہم لوگ اسے مزید قوت اور زندگی نہ دے سکے، کچھ ایسا زمانہ منقلب ہوا کہ احمد جمال پاشا کا طنز و مزاح بھولی بسری یادیں بن گیا، قاضی عبدالستار کا پیتل کا گھنٹہ اپنی ٹریجڈی کھو بیٹھا، قمر رئیس کے تنقیدی اور ادبی نظریات جن میں بڑی دھار تھی، بجھے ہوئے چولہے کی راکھ بن کر رہ گئے۔ رتن سنگھ اردو افسانے کا گرونانک جیسی کوئی مقدس چیز بن کر رہ گیا، حسن عابد پاکستان کی رجعت پسندی کی ٹی بی سے مزاحمت کی جنگ میں اپنی شاعری کو جھونکتے جھونکتے مر گیا۔ سبط اختر کو مزدوروں کی جنگ میں شامل ہونے پر حکومت کے عتاب سے گزرنا پڑا۔ میرے تخلیقی سفر کے آغاز کی کُل جمع پونجی یہی احباب تھے جنہیں اوڑھتا اور بچھاتا تھا۔ رام لعل کو ہم لوگ شرارت سے ڈیڈی کہہ کر پکارتے تھے اور وہ ڈیڈی تھے بھی۔ یاد رہے مجھے شاہ جہاں پور ریلوے اسٹیشن کی وہیلر بک اسٹال پر ''بیسویں صدی'' میں چھپے ان کے افسانے سن پچاس اکیاون میں الٹ پلٹ کر دیکھا کرتا تھا اور اس میں چھپے افسانہ نگاروں کے ناموں کے آگے ایم۔اے، بی۔اے کی ڈگریاں لکھی دیکھ کر خاصا مرعوب ہوا کرتا تھا۔ اس وقت اقبال فرحت اعجازی ''شمع ماہنامہ'' میں ''حلال زادے'' جیسی دھانسو کہانی لکھ رہا تھا۔ میں جب انٹرمیڈیٹ میں تھا تو میں نے کسی موٹے سے رسالے میں جیلانی بانو کی آنکھیں پھاڑ قسم کی کوئی کہانی پڑھی تھی۔ اس کا لہجہ، اس کی فضا، اس کی نثر اور اس کا دھیما دھیما بیانیہ۔۔۔ بہت سے افسانہ نگار اس وقت ایسے تھے جو ہم جیسے قاری کی کمر توڑ کر رکھ دیتے تھے اور اُن کی کہانیوں کے ملبے کے نیچے سے خود کو نکالنا ہمارے لیے مصیبت ہو جایا کرتا تھا۔ ان میں اے حمید، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی کو تو میں آج بھی نہیں بھولا ہوں۔ یہ سارے کے سارے لوگ میرے ایامِ جہالت کے دور میں میری پیٹھ پر پڑے افسانوی فن کے تازیانے تھے جن کے زخموں کو بہت دنوں میں نے چاٹا۔ ان کی مرہم پٹی کرنا تو آتا نہ تھا بس ان تازیانوں کی چوٹوں اور ان کے نشانوں کو سہلاتا رہا۔ سعادت حسن منٹو کو پڑھنے کے مجھ پر دو زمانے گزرے ہیں، اسی طرح جس طرح عابد سہیل سے میری دوستی کے دو زمانے گزرے ہیں۔ پہلا زمانہ جب دسویں درجے میں طالب علمی کے زمانے میں کالج کی لائبریری سے میں نے مائیکل شولوخوف کی ناول ایشو کروائی تھی اور دوستوں پر رعب ڈال کر کچھ دنوں بعد پڑھے بغیر واپس کر دی تھی یعنی بڑی بڑی کتابوں کو پاس رکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، انہیں الٹنے پلٹنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا، مگر ان سے پنجہ کشی کی طاقت اور ذہنی استعداد اور قوت ابھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ پہلے دور میں جو جہالت کا دور تھا، نہ تو مجھے اپنے بعض دوستوں سے کچھ ملا اور نہ بڑی کتابوں اور بڑے ادیبوں سے البتہ علم و ادب کی خوشبو کی چاہ ضرور ان کی صحبت نے پیدا کی۔ اس پہلے دور میں میں نے گورکی کو پڑھا، دوستوئیفسکی کو پڑھا، سعادت حسن منٹو کو پڑھا اور میں نے اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ عابد سہیل بھی ہمارے کچھ ایسے ہی زمانے کے دوست تھے اور ہیں جنہوں نے دوستی تو قائم رکھی لیکن اپنے ایام جہالت میں ہم سے مسلسل اور بامعنی علمی ادبی مکالمہ قائم رکھنے میں پہلو تہی سے کام لیا یا پھر اس طرح نہیں جیسے کہ دوسرے دوستوں کی ساتھ قائم ہوتا رہا۔ دوستوئیفسکی، گورکی، منٹو اور بھی کئی بیرونی اور ملکی اعلیٰ ادیبوں کی تخلیقات تھیں جن کی ایام جہالت میں زیارت تو کی مگر کچھ فیض نہ اُٹھا سکا۔ آگے چل کر جب کچھ اور سمجھ بوجھ پیدا ہوئی تو وہی ادیب پھر ہمارے ہاتھوں میں واپس آ گئے تو ہمیں لگا کہ ہمارے دورِ جہالت کی اتنی قدر و قیمت تو ضرور تھی کہ اس نے ہماری راہ متعین کرنے میں ایک مثبت رول ادا کیا۔ آج لگتا ہے کہ کسی تخلیق کی بلندی اور حسن کا دارومدار اس بات پر بھی ضرور ہے کہ کوئی اسے کسی ذہنی سطح پر پہنچ کر، کس قدر فنی ذوق کو نکھار کر، کیسی فکری بلوغت کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ شاید میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میری طویل جہالت نے چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، مجھے بتائے بغیر اس لائق بنانے کی کوشش کی کہ میں دنیا کی بڑی ادبی تخلیقات کا شایان شان خیر مقدم کرنے کے لائق خود کو بنا سکوں۔ ان میں وہ سلام مچھلی شہری اور مجاز بھی شامل تھے جو کافی ہاؤس میں ہماری ٹولی کو صرف مسکرا کر دیکھ لیا کرتے تھے۔ سرور اور احتشام بھی شامل تھے جو ہمیں کلاسوں میں پڑھاتے تھے۔ آنند نرائن ملاّ بھی شامل تھے جنہیں ہم کبھی کبھی سلام کیا کرتے تھے اور وہ ڈاکٹر محمد حسن بھی بلاشبہ شامل تھے جنہوں نے ہمیں بے شمار محبتوں کی دولت سے نوازا تھا اور برسوں ہمارے ساتھ خلوت و جلوت میں سخت و سست، پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر طرح کا مکالمہ قائم رکھنے

میں کبھی دریغ نہ کیا تھا۔ہم سارے انسان اپنا ایک عہد لے کر اور اس عہد میں ایک خاص رول ادا کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں، ہمارے اس رول پر جوانی آتی ہے اور وہ پھول کی طرح کچھ دیر مہکتا ہے پھر مرجھا جاتا ہے یہاں تک کہ سوکھ کر شاخ سے جدا ہو جاتا ہے۔محمد حسن کی ذہانت، فطانت، علم، وژن، فکری بالیدگی سب پر آج دہلی کا وہ دبیز کُہرہ چھا چکا ہے جو کہرہ پنجاب کی طرف سے آنے والی ٹرینوں کو آٹھ آٹھ گھنٹے لیٹ(Late) کر دیا کرتا ہے یہاں تک کہ انتظامیہ ان ٹرینوں کو منسوخ کر دیا کرتی ہے۔بہر حال تاریخ کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ کون فرد، یا جماعت یا قوم کب کس انجام سے گزر رہی ہے اور وہ انجام خوش انجام ہے یا عبرت ناک۔تاریخ تو ہر عہد کا ایک Pattern وضع کرتی ہے پھر اسے فراموش کر کے اگلے لوگوں کے ساتھ اگلے زمانے میں اگلا Pattern وضع کرنے میں لگ جاتی ہے۔پیچھے کیا ہوا، کیسے کیسے لوگ اس نے پیدا کیے، ان میں کون سرسید تھا اور کون لارڈ کلایو، تاریخ کی اندھی آنکھیں اور بہرے کان نہ پھر انہیں دیکھ پاتی ہیں اور نہ سُن پاتے ہیں۔اس لیے مجبوریاں صرف محمد حسن، سرسید یا لارڈ کلایو یا میر قاسم کی نہیں، مجبوریاں تاریخ کی بھی ہوتی ہیں۔میرے تخلیقی سفر کے دوران ایک سایہ دار شجر علی گڑھ میں مجھے ملا، کیا بانکا شاعر تھا، میرا پروفیسر تھا۔ سب اسے جانتے ہیں۔نام اختر انصاری۔کیا غضب کا قطعہ ایک دن اس نے اپنے کمرے میں اپنے شاگردوں کو سنایا تھا:

یہ تری تخلیق نا فرجام یہ ٹھہری زمیں
تا ابد ٹھہری رہے گی اس میں تو معذور ہے
آ کہ سینے سے لگالیں خالقِ بریں تجھے
جتنے ہم مجبور ہیں اتنا ہی تو مجبور ہے

گویا تاریخ کے پاس، خدا کے پاس، فرد کے پاس، ادیب کے پاس، افسانہ نگار کے پاس، جس کے پاس جو مجبوری بھی ہے اور اس کی جو بھی نوعیت ہے وہ اس بری بھلی زندگی کو جاری و ساری رکھنے کے لیے ایک نعمت ہے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ سرسید، لارڈ کلایو اور محمد حسن اپنی مجبوریوں اور معذریوں کے سبب ہی سرسید، کلایو اور محمد حسن تھے۔اس لیے میں نے اپنے تخلیقی سفر کے دوران ایک پل کو بھی یہ نہ سوچا کہ میں راجندر سنگھ بیدی ہو جاؤں، گورکی ہو جاؤں، منٹو ہو جاؤں، میں اپنے ہونے کی مستی میں ہی مست رہا۔ہم اپنی حدود میں خود کو کتنا لامحدود کر سکتے ہیں شاید ہمیں ساری زندگی اسی کی تگ و دو کرنی چاہیے۔

آج سے پچاس برس پہلے یہ بات کہتے مجھے مشکل لگتی کہ اختر حسین رائے پوری کی ترقی پسندی کا ٹھرّا، یعنی کچی شراب کبھی میرے حلق سے نہ اتری، اس میں میرے ذوقِ سلیم سے زیادہ میرے فطری مزاج کو دخل ہے۔جدیدیت نے جب اپنی دکان لگائی تو اس کے خم خانے سے اٹھی ٹھرّے کی بو جس میں تیزی، شدت پسندی اور انتہا پسندی وغیرہ کی بو بہت تھی اس نے بھی میرے ذہن کو پراگندہ کیا۔پھر میں نے دیکھا کہ فکشن میں لفظ کے تخلیقی استعمال کو شاعری کے لفظ کی طرح استعمال کرنے کی ہوڑ چل پڑی تھی۔کئی شاعر افسانہ نگار ہو گئے تھے اور کئی افسانہ نگار شاعر۔یہ اتنا برا نہ تھا لیکن جو چیز میرے لیے پریشان کن تھی وہ فکشن کی پھوہڑ، جاہلانہ اور اندھی توڑ پھوڑ تھی اور وہ لوٹ کھسوٹ تھی جو کوئی فاتح فوج مفتوح شہر اور اس کی رعایا کے ساتھ کرتی ہے۔مجھے لگتا ہے کہ ہر ادیب اپنی حفاظت خود کرتا ہے، جب وہ لکھتا ہے یا لکھنے والوں میں اپنے نام کو زندہ رکھنا چاہتا ہے یا اپنی تحریروں پر مکالمے جاری رہنے کی خواہش رکھتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنے کو علمی طور پر ایک حساس فرد کی حیثیت سے اس طرح زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ضمیر اسے اجازت دیتا ہے، وہ لکھنے کے ساتھ ساتھ چھپنے اور پڑھے جانے کے ساتھ ساتھ اپنی اور اپنے ضمیر کی حفاظت بھی چاہتا ہے، اپنے لکھنے کے ذوق و شوق کے دوران میں یہ بات شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ہمارے عہد کی نئی ادبی سوچ نے ادب کو انسان سے، سماج سے، زندگی سے، تہذیب سے اور سیاست سے نئے رشتے قائم کرنے پر جو زور دیا ہے اس کی انسان کی ترقی میں بڑی اہمیت ہے۔ہم نے کھلے لفظوں میں اپنے لکھنے کے دوران ہی اس حقیقت کو جانا کہ بڑے ادب کی شناخت ہی یہی ہے کہ اس سے زندگی کے حُسن اور اس کی نمو کو سمجھنے اور اسے ابھارنے میں مدد ملتی ہے۔آج جب کہ میرے سفر کا آخری پڑاؤ آچکا ہے، عام طور پر یہ بات محسوس کی جارہی ہے کہ ادبی تحریکیں آئیں گی اور جائیں گی لیکن دنیا کا وہی ادب لائق احترام ہوگا جس میں بقول احتشام حسین، ''محبت کی استواری، انسان کے زندہ رہنے کی لافانی تمنا، سماج میں توازن قائم کرنے کا خواب اور قدرت کو اپنے بس میں کرنے کی امنگ کسی نہ کسی شکل میں ضرور دکھائی دے گی۔''

میں نے بہت نہیں پڑھا، آج بھی نیم خواندہ ہوں، لیکن ادبی تھیوریوں، تحریکوں، تنقیدوں، مضمونوں، سیمیناروں وغیرہ سے جو بھی میں نے علم حاصل کیا اور افسانہ لکھنے کے لیے جو بھی ایجنڈا میرے ذہن میں مرتب ہوا وہ سارا کا سارا افسانہ لکھتے وقت صرف افسانے کے خود اپنے پوشیدہ ایجنڈے کے اردگرد ہی گھومتا رہا جس کا پتہ مجھے اس وقت چلا جب کہ میں افسانہ لکھ چکا تھا۔کوئی Narrative Expression ہماری روح میں ہی نہیں بلکہ ہماری روحِ عصر میں کس طرح گھل مل کر ایک ایک باہر آجاتا ہے، وہ بھی اپنے انوکھے، حیرت انگیز اور فکر انگیز تام جھام کے ساتھ، اس کا جواب اگر کسی نے ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑھنے کے بعد منٹو سے پوچھا ہوتا تو وہ بھی نہ بتا پاتا۔تخلیق بیشتر اپنے تخلیق کار کو بھی اتنا ہی متحیر کر دیتی ہے جتنی اپنے قاری کو۔میری تحریروں میں کیا ایسا کچھ ہے؟ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے۔میرا جواب ہے کہ اگر ایسا کچھ ہے تو میرے علم میں نہیں ہے کیوں کہ لکھتے وقت میری زیادہ تر توجہ تو ترقی پسندی اور جدیدیت کی ٹھرّے کی مزید کشید کر کے اسے زیادہ لائق استعمال بنانے میں لگی رہی کیوں کہ یہ دونوں ہی اپنے اپنے وقت کی طاقتور اور بااثر تحریکیں تھیں۔منٹو جب پیدا ہوا اور ہوش سنبھال چکا تو ترقی

پسندی کی پیدائش ہو رہی تھی۔ میں نے جب لکھنا شروع کیا تو ترقی پسندی ایک مقبول تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی اور جدیدیت نے ڈنڈ پیلنا شروع کر دیا تھا۔

بڑی دیر میں مجھے یہ پتا لگا کہ شاید ہر اچھی کہانی میں زندگی کی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ کوئی ایک جھوٹ بھی چھپا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اسے جھوٹ کا نام نہ دیں، کوئی اور نام دیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ کہانی میں حقیقت کی نہیں تصورِ حقیقت کی اہمیت ہے۔ گویا پریم چند نے ''کفن'' میں کون سی حقیقت بیان کی یہ اہم نہیں بلکہ کفن نے کس تصورِ حقیقت کو اپنایا اس کی اہمیت ہے۔ تقسیم کی حقیقت پر اخباروں میں جو ہزاروں کالم برسوں لکھے گئے، ٹوبہ ٹیک سنگھ کی افسانوی حقیقت اس سے مختلف ہے۔ کہانی اپنے ایجنڈے کی سچائیوں کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے اسی میں جیتی اور مرجاتی ہے۔ جب کہ اخبار کے کالموں میں لکھی جانے والی تقسیم کی حقیقت صحافتی حقیقت کے ارد گرد چکر کاٹتی ہے۔

میری تخلیقی سرگرمیوں کا سفر سست رفتار رہا ہے۔ محبت کی، شادی کی، نوکری، بچے پالے، دیویندر ستیارتھی کی طرح چھٹّل نہیں گھوما۔ یا کرشن چندر کی طرح کتابوں، ناولوں اور افسانوں کے معاوضوں پر زندگی نہیں بسر کی۔ نوکری بھی ایسی جس سے دال روٹی چل جائے، اسی درمیان عملی تھیٹر سے بھی کچھ شغف رہا۔ اگر میں حجاب امتیاز علی والی فراغت بھی رکھتا ہوتا تب بھی شاید دس گھنٹے روزانہ نہ لکھتا کہ یہ تو منشی گیری ہوئی۔ بہر حال میرے چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پانچواں مجموعہ بھی مرتب کیا جا سکتا ہے مگر میں مجموعہ چھپوانے سے بددل ہو چکا ہوں۔ پبلشر اس کو روزی کا لقمہ بنا لیتے ہیں، خود میرے پاس اتنی پونجی نہیں ہے اور نہ میں اسے بیچ سکتا ہوں۔ دو ناولیں بھی ایک دوست نے چھاپیں جس کے لیے میں اپنے دوست پروفیسر علی احمد فاطمی کا ممنون ہوں۔ اس چھوٹی سی پونجی پر جو مجھے عزت ملی، یہ میری خوش قسمتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ میں نے ادب سے ادبی فائدے کے علاوہ کوئی دوسرا غیر ادبی فائدہ نہیں اٹھایا۔ تخلیقی تحریک کے سبب جو بھی برا بھلا لکھا وہ لکھا۔ فراق گورکھپوری ایک جلسے میں ادیبوں پر بہت ناراض ہو گئے تھے اور کہا تھا کہ آدمی کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ کارآمد بننے کا بہانہ نکالتا ہے، ہر چیز ادب سے طے نہیں ہوتی، دنیا کی کوئی بڑی کتاب مشورے سے نہیں لکھی گئی۔ پھر انہوں نے ادیبوں کو ان کی اوقات یاد دلاتے ہوئے کہا کہ آپ یہ سوچیے کہ آپ کتنے چھوٹے ہیں۔ آپ آر ایس ایس کے گولوالکر جی کے برابر بھی نہیں۔ جو کام وہ کروا سکتے ہیں وہ دس کروڑ رائٹر نہیں کر سکتے۔ فراق کا یہ کہنا کتنا درست ہے۔ اس سے قطع نظر میں اتنا جانتا ہوں کہ میں کوئی کارآمد انسان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ میرا تخلیقی سفر اس شوقِ فضول کا نتیجہ ہے۔ مجھے اس بات پر بھی کوئی تاسف نہیں کہ مجھ سے زیادہ کارآمد تو ایک کمپیوٹر انجینئر ہے۔ مجھے زندگی نے جو رول ادا کرنے کا ذوق وشوق اور موقع دیا میں نے اس کے مطابق ایک مخصوص دائرے میں اپنی استعداد کے مطابق اس رول کو ادا کیا۔ یہ نہ کرتا تو ممکن ہے کرکٹ کھیلتا یا پھر جوئے کی پھڑ پر فلاس کھیلتا کیوں کہ جس وقت میں اپنا کام کر رہا تھا تو دوسرے بہت سے لوگ میرا کام کر کے کرکٹ کھیل رہے تھے یا جوئے کی پھڑ پر فلاس کھیل رہے تھے۔ جہاں ادب کے کچھ اور کام ہیں وہاں ایک کام آگہی سے حاصل ہونے والی مسرت فراہم کرانا بھی ہے۔ فکشن کا سارا حسن اسی Joy of Understanding پر قائم رہتا ہے۔ جو اس مسرت کی فراہمی میں ڈنڈی مارنے کا کام کرتے ہیں۔ وہ فکشن نہیں لکھتے تھے وہ سیاست کرتے ہیں کیوں کہ سیاست ڈنڈی مارنے کے کام سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ فکشن کا سینہ بہت کشادہ ہوتا ہے اس کی فراخ دلی کو سر آنکھوں پر کیسے بٹھایا جا سکتا ہے اور اس کے لیے اپنی ترغیبات اور ترجیحات کو کیسے دبایا جا سکتا ہے، میں نے اپنے پچاس سالہ تخلیقی سفر میں اس نکتے کو بھی سمجھنے کی خام کوشش کی ہے کیوں کہ کچھ بھی ہو ادیب سو فیصدی غیر جانب دار نہیں ہو سکتا ورنہ اس کے لیے ادب پیدا کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ کیوں کہ ادب Status Quo کو توڑنے والوں کی معاونت کرتا ہے۔ اس سفر میں میں نے سو سے زیادہ کہانیاں تو لکھی ہوں گی مگر ان میں سے کچھ ہی ایسی ہوں گی جو اپنی ایمان داری اور کھرے پن کی بنا پر قارئین کے دلوں میں دیر تک ٹھہر سکیں لیکن میری تلاش یہ ضرور رہی کہ ادبی تخلیق کو سچائی کے ہر طور میں زندگی کا وہ حسن اور قوت ضرور تلاش کرنا چاہیے جن کو نئی تہذیبی اقدار میں جگہ مل سکے جس کے سبب وہ بیش قیمت تسلسل قائم رہ سکے جو تہذیب اور سماج کی پہلی ضرورت ہے۔ اگر یہ کام ادب نہیں کرے گا تو کوئی دوسری ایجنسی کرے گی۔ اب پچھتر برس کی عمر کو پہنچ چکا ہوں، میرے بچوں کے بچے بھی بڑے ہو چکے ہیں۔ زندگی سے میں جس قدر ڈرا سہارا رہا ان بچوں کو یہ زندگی اتنی مشکل نہیں لگتی۔ تیرہ سال کی لڑکی کے پاس موبائل ہے، کار چلانا سیکھنے کے لیے بے قرار ہے، لڑکی اپنے دوستوں کے ساتھ Pizza کھانے اکیلے بھی چلی جاتی ہے، جینز کی زپ کھلی رہ جانے پر وہ شرماتی نہیں، ٹوکنے پر Thanks کہہ کر جب ہاتھ خالی ہوتا ہے تب بند کرتی ہے۔ شاید یہ بچے ہم سے نہیں پوچھیں گے کہ ہم انہیں کیسی دنیا دے کر جا رہے ہیں، وہ ناپ تول اور وہ باٹ جن سے ہم اپنی زندگی کے دُکھ سکھ تولا کرتے تھے، ان بچوں نے انہیں کہیں گٹر میں ڈال دیا ہے۔ یہ اپنی آنے والی زندگی کی پُر اسراریت پر، اپنی غیر ہم آہنگیوں اور افراتفری پر جن اوزاروں سے قابو پائیں گے وہ ان کے اپنے بنائے ہوئے ہوں گے تا کہ وہ اپنے تخلیقی سفر کو اپنی زادِ راہ کے مطابق شروع کر سکیں۔ اب اس میں ادب کی، شاعری کی، ناول کی، کتابوں کی کتنی جگہ ہو گی اور کس شکل میں۔ ہوگی بھی یا نہیں یہ باتیں وہ خود طے کریں گے۔ کیا ان کے یہاں بھی اپنی ضرورت اور مصلحت کے لیے ادیبوں کو جھنڈوں پر چڑھایا یا اتارا جائے گا۔ کیا ان کے یہاں بھی گروہ بندیاں ہوں گی؟ یہ ساری باتیں ان کے ادب کے ساتھ اور ادبی سیاستوں کے ساتھ ان کا اپنا مسئلہ ہوں گی۔ اگر اس آپا دھاپی میں میرا ایک افسانہ بھی کسی کے پڑھنے کے لیے بچ گیا ہوگا تو میری روح خود کو دوستوئیفسکی اور ٹولسٹوئے سے کم نہ سمجھے گی۔

☆

براہِ راست

قرطاسِ اعزاز سے محرومی پر ایک صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ پر مضمون نہیں لکھا اس لیے آپ نے مجھے اس اعزاز کا حقدار نہیں جانا دوسرے صاحب نے فرمایا کہ آپ اپنے حلقۂ احباب کو نواز رہے ہیں۔ضرورت کے بغیر یہ وضاحت کر دی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں کہ چھبیس برس میں جس قدر بھی خواتین وحضرات کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کیے گئے اُن کی اکثریت سے ہماری واجبی شناسائی اور روبرو ملاقات بہت کم احباب سے ہوئی۔اور یہ بھی بلاضرورت بتلا دیا جائے کہ قرطاسِ اعزاز کی اشاعت کے بعد تعلقات کی نوعیت وہی ہو جاتی ہے جو''قرطاسِ اعزاز سے پہلے''۔

سو قارئین محترم اسے آپ ہماری کورذوقی کہہ لیجیے کہ ہم نے آج سے قبل جناب اقبال مجید کا نام اور اُن کے کام کے دبدبے کی نسبت سُن تو بہت کچھ سُن رکھا تھا مگر اُن سے کسی قسم کی نسبت قطعی نہ تھی لہٰذا یہ اقبال مجید صاحب کا کرم ہے کہ اُنہوں نے ایک نو وارد کی درخواست پر قلمی تعاون کی نہ صرف حامی بھر لی بلکہ مقررہ وقت میں مطلوبات فراہم کر کے اردو ادب کی روایت کو آئینہ بھی دکھا دیا۔ہماری کاوش کی نسبت آپ کو حق ہے مگر اقبال مجید صاحب کی پینسٹھ سالوں پر مشتمل قلمی کاوشات کو توجہ کے ساتھ پڑھنے کے بعد اپنی بے لاگ رائے ضرور دیجیے جس سے اقبال مجید صاحب کی فنی خدمات کا اعتراف کچھ اس طرح کیا جائے کہ اردو دنیا کو یہ احساس ہو سکے کہ ابھی ہم اُتنے بانجھ نہیں ہوئے جتنا چرچا کیا جاتا ہے!!!

گلزار جاوید

☆ جس طرح عمارت کے لیے بنیاد کا ہونا ضروری ہے عین اُسی طرح مکالمہ کے لیے خاندانی پس منظر بھی لازمی ہے؟

☆☆ باپ عبدالمجید، دادا حسین بخش دونوں ریلوے میں ملازم تھے۔ والدہ لاہور کی پٹھانی۔تربیت اپنے سوتیلے دادا حیدر مہدی صاحب کے پاس ہوئی۔وہ لکھنؤ میں تھے۔بڑے خداترس اور نیک دل اہلِ تشیع میں سے تھے جبکہ میرا خاندانی تعلق اہل سنت سے ہے مگر ماحول تعلیم وتربیت اور ذہنی رجحان نے مجھے بقول اکبرالٰہ آبادی:

مگر حضرت مخنث میں نہ ہوں، میں نہ شعیوں میں

☆ جس طرح آپ کی شخصیت اور ادب سنجیدہ ہے کیا بچپن بھی ایسا ہی تھا؟

☆☆ جی نہیں۔سن پیدائش ۱۲۔جولائی ۱۹۳۴ء(جو اسکول میں درج ہے) اسلامیہ اسکول میں پڑھتا تھا کلاس کی کتابیں چرا کر دوستوں کے ساتھ نور جہاں کی فلمیں دیکھتا تھا۔مولانا حسرت موہانی کو ان کی فورڈ موٹر سے زبردستی اتار کر کالج کی مشاعرہ گاہ میں لڑکوں کی مدد سے اٹھالاتا تھا وہ مشاعرے میں قہراً جبراً یہ سوچ کر کہ بندروں میں پھنس گیا ہوں غزل سنانے کے لیے مجبور ہو جاتے:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

☆ تعلیمی ادوار کی کچھ یادیں، کچھ ہم جماعت اور اساتذہ کا ذکر بھی رنگ آمیزی کے لیے ضروری ہے؟

☆☆ کالج کے پرنسپل راستے میں مل جاتے تو بچ کر نکلنے کی کوشش کرتے مگر وہ پہچان لیتے کہ اپنے اسکول کا لڑکا ہے۔روک کر کہتے سلام علیکم میں مرتا کیا نہ کرتا جواب دیتا وعلیکم السلام۔وہ کم سے کم بیس بار سلام کرتے اور بیس بار جواب مانگتے۔یونیورسٹی کے ساتھیوں میں شاہد مہدی(آئی ایف ایس) ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر قاضی عبدالستار احمد جمال پاشا وغیرہ تھے۔علی گڑھ میں ساجدہ زیدی بی ایڈ میں پڑھاتی تھیں دل میں تو عشق تھا مگر زبان پر ساجدہ آپا کیسی مجبوری تھی۔

☆ ادب نے آپ کو یا آپ نے ادب کو کب اور کیونکر تلاش کیا۔پہلی تخلیق کس طور وجود میں آئی اور اشاعت کے لیے کس طرح کی جستجو سے گزرنا پڑا؟

☆☆ شاہجہاں پور میں کلاس نویں میں مَیں تھا تو اقبال فرحت اعجازی نام کے افسانہ نگار سے دوستی ہوئی۔تب ایک افسانہ لکھ کر ڈاکٹر اعجاز حسین مدیر کارواں الٰہ آباد کو لکھ کر بھیجا۔انہوں نے املا کی غلطیاں لکھ کر بھیجیں۔اور مشورے دیے۔ دسویں درجے میں ایک سال بعد پھر لکھنؤ واپسی ہوئی۔لکھنؤ علم وادب کا گہوارہ تھا ایک سے ایک لکھار موجود تھے افسانے کا شوق پڑ چکا تھا ایک فلمی رسالے کے لیے لڑکا لڑکی سے ملتا ہے کے موضوع پر افسانہ لکھا۔رسالہ لگا لیا تھا۔خود افسانہ لے کر

مدیر کے پاس گیا۔افسانہ چھپا بیس روپے (۲۰) معاوضہ بھی ملا۔ پہلا معقول اور توجہ طلب افسانہ ظ انصاری نے ماہنامہ شاعراہ میں چھاپا۔

☆ اچھا یہ بتلایئے! وہ کون سے تعصّبات تھے جن کو پرے رکھ کر آپ تخلیقیت سے جڑے؟

☆☆ تعصّبات اور ترجیحات تو ٹالسٹائی اور پریم چند اور انتظار حسین بھی پرے نہیں رکھ پائے۔ میری کیا حیثیت ہے۔ تیکھے وقت لکھارا اپنے موضوع اور خود اپنی شخصیت کو بھی Explore کرتا ہے وہ اپنے تجربے سے دست و گریباں ہوتا ہے وہ نہیں جانتا کہ کب اور کہاں کس تعصب اور کس ترجیح نے اسے زیر کرلیا۔

☆ یہ تاثر کہاں تک درست ہے کہ ایک مدت تک آپ کے افسانوں میں فسانہ آزاد کا رنگ کا نمایاں رہا؟

☆☆ یہ فسانۂ آزاد صاحب کہاں سے ٹپک پڑے اور میرے کس افسانے میں کس ناقد کو نظر آ گئے۔ یہ تو میرے لیے بڑی دلچسپ خبر ہے، یہ تو وہی ہوا کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ کہاں اقبال مجید اور کہاں یہ خوبی۔ اتنے مسخرے تو نہیں ہیں ہم اور نہ ہمارے پاس وہ حسیّات ہیں۔

☆ آپ کو تفصیل سے پڑھنے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ آپ کے اندر کوئی دُکھ، غم یا غصہ گھر کئے ہوئے ہے جو جا بجا آپ کی تخلیقات میں خود کو ظاہر کرتا رہتا ہے؟

☆☆ ہم لوگ بہت حد تک برافروختہ نسل Angry Generation سے تعلق رکھتے ہیں۔غم اور غصے کے نصر ہمارے عہد کا فن پھیکا تھا۔ منٹو کے یہاں بھی یہ غم اور غصہ تھا موزیل اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کی شکل میں کیا موجود نہیں ہے؟ آرٹ دیکھا جائے تو ہمیشہ ہی Status Quo کے خلاف رہا ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں میں ڈرامے کا رنگ بتلانے والے تعریف کر رہے ہیں یا تنقید؟

☆☆ ڈرامے کا رنگ گالی نہیں ہے۔ ڈراما تو زندگی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اگر افسانے میں شاعری ہوسکتی ہے علامتی افسانہ برسوں کرتا رہا ہے ڈراما کیوں نہیں ہوسکتا۔ پھر آج ہر صنف میں دوسری اصناف کی خوبیاں اور خامیاں پائی جا سکتی ہیں۔ سامنے کی مثال موجود ہے۔ ن۔م۔راشد کی نظمیں پڑھیے۔ خالص صنف محض ایک تصویر ہے۔

☆ Selfconsious انسان کے خول سے افسانہ نگار کا چہرہ جھانکنے کی بابت وضاحت طلب ہے؟

☆☆ میں خود بھی اس بات کو نہیں سمجھ پایا تو ضاحت کیا کروں۔

☆ یہ معاشرے کے مقابلے افراد کو اہمیت دینے کی بات بھی قاری کو مشکل میں ڈال رہی ہے؟

☆☆ سیدھی سی بات ہے ترقی پسندوں نے ادب میں معاشرے کی تصویر کشی اور مسائل کو فوکس میں لے کر اہمیت دی تھی جبکہ جدیدیت نے سماجی شعور والے ادب کو بہت گالیاں دی تھیں وہ خرد کی ذات اور اس کے کرب کو ادب کا بنیادی حوالہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے Commitment اور Non Commitment کا ادب میں جھگڑا شروع ہوا اور یہاں تک کہا گیا کہ سماجی شعور کو ادب میں کیوں تلاش کیا جاتا ہے، سماجی شعور تو پنساری کی دکان پر بھی مل جائے گا۔ حلقہ ارباب ادب کی بحثیں یاد کیجیے۔

☆ تخلیق پانی کے بہاؤ کی مانند ہوتی ہے جو خود بہ خود اپنا راستہ تراشتی ہے۔ Strategy وضع کر کے کہانی یا کرداروں کی شکل و صورت وضع کرنا کس حد تک درست عمل ہے؟

☆☆ تخلیق مجذوب نہر نہیں ہے۔ اس کی تجسیم بہر حال ہوتی ہے کرافٹ اس کی تشکیل میں بڑا کام کرتا ہے۔ کرافٹ ہی اس کو پانی کی طرح بہاتا ہے تاج محل تب تاج محل ہے جب اس کا خیال بہترین مال و اسباب کے ساتھ لاجواب کرافٹ کی شکل میں ڈھل گیا۔ اگر ترشے ہوئے کردار افسانے میں نہیں ہیں تو ان کی جگہ کچھ دوسرا ساز و سامان ہوگا جو اس میں اثر انگیزی اور خیال افروزی پیدا کرنے کے ساتھ ظاہری طور پر بھی خوبصورت بنائے گا۔ فنکار کی جمالیاتی حس بھی اس کی خوبصورتی کی ذمہ دار ہے۔

☆ خیالات، محسوسات و کیفیات پر افسانے کی بنیاد رکھنے کے بجائے اپنے عصر کے مسائل اور انسانی فکر مندیوں کو جوڑنا افسانے کے بجائے ناول کے لیے ضروری نہیں؟

☆☆ سوال کی عبارت گنجلک ہے کیا پوچھا گیا ہے صاف نہیں ہوتا۔ میرے لیے عصری مسائل اور انسانی فکر افسانے اور ناول دونوں میں اہمیت رکھتے ہیں۔

☆ ترقی پسندی اور جدیدیت کے عرصہ کو کچھ لوگ عبوری دور بھی کہتے ہیں آپ اس عبوری دور کے ادب خصوصاً اپنے تخلیقی ادب کو کس خانے میں رکھتے ہیں؟

☆☆ ادب کو خانوں میں رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کو میں ادبی رجحانات مانتا ہوں۔ ان دنوں رجحانات کا فکری طور پر مجھ پر اثر پڑا ہے۔ یہ کام ناقدوں کا ہے کہ وہ میرے افسانوں پر کس تحریک کا لیبل لگاتے ہیں اور اس کا کیا جواز پیش کرتے ہیں۔

☆ ''جو ڈنڈی مارنے کا کام کرتے ہیں وہ فکشن نہیں لکھتے سیاست کرتے ہیں'' یہ رائے اپنی جگہ اہم مگر ادھوری مانی جائے گی تاوقتیکہ کچھ اہم نام نہ گنوائے جائیں؟

☆☆ سیاست بہت سی مصلحتوں کے ساتھ زندہ رہنے کا کام کرتی ہے۔ اس کی آواز اور فکری اساس بالکل الگ ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کے اوزار بھی الگ ہوتے ہیں۔ سیاست کو اپنی مطلب برادری کی فکر رہا کرتی ہے اس کی منزل اقتدار کو حاصل کرنا اور اس کو مضبوط بنانا ہے۔ وہ کامیاب ہونے کے بعد بھی

ناکامی کے ڈر سے لرزتی رہتی ہے اس لیے ڈنڈی مارنا کی ضرورت میں شامل ہوتا ہے جبکہ ادب پیدا کرنے والے کے لیے یہ مسائل نہیں ہوتے۔ ڈنڈی مارا ہوا ادب پارہ لمبی عمر نہیں پاتا۔

وہ ترقی پسند جنہوں نے ادب سے بھونڈے اور خام پروپیگنڈے کا نام لیا انہوں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء تک جو شاعری کی کیا کسی کو ان کے نام آج یاد ہیں۔؟ اس لیے نہیں یاد ہیں کہ ان شاعروں کو ایک مخصوص پروپیگنڈے کے لیے زبردستی اور نقلی انداز میں مزدور کی بات کرنی پڑی اور یہ کام ڈنڈی مارے بغیر نہیں ہوتا۔

☆ آپ نے تو اختر حسین رائے پوری کی ترقی پسندی کو ’’ٹھرّا شراب‘‘ سے بھی تشبیہ دی ہے؟

☆☆ خاموشی

☆ ذرا اُس فارمولے کی بابت آگاہی دیجیے جس کے استعمال سے آپ ترقی پسندی کے ٹھرّے کی شدت کم کر رہے ہیں؟

☆☆ ترقی پسندی کا ٹھرا دراصل ابتدائی عہد کی محدود ترقی پسندی کا ایک رویہ تھا۔ یہ رویہ ادب کو بے ڈھنگے اور برہنہ Propaganda کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ میں نے اس رویے کو قبول نہیں کیا اور اپنی تحریروں کو اُس سے بچاتے ہوئے تخلیقی کام انجام دیا۔ کیونکہ اختر حسین رائے پوری کی تنقید اس رویئے کی تائید کرتی تھی اس لیے اس کا ذکر آ گیا۔

☆ یہ جو آپ نے فکشن پھوہڑ، جاہلانہ اور اندھی توڑ پھوڑ کی بات کی ہے اشارہ کس جانب ہے؟

☆☆ فکشن میں اندھی اور جاہلانہ توڑ پھوڑ اُن علامت نگاروں نے شروع کی جو کہانی میں رمزیت اور اشاریت کو تخلیقی طور پر برت نہیں پاتے تھے۔ سریندر پرکاش کے ’’تلقار مس‘‘ جیسے افسانے اس کے گواہ ہیں۔ فکشن کو علامت کی نئی جہت نے ’’بجوکا‘‘ جیسے خوبصورت افسانے بھی اردو فکشن کو دیے ہیں یہ ہم کو نہیں بھولنا چاہیے۔ بیانیہ کہانی سے اس کے روایتی زیورات چھین کر نئے زیورات کے ساتھ ان کی آرائش کرنے کی ہوڑ مچی ہوئی تھی یہ ہوڑ کئی برس رہی اور اس زمانے میں کہانی لکھنے میں میں نے خاصے ضبط اور تحمل سے کام لیا۔

☆ آپ کا ناسٹلجیا اس قدر پاورفل ہے کہ آپ کی بیشتر مشہور اور پسندیدہ کہانیاں ناسٹلجیا سے جڑی ہیں؟

☆☆ ناسٹلجیا تو فکشن کی غذا کے مانند ہے۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین اس کے بچے نہیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ نئے ذہن کو بیمار بنانے کے لیے تو استعمال نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کو افیم کی طرح استعمال کئے جانے سے بچاتا ہوں۔ دراصل کوئی بھی نسل اپنے ماضی سے چھٹکارا نہیں پاتی صحت مند دریچے اس جانب کھولے جانے کا کام ادب کے لیے ضروری ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں کی اوپری سطح پر محسوس ہونے والا تناؤ اس بات کا Power Structure اشارہ کرتا دکھائی دیتا ہے کہ کہانی کی زیریں سطح پر کوئی اور تناؤ کام کر رہا ہے؟

☆☆ جب تک خارج کی سطح پر تناؤ نہیں پیدا ہوتا اندر کی خلفشار کی عکاسی نہیں ہو پاتی۔ ایسا میرے ساتھ اکثر کہانیوں کے Treatment میں ہوا ہے۔

☆ آپ کے مختلف افسانے نام بدل کر بار بار چھپنے کا سبب کیا ہے؟

☆☆ ایسا ہمیشہ تو نہیں ہوتا۔ بعض افسانوں کے نام اگر مجھے کم تاثر دینے والے محسوس ہوئے تو ان کا عنوان بدل بھی دیتا ہوں لیکن ایسا خال خال ہی ہوا ہے۔

☆ آپ کی کہانیوں کے انتخاب ’’قصہ رنگ شکستہ‘‘ مطبوعہ شہزاد پبلی کیشنز کراچی کو اوسط درجہ کی کہانیوں سے موسوم کیوں کیا جاتا ہے؟

☆☆ یہ تو وہی بتا سکتے ہیں جن کو وہ افسانے اوسط درجے کے لگے یا پھر آپ انکا تجزیہ کر کے بتائیں کہ وہ کن افسانوں کے مقابلے میں اوسط درجے کے ہیں اور کیوں؟

☆ ناولٹ ’’بے نیام‘‘ میں احتجاج آپ کے مزاج سے ہٹ کر زیادہ بے نیام کیوں ہو گیا؟

☆☆ ناولٹ ’’بے نیام‘‘ کس کی ہے۔ میں نے تو اس عنوان سے کوئی ناولٹ نہیں لکھی ہے ابھی تک۔

☆ یہ جو آپ کے ناول میں ایک نئے Picaresque کلچر کا کریڈیٹ آپ کو دیا جا رہا ہے آسان الفاظ میں ہمارے قارئین کو سمجھا دیجیے؟

☆☆ یہ کریڈٹ شمیم حنفی صاحب نے دیا ہے وہ پاکستان آتے رہتے ہیں براہِ کرم ان سے معلوم کریں مجھے یقین ہے ان کا جواب آپ کو مطمئن کر دے گا۔

☆ آپ کے ناول میں عورت اور گائے کا جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ نہ صرف صنف نازک بلکہ انسانیت کی تذلیل کے زمرے میں بھی آتا ہے؟

☆☆ عورت اور گائے کا تجزیہ کس حوالے کے تحت ہے، یہ حوالہ پوری ایک ناول ہے اس سے باہر نکل کر اس تجزیے کے کوئی معنی نہیں ہیں حوالے کے ساتھ دیکھیں گے تو یقیناً معنی کچھ اور ہونگے اور یہ ایک بڑے تلخ طنز میں تبدیل ہو جائے گا۔

☆ یہ رائے زیادتی پر مبنی ہے کہ عورت طرح طرح کے فحش ہتھ کنڈوں، عیاریوں اور مکاریوں کی پونجی داؤ پر لگا کر مرد کو قابو کرتی ہے؟

☆☆ پھر آپ سیاق وسباق سے باہر نکل کر بات کر رہے ہیں۔ کیوں میری عاقبت بگاڑنے کے درپے ہیں جناب قرون وسطی کے عہد کی سوچ اور فکر میں ذرا جھانک کر دیکھئے آپ کو جواب مل جائے گا۔ آج کا عہد تو تانیثیت کا عہد ہے۔

☆ ’’چراغ آرزو‘‘ کی منی بیگم پر حقیقی کردار کا گمان کیوں ہوتا ہے؟

☆☆ یہ تو کردار کو تراشنے کی خوبی ہے حضور۔

☆ آپ کی عمر کے قریب سبھی افسانہ نگاروں پر منٹو سے متاثر ہونے کا

لیبل لگتا ہے۔آپ کے لیے یہ اعزاز ہے یا عذاب؟

☆☆ منٹو سے آج کی پوری نسل کو متاثر بتانا ٹھیک نہیں، میں بھی نہیں ہوں یہاں کے افسانہ نگاروں پر وہ کام نہیں ہوا جو ہونا چاہیے۔منٹو اس قدر آسان نہیں ہے جتنا سمجھا گیا ہے۔نئی نسل کی پہچان بنی نہیں ہے۔

☆ وہ کہتے ہیں نا ذکر چھڑ گیا جب قیامت کا، بات پہنچی تیری جوانی تک ہم منٹو کی بات کر رہے تھے مگر یہاں تو آ کر ٹی کے حوالے سے منٹو، گارسیا مانیز، ملن کندرا اور دیگر مغربی ادیبوں سے استفادے کی بات آ نکلی؟

☆☆ یہ ناقدوں کا حق ہے کہ کس کس کی بات نکالیں۔شائد اردو کی تنقید میں ایسے ناموں کے حوالوں کا چلن بھی بن گیا ہے۔اب تو سب جانتے ہیں کہ ہماری تنقید کو اپنے دیسی مواد کو دیسی حوالوں سے پرکھنے کی بھی عادت ڈالنا چاہیے۔لوگ اردو کے سرمائے کو تو پڑھتے نہیں مارکیز کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔کیا ہمارے عہد کی اردو کی تخلیقات خود مکتفی ہونے کے بجائے ان ادیبوں کی طرف زیادہ دیکھنے لگی ہیں؟

☆ ڈرامہ سے آپ کے تعلق اور نبھاؤ کی بابت کچھ بتلایئے؟ اب تک کتنے ڈرامے تحریر کیئے اور کس میڈیم پر کھیلے گئے؟

☆☆ ڈراما بہت طاقت ور میڈیم ہے لیکن یہ زندہ اور فعال تھیٹر کے بغیر نہیں پنپ سکتا میں دس بارہ سال عملی تھیٹر سے جڑا رہا ہوں۔لکھے تو گنتی کے ہی ڈرامے ہیں لیکن اندازہ ہوا کہ اس میں صرف لکھا ہوا لفظ ہی کام نہیں کرتا بلکہ دوسری زبانیں مثلاً اداکاری، اسٹیج کرافٹ اور روشنی وغیرہ بھی خاصی اہمیت کے حامل ہیں ان سب سے پنجہ کشی بہت بڑی ریاضت ہے جو کُل وقتی عمل ہے۔اس لیے جلدی تھک گیا کیونکہ نوکری بھی کرنا تھی۔

☆ ''اقلیت کی آخری سانسیں لیتی زبان کا ادیب ہوں'' یہ جملہ اپنے اندر کس قدر مضمرات لئے ہوئے ہے جبکہ باقی لوگ بھارت میں اردو کا مستقبل شاندار بتلاتے نہیں تھکتے؟

☆☆ اردو کے مستقبل کی تاریکی کا ذمہ دار میرا خیال ہے کہ خود اردو بولنے اور پڑھنے والے ہیں۔جن علاقوں کو میں نے دیکھا ہے وہاں گھروں میں اردو کتاب تو چھوڑیئے اردو کا اخبار بھی خرید کر پڑھتے شاید ہی کسی کو دیکھا جا سکتا ہے۔زبان کی ترویج حکومت سے زیادہ زبان بولنے والوں کو کرنا چاہیے۔مرکزی حکومت کروڑوں روپیہ فروغ اردو کے نام پر ہر سال خرچ کرتی ہے۔۔۔مدرسوں میں دینیات کی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں ملیں گی۔مولوی کا الّو تو سیدھا ہو گیا باقی جائے بھاڑ میں۔

☆ اگر اقلیت کی زبان کی نسبت اس قدر تشویش ہے تو لگے ہاتھوں اقلیت کے مستقبل پر روشنی ڈالتے چلیئے؟

☆☆ اکثریت اور اقلیت کے درمیان سیاسی اور معاشرتی مسائل کے حوالے سے کشمکش دنیا کے تقریباً ہر ملک میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ہمارا ملک جمہوریت، انسانیت اور ہندوستانیت کے سیکڑوں سال پرانی روایتوں کے درمیان پلا بڑھا ہے۔ان اقدار کی ترویج اور استحکام کے لیے اکثریت اور اقلیت دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنا پڑے گا۔ایک اگر اپنی ذمہ داری اور فرائض کو بھولتا ہے تو دوسرے کو یاد دلانا ہوگا۔خانہ جنگیوں کے نتائج ہم سب کے ہی سامنے ہیں۔ترویج اور ترقی امن و آشتی کے بغیر ممکن نہیں خواہ عسکریت ہو یا جمہوریت۔جہاں اکثریت ہوگی وہاں اقلیت ضرور ہوگی۔

☆ چلیئے بھارت میں تو اردو اقلیتی زبان ہے اس لیے اس کا مستقبل تاریک ہے مگر جہاں یہ اکثریت کی زبان یا قومی زبان ہے وہاں اس کا مستقبل کیا دکھائی دیتا ہے؟

☆☆ چنگیز خان کون تھا۔گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر بستیوں میں کیوں آگ لگا رہا تھا۔چنگیز تاریخ کا ایک پیٹرن (Pattern) تھا۔تاریخ کا نیا Pattern نوع بشر سے عقیدت، حیرت اور تجسس چھن چکا ہے۔خدا کا تصور گلوبی کمزور پڑ چکا ہے، سائنس بھی بشر دوست نظر نہیں آتی۔انسان جس کسمپرسی سے گزر رہا ہے وہ پچھلے کسی عہد میں نظر نہیں آتا۔انجام ظاہر ہے۔

☆ بقول آپ کے عقیدہ، تحیر، تجسس ہم سے چھینا جا چکا ہے۔اوّل کس نے چھینا اُس کا منشائے مقصود کیا تھا نیز اس کے نتائج کیا برآمد ہوں گے؟

☆☆ خاموشی

۳۴۔ پچھلے دنوں بھارت میں ہندتوا کی جو شدید لہر چلی اُس کے حوالے سے اقلیتوں کا مستقبل سوالیہ نشان نہیں بن جاتا؟

☆☆ یہ لہریں ہر جگہ اٹھتی رہتی ہے۔نام مختلف ہوتے ہیں۔اس کا ذمہ دار ملک کا سیاسی اور معاشی ڈھانچہ ہوتا ہے۔عدم تحفظ کا احساس اس ڈھانچے میں اتھل پتھل کے سبب ہوتا ہے اس بے اطمینانی سے دنیا کا بڑا حصہ گزر رہا ہے بہرحال مشکلات پر قابو پانا ہی زندہ قوموں کی پہچان ہے اب چاہے یہ خلفشار یہاں ہو یا وہاں:

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

مگر انسان پیدائشی طور پر خودغرض ہے۔سوچتا ہے چار دن کی زندگی ہے جو آج مل رہا ہے اسے غنیمت جان سماج میں ہم آہنگی harmoney پیدا کرنے کے چکر میں پڑ کر کیا ملے گا:

ہمیں کیا تو تربت پہ میلے رہیں گے
تہہِ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے

☆ وارث علوی کے پچیس صفحات اور دو چار متفرق مضامین میرا سرمایہ ہیں یعنی اہل نقد و نظر نے آپ کو اُتنی توجہ نہیں دی جس کے آپ حقدار تھے؟

☆☆ شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ ادیب اپنا ناقد لے کر آتا ہے۔ہم وہ کام نہیں کر پائے یا پھر ہماری تحریریں ہی اس لائق نہ تھیں کہ انہیں ناقد منہ لگاتا۔دراصل فن کو اور فن پارے کو خود مکتفی ہونا چاہیے میں جتنا بھی پسند کیا گیا اپنی تحریر

کے بل بوتے پسند کیا گیا۔کیا آپ میرا گوشہ اس لیے نکال رہے ہیں کہ آپ نے کسی سے سُن رکھا ہے کہ میں بھی لکھتا ہوں؟ میرا انتخاب آپ نے کیوں کیا ہے اس کا جواز آپ کو اپنے اداریے میں کرنا چاہیے۔

☆ ترقی یافتہ دنیا کے بیشتر اہلِ قلم ملینئر ،بلینئر ہوتے ہیں اگر کرشن چندر قلم کی کمائی سے زندگی گزارتے تھے تو اس میں کیا برائی تھی۔ آپ کی کتابیں فروخت ہوتیں تو شاید آپ بھی کل وقتی ادیب ہوتے؟

☆☆ پڑھنے والوں کی پسند اچھی بری تحریروں کی پہچان نہیں ہے، ورنہ ابن صفی سے بڑا ادیب کون ہوگا۔ کرشن اس لیے مقبول نہیں کہ کُل وقتی ادیب تھے۔ میں غوطے میں گہر نایاب حاصل نہیں کرتا۔لکھنا میرے لیے عشق فغاں ہے۔کون سا نالۂ عرش تک پہنچ جائے خدا جانے۔

☆ یہ بتلایئے! کیا آپ وہ فعال افسانہ لکھنے میں کامیاب ہو سکے جس کے لیے مدت سے افسانہ لکھنے کی مشق کررہے ہیں؟

☆☆ ابھی بھی جستجو ہے کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں؟

☆ آپ اپنی سست رفتاری اور زیادہ کامیابی حاصل نہ کرنے کا اعتراف کر کے اپنا قد بلند کر سکتے تھے مگر دوسرے سانس میں اپنے وقت کے بڑے ادیبوں کو لپیٹ میں لے کر صورت حال مختلف کیوں کر لی؟

☆☆ میں نے دوسری سانس لی ہی نہیں جناب۔ میں نے کسی بڑے ادیب کو نہیں لپیٹا۔مثال دے کر آپ نے واضح نہیں کیا۔میں نے اپنی ناکامی کی کوئی بات ہی نہیں کی۔ مجھے جو شہرت ملی وہ میری خوش قسمتی ہے۔اور بڑے ادیب اب کون سے رہ گئے ہیں جن کی مٹی خراب کرتا۔ پتا نہیں کس حوالے سے آپ نے یہ سوال قائم کیا ہے۔

☆ دنیا کے گلوبل ولیج بننے سے ترقی پذیر زبانوں بلخصوص اردو کو کس طرح کے نقصانات کا سامنا ہے نیز مستقبل میں درپیش توڑ پھوڑ سے کس طرح کے خطرات درپیش ہو سکتے ہیں؟

☆☆ طلسم ہوش ربا کی زبان آج اردو کے لکچرار بھی نہیں سمجھ پاتے آپ بازار میں میر تقی میر والی اردو بولیں گے تو لوگ ہنسیں گے۔ ٹی وی کے اشتہارات میں جو تجارتی زبان بولی جاتی ہے غالب سنتے تو بھاگ کھڑے ہوتے۔گلوبل ولیج بننے دیجیے:

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

☆ پیش آمدہ خطرات سے نبٹنے کے لیے نوجوان لکھنے والوں کو آپ کس طرح بیدار بلکہ خبردار کریں گے؟

☆☆ آج کی نسل مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے وہ ایک نئی دنیا میں نئے تجربات اور احساسات کے ساتھ رہ رہی ہے۔ ہمارے سچ شاید اس کے لیے جھوٹ ہو چکے ہیں وہ اپنی سچائیاں تلاش کرنے میں ہم سے زیادہ باوسیلہ ہے ہم اس کو اپنی نیک خواہشات ہی نذر کر سکتے ہیں بس۔

○

نوحہ دندان

(مولانا حسرت موہانی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

چپکے چپکے رات دن اپنا وہ کھانا یاد ہے
ہم کو اب تک اپنے ''دانتوں'' کا زمانہ یاد ہے

کھینچ لینا وہ میرا ہڈی کا کونہ دفعتاً
اور پھر دانتوں سے وہ بوٹی چبانا یاد ہے

مل گیا رستے میں گر بادام کوئی کافر ادا
توڑ کر دانتوں سے پھر اُس کو کھانا یاد ہے

گر پڑا جنگل میں سر پر اخروٹ کوئی سر پھرا
دانتوں داڑھوں کا وہ حملہ جارحانہ یاد ہے

آ گئے غلطی سے گر ڈاکٹر کے پاس ہم
اُس کا لیکچرسن کے وہ ہنسنا ہنسانا یاد ہے

میٹھی چیزیں کھا کے خود دانتوں کا کیا ستیاناس
درد کی شدت سے پھر اپنا وہ رونا یاد ہے

آپا جمیلہ شبنم
(اسلام آباد)

''کسے ہوئے اسلوب کے لشکارے''

وارث علوی

(●)

اقبال مجید کے ناول ''کسی دن'' کو پڑھنا آسان کام نہیں اس کے باوجود ناول دل چسپ ہے۔اس قدر دل چسپ کہ مجھ جیسا سخت گیر اور نک چڑھا قاری بھی اسے تین بار پڑھ چکا ہے۔ یہ ان ناولوں میں سے ہے جس پر ہاتھ پڑتے ہی کہیں سے بھی شروع کیجیے وہ آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔شاید اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال اور اس میں مسلمانوں کی پوزیشن کو بڑے ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے اور ڈرامائی آئرنی (Irony) کے ساتھ ساتھ تیکھے طنز سے ہر واقعے میں ایک فکر انگیز چبھن پیدا کر دی ہے۔ اقبال مجید کا بیانیہ ڈرمائی یا معروضی نہیں ہے۔ناول کے راوی وہ خود ہیں اور بیانیہ میں ان کی چمکدار بذلہ سنجی اور کسے ہوئے اسلوب کے لشکارے ملتے ہیں جس کے سبب ان کے اکثر جملے تو اقوالِ زرّیں کی صفت پیدا کر لیتے ہیں۔''کسی دن'' میں کردار بہت زیادہ نہیں لیکن ان کی قلت بھی نہیں۔ ظاہر ہے اس نوع کی سیاسی ناولوں میں کردار سیاسی رویوں کی پرچھائیاں ہوتے ہیں یا ناول نگار کے اپنے منصوبوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں، اپنی کوئی انفرادیت نہیں رکھتے۔لیکن ''کسی دن'' میں چھوٹے پیمانے پر سہی، انفرادیت نہ سہی، لیکن ہر کردار کی ایک دوسرے سے الگ شناخت قائم کرنے میں اقبال مجید نے اپنی ڈرامائی صلاحیت سے اچھا کام لیا ہے۔ چاہے عبدل قصائی اپنی دکان میں بیٹھا ہے، چاہے ممو خاں شطرنج کھیلتے ہوں، چاہے پرتاپ شکلا اور شکوت جہاں سیاست اور عشق کی چالیں چلتے ہیں، اقبال مجید منظر کو ڈرامائی فریم میں قید کر کے، کرداروں کے مکالمات اور اپنے چبھتے ہوئے طنز کے ذریعے ہر کردار میں ہماری الگ سی دل چسپی پیدا کرنے اور اسے الگ سی شناخت دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس ناول میں شوکت جہاں اور پرتاپ شکلا کے کردار مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ پرتاپ شکلا خوب صورت اور ذہین ہے اور ملک کی سیکولر پارٹی کا ودھا یک ہے۔سیکولرزم وغیرہ ایک چالاک شخصیت کا اوپری دکھاوا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو آج اس ناول کی تحریر کے پانچ سال بعد اپنے کھرے روپ میں سامنے آ گئے ہیں اور اقتدار کے لیے بڑی بے شرمی سے فرقہ پرست پارٹی میں شامل ہو گئے ہیں۔اب خیال آتا ہے کہ وہ اندر سے واقعی سیکولر تھے یا انا کی نہفتہ فرقہ پرستی کے لیے دھرم پرتیکشا محض ایک نقاب تھی۔ پرتاپ شکلا جیسے کرداروں کی تعمیر میں ناول نگار کو گہرے پانیوں کو کھنگالنا نہیں پڑتا۔اتھلے لوگ ہوتے ہیں جن کی کوئی جذباتی یا اخلاقی کشمکش نفسیاتی یا فلسفیانہ دل چسپی پیدا نہیں کر سکتی۔چند ڈرامائی مکالموں اور طنزیہ جملوں سے اقبال مجید نے یہ کام نکال لیا ہے۔

یہی سطحیت شوکت جہاں کے کردار میں ہے جس کے باپ کی عمر کانگریس میں فراشی کرتے گزری اور اپنے خاندان کے لیے کچھ نہ کر سکا۔اپنے گھر میلاد کی ایک مجلس میں مہمانوں کو لڈو تقسیم کرتے ہوئے شوکت نے پہلی بار پرتاپ شکلا کو دیکھا تھا۔''بیٹی ہے میری شوکت جہاں'' باپ نے پرتاپ شکلا کو بتایا تھا۔ ''پرتاپ شکلا نے لڈو ہاتھ میں لے کر دوسرے ہاتھ کو شوکت کی کمر کے پیچھے لا کر تھوڑا اپنی طرف کھینچا اور پھر شوکت کے ماتھے کو چوم کر اس کے ایک گال کو تھوڑا سا تھپتھپایا۔''

یہ بادشاہوں ، وزیروں، سرداروں، لیڈروں، پیروں ، دھرم آچاریوں وغیرہ وغیرہ کو بیٹوں کا نذرانہ پیش کرنے کا سکّہ بند طریقہ ہے۔میلاد میں تمکنت سے یا نبی سلام علیک پڑھنے والی جوانی کی پہلی منزل میں قدم رکھنے والی شوکت جہاں کے لیے تیس سالہ پرتاپ شکلا گورا رنگ، خوب صورت آنکھیں، ہلکے گھنگھر و والے بال، کھدر کے کرتے میں گریباں کے اندر چھاتی پر گھنے کالے بالوں کے گچھے۔''میں جھوٹ کیوں بولوں، میں نے سوچا تھا، میرا دولہا اسی رنگ روپ اور کاٹھی کا اتنا ہی لمبا ایسے ہی مسکرانے والا ہونا چاہیے۔''

شوکت جہاں تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ اوسط ذہن اور معمولی قوتِ تمیز کی لڑکی ہے۔سیاست میں جرائم پیشہ لوگوں کی گھس پیٹھ کے بعد ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور آدرش وادی لڑکی کے لیے جو انسانی قدروں کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی ہے، بہت زیادہ گنجائش نہیں رہی۔شوکت جہاں ہی آدرش واد کی ہلکی سی رمق ہے جس کے سبب اس میں سماجی بہبود کے کچھ کام کرنے کا جذبہ شہباز خاں کی بیوی عائشہ سے ملنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔عائشہ ایک بہت ہی پڑھی لکھی مہذب اور خدمت گزار خاتون تھی۔لیکن وہ بہت زیادہ زندہ نہیں رہی۔اگر زندہ رہتی بھی تو شوکت جہاں شاید سماج سیوا کے راستے پر گامزن نہ ہوتی کیوں کہ اس کے عزائم کچھ اور تھے جنہیں حاصل کرنے کے لیے اپنے خوب صورت جسم کے سوا اس کے پاس کچھ اور صلاحیت یا اہلیت نہیں تھی۔ جہاں تمہاری آؤ بھگت ہی خوب صورت جسم کے لیے ہو وہاں جسم کو بچائے رکھنے میں بھی خطرہ ہے۔شوکت جہاں جسم کو داؤ پر لگائے بغیر اس کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہے، اپنی رعنائیاں لٹانے کے باوجود اپنی ذات کو لیے دیئے رکھنے میں عورت کے لیے خطرہ ہے۔گل چینوں کے حلقے میں دامن کش رہنے والی عورت اکتا دینے اور تھکا دینے والی پریشان کن شخصیت بن جاتی ہے۔طویل عشقیہ چھیڑ چھاڑ اور ٹیلی فون پر پُر ہوس گفتگو کے بعد بھی پرتاپ شکلا کی آغوش میں کچھ نہیں سماتا تو شوکت جہاں کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔نہ پارٹی میں کوئی اہم عہدہ ملتا ہے نہ اپنے بھائی قدرت اللہ کے لیے راشن کی دُکان کا لائسنس۔شوکت جہاں کمزور ہے کیوں کہ عورت ہے اور پرتاپ شکلا اسے کہتا ہے ''کسی پارٹی میں بھی جاؤ استعمال عیش و آرام کے لیے ہی کی جاؤ گی۔'' لیکن شوکت میں آدرش واد اور انا کے عناصر تھے جس کے سبب وہ آسانی سے تجگی کے لیے تیار نہیں ہو پاتی ہے۔عائشہ کی تصویر کے سامنے وہ کہتی ہے ''عائشہ باجی! آپ وقت سے اتنا پہلے کیوں گئیں۔آپ نہیں

جانتیں باپ کے مرنے کا اتنا غم نہیں ہے مجھے۔ ماں کی آوارگی نے بھی مجھے نہیں توڑا۔ بھائی کی کھوکھلی انا کا بھی مجھے شکوہ نہیں۔ مجھے تو شکوہ آپ سے ہے۔ آپ نے کہا تھا ''میں تجھے کچھ بنا کر رہوں گی'' لیکن جب شوکت جہاں سچے دل سے اپنے کو ٹٹولتی ہے تو اس کے سامنے یہ باتیں آتی ہیں کہ وہ سیاست میں اس لیے جانا چاہتی ہے کہ اخباروں میں اس کی تصویریں چھپیں۔ جلسوں جلوسوں میں نامی گرامی نیتاؤں میں اس کا اٹھنا بیٹھا رہے۔ اس کے دروازے پر جیپوں ، سرکاری امبسڈر کاروں کے ہارن بجیں۔ وہ تازہ اور شگفتہ قہقہوں سے چائے کی پیالیوں اور مشروبات کے گلاسوں سے آنے جانے والوں کا استقبال کرے۔ ظاہر ہے ان خوابوں سے اس کی انا کی تسکین ہوتی ہے۔

ایک طرف شوکت کا بھائی قدرت اللہ جو حافظِ قرآن بھی ہے، ہندو فرقہ پرست اخبار میں کام کرتا ہے۔ دوسری طرف پرتاپ شکلا تو کب سے کہتا ہے۔ اردو اور علی گڑھ کو گالی دینا تمہارے لیے ضروری ہے۔ مین اسٹریم میں شامل ہونے کے لیے یہ باتیں ہندو تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہے۔ شوکت کہتی ہے یہ نہرو کا سیکولرزم نہیں ہے۔ پرتاپ شکلا کہتا ہے سیکولرزم کسی گھرانے کی جاگیر نہیں۔ موخاں شوکت جہاں کو مشورہ دیتے ہیں ''میری مانو تو شادی کرلو۔ لڑکا میں تلاش کردوں گا۔ مگر پٹھانوں کے لڑکے عورتوں میں بہت گھستے نہیں ہیں یہ تم کو بتائے دیتا ہوں۔'' پھر موخاں نے بار بار شوکت جہاں کو شادی کے معاملے میں ٹٹول کر بھی اس کا عندیہ نہ پایا تو بولے'' بھئی کیسے رہوگی۔'' شوکت جہاں نے جواب دیا'' خدمتِ خلق کر کے رہ لوں گی۔ میرا بالکل ارادہ نہیں ہے شادی وادی کا۔''

اور شوکت جہاں کی سب سے بڑی کم نصیبی یہ تھی کہ ان تمام باتوں سے قبل وہ اپنے پڑوسی اشفاق کے ہاتھوں زنا بالجبر کا شکار ہوگئی تھی۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہ اشفاق کے گھر گئی اور سہیلیاں کتابیں دیکھنے کے بہانے دوسرے کمرے میں گئیں اور اشفاق نے اسے لہولہان کر دیا۔ آٹھ روز تک وہ اپنی پھوپھی کے گھر رہی جہاں ایک جان پہچان والی لیڈی ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا۔ اس وقت سے اسے ایک خوف نے آدبوچا۔ ایک بے نام سا بھیانک خوف چھپکلی کی طرح اس کی پیٹھ پر پنجے گاڑے چپکا رہتا۔ اشفاق تو ٹرک کے نیچے آنے سے مر گیا۔ وہ اپنے بھائی قدرت سے کہنا چاہتی تھی ''بھیا قبرستان جانا تو اشفاق کی قبر پر تھوک ضرور آنا۔''

جب بھی شادی کا ذکر سنتی تو شوکت جہاں پر ایسا ہی دورہ پڑ جاتا جیسا کہ عصمت دری کے وقت پڑا تھا۔ جبڑے ایک دوسرے سے چپک جاتے، دانت بھنچ جاتے۔ شوکت نے جب عائشہ سے اپنے خوف کا ذکر کیا تو عائشہ نے اسے لڑکیوں کے ہیلتھ کلب میں جوڈو کراٹے سیکھنے کے لیے داخل کرا دیا۔ انہیں دنوں پرتاپ شکلا بھی شوکت کے باپ سے اجازت لے کر شوکت کو پارٹی کے چھوٹے موٹے کاموں میں دیگر عورتوں کے ساتھ الجھا دیا کرتا۔ جلسے جلوس میں شرکت کرنے سے شوکت کو اپنی امتیازی حیثیت کا احساس ہوتا اور وہ سوچتی ایسے موقعے بار بار اور جلدی جلدی آتے رہنا چاہئیں۔ گویا عائشہ اور پرتاپ شکلا سے ملاقات اور پارٹی میں شامل ہونا ایک معنی میں شوکت جہاں کے لیے اپنے زنا کے خوف ناک تجربے سے باہر نکلنے کا ایک سبب بنا۔ لیکن پرتاپ شکلا کے ساتھ یہ نیا رشتہ بھی جنس کی اندھیری گلیوں میں داخل ہو رہا تھا۔ شوکت جہاں کو ایسا لگنے لگا تھا جیسے پیٹھ پر ٹھیک اسی پرانی جگہ کوئی موٹی سی چھپکلی اپنے پنجے گاڑ رہی ہے۔ اگر وہ اپنی سوتیلی ماں کی طرح تجھی کرتی تو شاید زندگی اور پارٹی میں اسے کچھ مل بھی جاتا۔ لیکن شوکت جہاں کا ذہن اور جسم دونوں نئے سیکولرزم اور نئی سیکسیو لی ٹی کے لیے تیار نہیں تھا۔ پرتاپ شکلا کا ہاتھ ابھی تک شوکت جہاں کے بدن پر نہیں پڑا تھا لیکن بدن میں گدگدیاں کرنے والی زبانی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ ٹیلی فون پر اور بالمشافہ عرصۂ دراز سے جاری تھا۔ یہ تیز اور چالاک گفتگو جو پیچ در پیچ طریقے پر جنس اور سیاست کے دھاگوں سے پرکشش ڈیزائن بناتی ہے اس ناول کی دل چسپی کا سرچشمہ ہے۔ ویسے بھی اقبال مجید مکالموں کے بادشاہ ہیں کیوں کہ وہ ایک اچھے ڈراما نگار ہیں۔ مثال کے طور پر پرتاپ شکلا اور شوکت جہاں کی ٹیلی فون پر یہ گفتگو ملاحظہ فرمائیے:

''میں تم سے شادی کرنے کے لیے چاہوں تو آج ہی مسلمان ہوسکتا ہوں۔''

''اچھا؟''

''ہاں، اخباروں میں تصویر چھپوا کر اعلان کر سکتا ہوں کہ پرتاپ جی مشرف بہ اسلام ہوگئے۔''

''کیا واقعی؟''

''بالکل! پھر تم کو اپنی منکوحہ بیوی بنا کر کسی شریف زادے کی طرح تمہارے کھونٹے سے بندھا بھی رہ سکتا ہوں۔ پر میں یہ آسان کام نہ کروں گا۔''

اس دن شوکت جہاں پر ہنسی ہنسی میں یہ راز کھلا کہ ودھا یک پرتاپ شکلا بھی گڑ تو کھانا چاہتے ہیں مگر گلگلوں سے پرہیز بھی۔ کیو؟ں کہ پرتاپ شکلا نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ وہ شوکت جہاں کی تھوڑی سی بالائی کھا کر ساری زندگی اس کی کھرچن کو نگلنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

''ایسی صورت میں میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں'' شوکت جہاں نے شرارت کے ساتھ اپنی ہنسی روکتے ہوئے پرتاپ شکلا کو چھیڑا تھا۔ اُدھر سے آواز آئی:

''تم نے کشتی لڑنے والے پہلوانوں کو دیکھا ہے کبھی''

''دیکھا تو ہے''

''ان کے جسم پر لباس کیوں نہیں ہوتا جانتی ہو؟''

''بتایئے'' وہ بولی۔

''لباس داؤ پیچ لگانے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔'' ''تو۔۔۔''

''مگر ہم ایسے پہلوان ہیں کہ جتنے زیادہ کپڑے پہنیں گے اتنے ہی زیادہ خطرناک داؤ پیچ استعمال کریں گے۔ ایسا کیوں ہے جانتی ہو؟''

''آپ ہی بتائیے'' وہ بولی۔

''اس لیے کہ ہم بدن سے نہیں اپنی خباثت سے لڑتے ہیں۔ ہماری خباثت جتنی زیادہ پردوں میں رہے گی اتنی ہی گھاتک ہوتی جائے گی۔''

ایسے طنزیہ کاٹ دار معنی خیز مکالمے جو روزمرہ کی گفتگو اور حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑتے پورے ناول میں ڈرامائی تناؤ کا حسن بھر دیتے ہیں جو سبب ہے اس کی پرتجسس دل چسپی اور تحیرزا لطیف خواندگی کا۔ ان اشاروں میں ہمارے عہد کی تصویر ہے جو خباثت کے کھوٹے پہنے ایک ہولناک المیہ طربیہ ڈراما کھیل رہا ہے۔ اس رنگ منچ پر اپنے خوب صورت چہرے کے ساتھ شوکت جہاں داخل ہوتی ہے۔ وہی شوکت جہاں جو سوچتی ہے:

''کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے وقت! ہائے اللہ کیا میں وہی لڑکی ہوں۔ چودہ یا مشکل سے پندرہ برس کی لڑکی جو باپ کی گردن میں بانہیں ڈالے اس کے منہ سے امام حسین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وصیت کے ارشادات سنا کرتی تھی۔ ''فرزند! دنیادار تو بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں جو ایک دوسرے پر غرّاتے ہیں۔ طاقتور کمزور کو کھاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بندھے ہوئے اونٹ ہیں جو نقصان نہیں کرپاتے۔ کچھ چھٹے ہوئے اونٹ ہیں جو ہر طرح کا نقصان کرتے پھرتے ہیں نہ ان کا کوئی گلے بان ہے نہ رکھوالا۔''

یہ اقتباس ان شتر بے مہاروں کی یاد دلاتا ہے جن کے کرتوتوں سے اخبار کی سرخیاں بنتی ہیں۔ ایک عورت کو مار کر اسے تندرو میں جلا دیا جاتا ہے۔ ایک حسین ماڈل کو زیادہ شراب نہ دینے پر گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ مشاعروں میں چہکتی مدھومتی کو حاملہ کرکے اس کے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ شوکت جہاں جس طرح آن کی آن میں ایک بھولی بھالی لڑکی سے منہ پھٹ عورت بن جاتی ہے، یا نبی سلام علیک پڑھنے والی لڑکی ٹیلی فون پر پرتاپ شکلا کو نربھئے اور نسکنچ طریقے سے پورا منہ کھول کر شرمائے بغیر شبدوں کو مضبوطی سے ادا کرتے ہوئے ماں کی گالی دیتی ہے، وہ اس کی شخصیت کی نشوونما کی اوبڑ کھابڑ گراف لکیر کا منہ بولتا نمونہ ہے۔ عائشہ کی قائم کی ہوئی عورتوں کی تنظیم سے شوکت جہاں کا منسلک نہ ہونا اور پاور پالٹکس کی خطرناک راہ پر چلنا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسا کہ زندگی میں کسی محبت کرنے والے مرد کا نہ آنا اور اس کی جگہ پرتاپ شکلا جس کے ناپاک ارادوں سے وہ واقف تھی، کی گرفت کا اس پر مضبوط ہوتے جانا۔ شوکت جہاں یہ بات شہباز خاں کو بتانا چاہتی تھی کہ ہر عورت اپنی زندگی میں ایک ایسے مرد کا انتظار جانے یا انجانے میں ضرور کرتی ہے جو اس سے کھلم کھلا، سب کے سامنے بلا جھجک، مصلحت اور رازداری کے اپنی محبت کا اقرار کرے، لیکن پرتاپ شکلا تو صاف لفظوں میں اسے بتا چکا تھا کہ وہ کسی ایسی سماجی شرافت والی زندگی کا قائل نہیں ہے جو اسے ساری زندگی شوکت جہاں کی کھرچن کھلاتی رہے۔

اس مرحلے پر اقبال مجید کا مفکرانہ ذہن ایک بے نظری تمثیل کے ذریعے تاریخ، تہذیب اور بایولوجی سے مثالیں قائم کرتا ہوا مردانہ شوونزم کے ہاتھوں عورت کی تذلیل کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ اقتباس طویل ہے لیکن اقبال مجید کے نادر اسلوب اور مفکرانہ ذہن کی اس سے بہتر کوئی مثال ہو بھی نہیں سکتی۔ شوکت جہاں شہباز خاں کو بتاتی ہے:

''وہ گئو رکشا کی حمایت کرتا ہے۔ بالکل صاف صاف۔''

''اچھا تو''۔ ''وہ بھی گائے کو ماں مانتا ہے جو پاکیزگی اور احترام کی علامت ہے۔''

''لیکن اس بات کا یہاں ذکر'' شہباز نے اسے ٹوکا۔

''اس لیے کہ میں نے اسے کئی بار یہ سمجھانے کی کوشش کی میں عورت ہوں اور عورت کے لیے اپنی پاکیزگی اور عصمت کی بڑی اہمیت ہے لیکن اس کے جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔''

''کیسے۔۔۔'' شہباز نے سوال کیا۔

''خدا جانے یہ خیال وہ تاریخ کے کس دور سے لایا ہے۔ وہ کہتا ہے پرانی کتابوں کی رو سے عورت کبھی پاک نہیں ہوسکتی۔ وہ سال میں بارہ بار گندی ہوتی ہے۔ بچہ رکھتی ہے تو بھی گندی رہتی ہے۔ زچگی کے بعد بہت دنوں تک اس کے پاس آنا بھی خود کو گندہ کرنا ہے۔ پھر سب سے دہشت انگیز بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ عورت اعلیٰ روایتوں کی کتنی ہی پاسدار کیوں نہ ہو مرد کو پانے اور بھوگنے کے لیے کہیں بھی فاحشہ بن جانے میں دریغ نہیں کرتی۔ جب کہ گائے کی پاکیزگی اور طہارت مسلّم ہے کیوں کہ وہ ہانک بھی دی جاتی ہے تو طاہر رہتی ہے، زخمی کیے جانے پر بھی اپنے زخم چاٹتی رہتی ہے لیکن خود کو پاکیزہ یعنی بے ضرر کہتی ہے۔ وہ ذبح ہوکر بھی لوگوں کو اپنی بوٹیاں کھلاتی رہتی ہے اور لوگ اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ مگر عورت گائے کی طرح بے ضرر نہیں۔ وہ مرد کے سینے پر سوار ہوکر کبھی کبھی اس کے جبڑے تک پھاڑ دینے کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اسے تمناؤں کے لہلہاتے باغوں میں پھراتی ہے، وصل کی بہشتوں میں سلاتی ہے اور ہجر کی دوزخوں میں جلاتی ہے اس لیے مرد ایسی تمام چیزوں کو طاہر اور پاکیزہ ماننے میں صدیوں سے تامل کرتا آیا ہے اور آگے بھی کرتا رہے گا جو مرد کو للکارنے اور ایذا پہنچانے کی قوت رکھتی ہوں، کیوں کہ جو بے ضرر ہے وہی طاہر ہے۔''

فکر کا پرورزن عورت کی بایولوجیکل مجبوریوں کو ہمیشہ اسی طرح اس کے خلاف استعمال کرتا آیا ہے۔ یہ پرورزن اس ناول میں پورے سماج اور پوری سیاست پر چھایا ہوا ہے۔ شوکت جہاں کہتی ہے کہ پرتاپ چاہتا ہے کہ جب مجھے ہمیشہ گندہ رہنا ہے تو کیوں نہ کبھی کبھی اس کے بستر پر بھی گندی ہوتی رہوں۔ وہ یہ بھی کہتی ہے کہ پرتاپ شکلا کو اطمینان ہے کہ میں ایک ایک کرکے ایسی تمام علامتیں ظاہر کرتی جارہی ہوں جو کسی عورت میں کسی مرد کے بستر تک پہنچنے سے پہلے ظاہر ہوا کرتی ہیں۔''

اور شوکت جہاں ڈرتی ہے۔ زنا بالجبر کا تجربہ ایک خوف بن گیا ہے۔ لیکن مرد کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔

وہ شکار کا شکاری کے پنجے سے نکل بھاگنے کے مصداق ہوتا ہے۔ مرد کی طرف سے گزند کا خوف لگا رہتا ہے اور شوکت جہاں میں وہ جہاں بینی، ہوشیاری اور چالاکی بھی نہیں کہ پتھر تلے آئے ہوئے ہاتھ کو دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ باہر نکالے۔ اس پر شہباز خاں اسے خالص پٹھانی مشورہ دیتے ہیں کہ ''تم اب کی بار پرتاپ شکلا کے منہ پر تھوک دینا باقی ہم دیکھ لیں گے۔'' یہ باتی ہم دیکھ لیں گے میں شہباز خاں کا وہ سیاسی اثر ورسوخ ہے جو قانون کے نگہبانوں یعنی پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں تک اپنی رسائی رکھتا ہے۔

ادھر عبدل قصائی نے پرتاپ شکلا کے کان بھر دیے تھے کہ شوکت جہاں تو شہباز خاں کی رکھیل ہے۔ اس خبر کے بعد پرتاپ شکلا کی جو ذہنی کیفیت ہے اس کے بیان میں اقبال مجید کے فن کے جوہر کھلتے ہیں۔ پرتاپ شکلا کو نہ صرف شوکت جہاں کے ناز نخرے بلکہ وہ احسانات بھی یاد آتے ہیں جو اس نے شوکت جہاں پر کیے۔ ان کے بیان کی چپت تب ہی کھانے کو تیار ہوگا جب آپ اس کا سر تین بار سہلا چکے ہوں گے۔'' گویا شر کو زیر کرنے کے لیے شر کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ اس کا اعتماد حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس کی مثال وہ عبدل قصائی کو سزا دے کر قائم کر چکا تھا۔ شوکت جہاں کا بھائی قدرت اللہ جو حافظِ قرآن بھی ہے، ایک ہندو فرقہ پرست پارٹی کے اخبار میں کام بھی کرتا ہے۔ اس سبب سے محلے کے دوسرے مسلمان اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ قدرت عبدل قصائی کے یہاں پاؤ بھر گوشت لینے جاتا ہے۔ عبدل قصائی اس پر طنز کرتا ہے۔ قدرت عبدل قصائی کو ایسی گالی دیتا ہے جو اسے اس کے باپ کا نطفہ ہونے پر مشکوک بناتا ہے۔ عبدل قصائی قدرت کے گھر کے سامنے جا کر اندرونِ خانہ خواتین کو بے نقط سناتا ہے۔ یہ گویا رذالت کا شرافت پر حملہ ہے۔ لیکن شوکت جہاں کا گھر اب اتنا شریف بھی کہاں رہا ہے۔ شوکت جہاں کی سوتیلی ماں تو بڑی باقاعدگی سے چھپے چوری کُٹنی کرتی ہے اور خاص طور پر سیاسی لیڈروں کی سیج کی زینت ہے۔ قدرت نکھٹو ہے۔ اس کے پاس کوئی کام دھندا نہیں۔ ہندو فرقہ پرست اخبار میں کام کرتا ہے جس کا ایک ہی مقصد ہے مسلمانوں کو ان کی مذہبی اور تہذیبی شناخت سے مرحوم کیا جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی بہن شوکت جہاں جو کانگریس سے منسلک ہے، اسے ایک راشنگ شاپ کا لائسنس دلا دے تا کہ وہ غریبوں کا اناج کالے بازار میں بیچ کر دھن پتی بن جائے۔ شوکت جہاں عبدل قصائی کے ہاتھوں اپنے خاندان کی یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ شہباز خاں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگی۔

''اس کے پچاس جوتے لگوانا ہیں وہ بھی کھلے عام دو ٹکے کا چکوا اور اس کی یہ ہمت۔ میرا بھائی حافظِ قرآن ہے۔ اپنی سانس سے بھی کسی کو چوٹ نہیں پہنچاتا۔ میری بھابی پانچ وقت کی نمازی، کبھی کسی سے اونچی آواز میں بھی نہیں بولی اس پردہ دار خاتون کو سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں سنائیں۔ اس کے شوہر کو زنخا بتایا۔ نیتاؤں نے اس کی برادری کا ساتھ دیا اور میرے بھائی کو ایک جاہل اور بدقوے سے معافی مانگنی پڑی۔ اس کی یہ ہمت، یہ حوصلہ۔ نیتاؤں سے مطلب پرتاپ شکلا کی سیکولر پارٹی ہے جو قصائیوں کو ناراض کر کے اپنی ووٹ بنک کھونا نہیں چاہتی۔

اس موقع پر بھی شہباز خاں سے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن موخاں کہتا ہے

''بٹی شہباز صاحب کچھ نہیں کریں گے۔ آموں کی فصل تیار ہو گئی ہے میں کروں گا تمہارا کام۔ سکھاؤں گا سبق اس بکر قصاب کو۔''

''تم کیا کرو گے؟'' شہباز نے مزہ لیا۔

''اس کو آم کھلاؤں گا۔''

''لاٹھیاں برسوا دو گے اور کیا؟''۔ ''ہرگز نہیں''

''پھر'' شہباز نے اسے غور سے دیکھا۔

''کہانا۔ میں نے سب کچھ آم سے سیکھا ہے۔ کیسے اپنی بقا کے لیے لُو دھوپ سہی جاتی ہے۔ کیسے گرم تھپیڑے کھائے جاتے ہیں اور چپکے چپکے چاشنی اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور پھر کس طرح پتوں کی آڑ میں چھپ کر جیا جاتا ہے۔ یہ سب مجھے آم نے سکھایا ہے۔ یقین کیجیے اس بقر قصاب کو صرف آم کھلاؤں گا۔''

شہباز کو ہنسی سوجھی ''تو گویا آم نہ ہوا تمہارا شناختی کارڈ ہو گیا۔''

''اس میں کچھ زیادہ شک بھی نہیں''۔ موخاں سنجیدہ تھا۔ ''اچھا آم پیدا کرنا اچھی غزل کہنے کے برابر ہے۔ خدا کی قسم ہماری تہذیب کی مٹھاس کا حال بھی آم کی مٹھاس کی طرح ہے۔''

''ہماری سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''ہماری سے مراد ہے آج کا ہندوستانی مسلمان۔ ترکی کا مسلمان سالا دسہری آم نہیں پیدا کر سکتا''

گفتگو کے آخر میں موخاں کہتا ہے ''آم کا بدل کچھ اور نہیں آم ہی ہے۔''

شوکت جہاں اپنے بھائی، بھابی اور خاندانی شرافت کے متعلق جو کچھ بیان کر رہی ہے وہ غلط نہیں ہے۔ لیکن بیٹیاں کمزوریوں کی اور شرافت و نجابت کی باتیں انحطاط وزوال کی پردہ پوشی کا کام کرتی ہیں۔ یہاں پھر Irony ہے۔ شہباز خاں اور موخاں کی گفتگو میں طنز کے فشار سے پھوٹتی ظرافت کی ہلکی سی چمک ہے۔ لاٹھیاں نہیں آم کھلا کر سزا دینے کی بات نہیں کنایہ اور قولِ محال کا امتزاج ہے۔ اور آموں کے بیان میں پورے ناول کا مرکزی استعارہ سمٹ آیا ہے۔ موخاں جیسے آدمی کا کردار اور ہندوستان جیسے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کیسے اپنی بقا کے لیے آم کی طرح گرم تھپیڑے کھا کر لُو دھوپ سہہ کر اندر ہی اندر پکتی جاتی ہے اور چاشنی پیدا کرتی ہے۔ وہی چاشنی جو غزل اور اردو زبان کی مٹھاس ہے۔ کیا دوسرے اسلامی ممالک میں گنگا جمنی تہذیب کی وہ رنگا رنگی ہے جو ہندوستان میں ہے۔ شاید اسی لیے ترکی اور ایران میں اتاترک اور رضا شاہ پہلوی کے زمانے میں مغربی تہذیب کے پیوند کاری اس طور جسارت آمیز تھی۔

مموخاں کے لٹھیٹ عبدل قصائی کو آم کے باغ میں لے جا کر اتنے آم ٹھونس ٹھونس کر کھلاتے ہیں کہ عبدل مرتے مرتے بچتا ہے اور کئی دن تک بیمار رہتا ہے۔ یہ گویا مموخاں کی اپنی تھرڈ ڈگری کی سزا دینے کا طریقہ ہے۔ پرتاپ شکلا کے قتل کا منصوبہ وہ آم کی طرح اپنے ذہن میں پکاتا ہے۔ مموخاں کے لیے پرتاپ شکلا کا قتل ایک فریضہ بھی ہے اور چیلنج بھی کیوں کہ جیسا کہ وہ کہتا ہے ہم کھیل کھیلیں گے بنی نہیں چھوئیں گے اور اگر قانون کے کارندے انصاف نہیں دلا سکتے تو اپنے دوست کی بیٹی کے لیے یہ انصاف خود حاصل کرے گا۔ پولیس کے اعلیٰ افسر نے شہباز خاں کو بتا دیا ہے کہ ''اگر آپ خود کوئی قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ ایسا قدم ہونا چاہیے جس پر لاکھ چاہتے ہوئے بھی میرا کوئی بس چل نہ سکے۔'' یہ کام اب شہباز خاں کے بس کا روگ نہیں تھا۔ یہ تو مموخاں ہی تھا جو شیطان کا سر سہلا کر اسے مار سکتا تھا۔ قتل کا یہ منصوبہ جتنا مموخاں نے خشوع و خضوع سے بنایا ہے اتنے ہی ذوق و شوق اور فنکارانہ چابک دستی سے اُسے اقبال مجید نے قلم بند کیا ہے۔ ظاہر ہے مموخاں کو قاری سے کچھ لینا دینا نہیں، وہ یہ کام خاموشی اور خفیہ طریقے پر کرتا ہے۔ اقبال مجید کو قاری سے واسطہ ہے اس لیے وہ اس کے بیان میں قاری کی دل چسپی کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ یہ پورا بیان اس قدر دل چسپ ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قتل کو آرٹ مموخاں نے بنایا یا ناول نگار نے، اس میں ایک خطرہ یہ تھا کہ تفریح کا عنصر ناول کے فطری آہنگ اور اندرونی تقاضوں سے ذرا ہٹ کر دودھ کی بالائی کی مانند الگ سے اپنی تہ جما لے۔ اس وقت ناول نگار پر انگلی اٹھائی جا سکتی تھی کہ وہ آرٹ کے دائرے سے نکل کر قاری کی تفریح کی ترغیب کا شکار ہو گیا۔ چوں کہ زیرِ بحث ناول کی پوری تکنیک ڈرامائی یا معروضی حقیقت نگاری کی نہیں بلکہ اپنے طنز، اپنے جملوں، نہایت ہی چمکدار مکالموں اور سیاسی حالات پر تبصروں کے سبب ناول میں مصنف کی موجودگی کا مسلسل احساس ہوتا رہتا ہے اس لیے یہ گمان کہ قتل کے بیان کے ذریعے ناول نگار ناول کو دل چسپ بنانے کی کوشش کر رہا ہے، فوراً ہو سکتا تھا۔ اس ترغیب اور عیب سے بچ جانے پر اقبال مجید کی فنکارانہ احتیاط کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ آم کے باغ، شطرنج کا شوق، منصب کی پاسداری، اپنے زیردستوں سے محبت اور ان کی مدد کرنے کا جذبہ اور شرپسندوں سے انتقام یہ تمام صفات مموخاں کو ان قبائلی سرداروں کا ٹائپ بناتا ہے جن کی بہادری اور سخاوتوں کے گیت قبائلی شعرا گایا کرتے تھے۔ ہمارے زمانے میں پارلیمانی جمہوریت جب ناتیوں، جاتیوں، فرقوں اور قبیلوں کے الیکشن اکھاڑوں میں بدل گئی تو فطری طور پر ہمارے پاس سربلند کردار دانشور اور دانش مند نہیں بلکہ مموخاں کے قبیلے کے گرد ہی رہ گئے۔

- بقیہ -

ایک روایت پسند جدید فنکار

''تم اس لائٹر کو میرا دیا ہوا ایک قرض سمجھ سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی کوئی آدمی تمہیں ایسا ملے جس نے مجھ سے اور تم سے بھی بڑا کوئی داغ اُٹھایا ہو تو یہ لائٹر اس کو دے دینا۔''

افلاس آدمی کی ایک ایسی مجبوری ہے جس سے نکلنے کی تگ و دو میں وہ مسلسل لگا رہتا ہے اور کامیابیاں اور ناکامی اس کا مقدر بنتی رہتی ہیں۔ اس کوشش میں زندگی اسے نہ جانے کتنے داغ دے جاتی ہے جن میں سے کچھ وقت کے ساتھ مندمل ہو جاتے ہیں اور کچھ تجربات کے ساتھ اس کی زندگی کا سرمایہ بنتے جاتے ہیں۔ ہم سب کی زندگیاں بھی اس طرح کے داغوں سے بھری ہیں۔ انہیں میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جن سے ہمیں حوصلہ ملتا ہے اور خود کو تسلی دینے کی روایت آگے بڑھتی ہے۔ دوسروں کے دُکھوں کو جاننے کے بعد ہمیں اپنا دُکھ کم محسوس ہوتا ہے۔ رجائیت ہی آدمی کو مایوسی سے نکال کر اُسے زندگی کی طرف لاتی ہے اسی لیے سوپر اسٹار کہتا ہے کہ ''کبھی کوئی آدمی تمہیں ایسا ملے جس نے مجھ سے اور تم سے بھی بڑا کوئی داغ اٹھایا ہو تو یہ لائٹر اس کو دے دینا۔'' اس جملے میں موجود درد کی ٹیس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سدھیر اور سوپر اسٹار کے وہ داغ بھی ان دونوں کے ہاتھ پر نہیں بلکہ دل پر لگے تھے جسے امانت کی طرح ساتھ لیے وہ زندگی کا سفر طے کرتے رہے۔

ان سے ہٹ کر بھی اقبال مجید کے یہاں کئی افسانے ہیں جیسے ''نقد بھگتان''۔ ''چراغِ آرزو''۔ ''خلیق الزماں کی ٹم ٹم''۔ ''کھنڈر قندیلیں اور خاموشی''۔ ''تماشا گھر'' اور ان کے علاوہ بھی کئی جو ہمارے سماجی اور معاشرتی مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں، ان پر بھی تفصیلی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ ایک مضمون میں یہ ساری باتیں سمیٹی نہیں جا سکتیں۔ اسی لیے اُن پر لکھنے کی ابھی گنجائش باقی ہے۔ ان کے سماجی شعور اور تخلیقی بصیرت نے انہیں کسی مروجہ ادبی رجحان یا مکتبِ فکر کا پابند نہیں بننے دیا اور یہی بات انہیں ہمارے عہد کا ایک اہم اور ممتاز افسانہ نگار بناتی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اقبال مجید کی تخلیقی قوت اب بھی ان میں پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے اور وہ افسانے لکھ رہے ہیں۔

☆

نمک ذائقہ بھی ہے اور زنجیر بھی

شمیم حنفی
(دہلی، بھارت)

اقبال مجید کے اس ناول کی بابت کچھ اور کہنے سے پہلے میں اپنے ایک تاثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔اس ناول کو میں پڑھتا جاتا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ غالب کی ایک غزل میرے احساسات کا برابر پیچھا کیے جا رہی ہے۔

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

معاصر فکشن میں ایسی مثالیں کم ہیں جو ایک ساتھ کئی واسطوں سے ہماری بصیرت پر اثر انداز ہوسکیں۔اور دوسروں کا کیا ذکر، خود اقبال مجید کی تحریروں میں ایک پر پیچ اور وسیع تر سطح پر اس تجربے سے میرا تعارف پہلی مرتبہ ہوا۔اس ناول میں اقبال مجید کی حسیت اپنی پہچان کے کئی نشانوں اور علاقوں کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔بے شک، شہر بدنصیب کی کہانیاں اور ان کا پچھلا ناول ''کسی دن'' ان کی حسیت کے پڑاؤ سے زیادہ اس کی تلاش اور تحریک کا احساس دلاتے ہیں۔ان میں اقبال مجید کی گرفت اپنے جذبوں پر زیادہ مضبوط ہے۔ان کا شعور پہلے سے زیادہ منظم ہے۔ان کے تخلیقی اعتماد کا تاثر پہلے سے زیادہ گہرا ہے۔تجربے کو موضوعاتی اساس بہم پہنچانے والی زندگی سے ان کا تعلق زیادہ کھرا، زیادہ وسیع اور زیادہ پر پیچ ہے۔لیکن اس ناول ''نمک'' میں انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح عبور کیا ہے کہ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک، قصے میں کہیں بھی ان کی طرف سے کسی طرح کی مداخلت کا احساس نہیں ہوتا۔ایک دھیمے، خوش خرام، متناسب اور متوازن بیانیے کی یکساں کیفیت شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ایک طرح کا No nonsense رویہ تو بنیادی تجربے پر مکمل ارتکاز سے جنم لیتا ہے جو کہانی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعے اور معمولی سے معمولی کردار کے سامنے لکھنے والے کی اپنی شخصیت اور اس کی ترجیحات کو تقریباً بے معنی بنا دیتا ہے۔اسی لیے تو ایک سو پچھتر صفحوں کی اس کہانی میں مرکزی کردار زہرہ خانم سے لے کر غریب، بے بس امینہ تک جس کی حیثیت بہ ظاہر ایک فالتو کردار کی ہے، سب کے سب اس بیانیے کو اپنے ''منطقی'' انجام تک پہنچانے کے معاملے میں بے حد ضروری دکھائی دیتے ہیں اقبال مجید نے نہ تو ان کرداروں پر اپنے آپ کو کہیں حاوی ہونے دیا ہے، نہ اس کہانی کی تشکیل میں کام آنے والے کسی مرئی یا غیر مرئی عنصر پر وہ تمام لوگ اور وہ تمام چیزیں جو اس کہانی کو بنانے میں صرف ہوئیں ہیں اس کہانی کے سنانے والے (مصنف) سے زیادہ اہم محسوس ہوتی ہیں۔چھوٹے بڑے کُل چراغ اپنی اپنی جگہ روشن ہیں!

رائج الوقت اور مقبول اصطلاحوں سے اگر میں یکسر برگشتہ خاطر نہیں، تو ان کے جا و بے جا استعمال کا مجھے کوئی خاص شوق بھی نہیں ہے۔اسی لیے نمک پر ایک وجودی ناول کا عنوان چسپاں کرتے ہوئے مجھے تھوڑی جھجک سی محسوس ہو رہی ہے۔تاہم، ایک قابل ذکر بات جو اس ناول کے ہر حساس پڑھنے والے کے دماغ میں ابھرے گی، یہ ہے کہ اقبال مجید نے کسی رسمی فلسفے کا سہارا لیے بغیر، نمک میں انسانی ہستی سے وابستہ کچھ بنیادی اور ناگزیر سوالوں پر سنجیدہ غور وخوض کا راستہ دکھایا ہے۔اور ان کی سوچ کا انداز بڑی حد تک فلسفیانہ ہے۔پھر بھی خوبی کا پہلو یہ ہے کہ اقبال مجید نے خود کو کہیں بھی خشک اور تھکا دینے والی یا قصے کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرنے والی کسی بحث میں الجھائے بغیر بس یہ کیا ہے کہ سامنے کی کسی واردات، کسی شعر، یا نظم کے حوالے اور کسی واقعے کی طرف اشارے سے خاصا معنی خیز کام لے لیا ہے۔تفصیل میں اترنے سے وہ ہر جگہ بچ نکلے ہیں۔شاید اسی لیے یہ ناول لسانی کفایت شعاری، بیان کی بلاغت اور ایجاز کا بھی ایک اچھا نمونہ بن گیا ہے۔یہ ناول ایسے افراد کی کہانی ہے جو ذلتوں کے اسیر ہیں۔جو اندر سے شکستہ اور تنہا ہیں اور جن کا المیہ یہ ہے کہ اپنی تنہائی انہوں نے خود سے نہیں چنی ہے۔یہ تنہائی ان پر حالات نے مسلط کر دی ہے۔یہ لوگ، تقریباً سب کے سب، ایک عذاب کے اثر میں ہیں، Condemend اور تقدیر کے مارے ہوئے۔ ٹھکرائے ہوئے لوگ ہیں۔ان کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان بدبخت، اندھیری یادوں سے کیسے بچائیں جو جونک کی طرح ان کے حواس سے چمٹی ہوئی ہیں اور مادی فراغتوں کے باوجود جو لمحہ امروز میں ان کے اندر اپنے وجود کی آزادی اور اپنے ماضی سے چھٹکارے کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتیں۔

اقبال مجید نے کسی دن کی ٹھیٹ اور کھردری حقیقت نگاری کی جگہ اس ناول میں سطح کے اوپر کی حقیقتوں، خالص ارضی اور مادی چیزوں کے ساتھ ساتھ، باطنی منظر نامے کے بیان کو آگے بڑھانے والے استعاروں اور علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔اس طرح اپنا ایک معین چہرہ رکھتے ہوئے بھی ہم اس ناول کو ایک طرح کی تمثیل اور تجرید کا نام دے سکتے ہیں۔سامنے کی سچائیوں کی بنیاد پر ایک اسطور وضع کرنے کی یہ کوشش کامیاب اس لیے ہوئی کہ اقبال مجید نے صارفی معاشرے کے فروغ، ایک نو دولتیے طبقے کے عروج اور پرانی ثقافت کے آثار کو مٹانے کے درپے نئے تہذیبی خلقیے کی بالا دستی کا جائزہ بہت غیر جذباتی اور معروضی انداز میں لیا ہے۔انہوں نے اپنا سروکار نہ تو اجتماعی زوال کے ماتم سے رکھا ہے۔ نہ اس نئے نظامِ اقدار کی پذیرائی سے جس کا مفہوم متعین ہونا ابھی باقی ہے۔وہ رخصت ہوتے ہوئے زمانے کو نہ تو خدا حافظ کہتے ہیں نہ ہی نئے زمانے کا استقبال کرتے ہیں۔جہاں تک اس ناول میں ابھرنے والے کلچرل مرقعوں کا تعلق ہے، وہ بہت جاندار اور تابندہ ہیں، اس حد تک کہ انہیں بلا تکلف ایک نئے پکاریسک (Picaresque) ناول کے مرقعوں کا نام دیا جاسکتا ہے۔اقبال مجید نے اپنے

کرداروں کے آداب، اطوار کا مطالعہ بہت باریک بینی کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے نام ونسب کی تضحیک یا ان پر کسی طرح کی طنز آزمائی یا ان پر ذرّہ برابر ترس کھائے بغیر ایک سنگین لاتعلقی کے ساتھ اقبال مجید نے ایک پورے عہد کے سیاق میں کچھ مٹتی ہوئی بدلتی اور بگڑتی ہوئی شبیہیں ابھاری ہیں۔ اس عمل میں وہ پہلے صفحے سے آخری صفحے تک مکمل طور پر دیانتدار رہے ہیں۔ اپنے ماحول، عہد اور اس عہد سے وابستہ مسئلوں کا ادراک، اسی لیے، یہاں کسی طرح کی جذباتیت سے آلودہ نہیں ہوسکا ہے۔ اقبال مجید کی آواز کہیں اونچی نہیں ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے محزونی کی ایک ہمرکاب کیفیت کے باوجود، اس ناول کے بیانیے پر کہیں بھی لکھنے والے کی شخصیت کا سایہ گہرا نہیں دکھائی دیتا۔

اس عہد کے مقدرات اور مجموعی صورت حال کی احاطہ بندی میں اقبال مجید نے جس فن کارانہ ضبط سے کام لیا ہے، اس کے نتیجے میں یہ ناول بیانیہ کے عام اسلوب سے الگ ہوگیا ہے۔ اختتامی حصہ تھوڑا ڈرامائی ضرور ہے، لیکن شخصی آشوب میں گھری ہوئی عام زندگیوں کے اپنے عجائب بھی ہوتے ہیں۔ اقبال مجید نے اس اختتامیے کی مدد سے شاید اس قصے کے مرکزی خیال اور اپنے موقف کا اظہار بھی کرنا چاہا ہے جو خود ان کے لفظوں میں یوں ہے کہ جینٹیک سائنس کا ایک ماہر سائنسدان مافوق الفطرت سیاہ جنگلوں میں ''آدمی کی آرزوؤں، تمناؤں، حسرتوں، یہاں تک کہ خوشیوں اور غموں کی کلوننگ کا انتہائی پراسرار کام نہ جانے کب سے کر رہا ہے۔ وہ حسرتوں، خوشیوں اور غموں کے Genes نکال کر ویسی ہی حسرتوں، خوشیوں اور غموں کی کاربن کاپیاں تیار کرنے کا ماہر ہے'' گویا کہ اس پورے تماشے سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، وہ منفرد اور مخصوص ہوتے ہوئے بھی نیا اور انوکھا یا نادرالوجود نہیں ہے۔ گویا کہ وقت کی تبدیلی کے ساتھ انسانی ہستی کے محور اور زندگی کی بنیادی حقیقتیں نہیں بدلتیں۔ گویا کہ بیرونی اور سطحی تغیرات کے باوجود کچھ سوال ایسے ہیں جو ہر زمانے میں سر اٹھاتے ہیں اور کبھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اسی زاویہ نظر سے ایک طرح کے جبریت اور مقدر پرستی بھی جڑی ہوئی ہے۔ یعنی کہ ایک طے شدہ اور مخفی منصوبے کے مطابق ہی ہر کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ چنانچہ دارالاستکبار کے مکینوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ تو ہونا ہی تھا۔ ایسا نہیں کہ اپنی صورت حال سے یہ لوگ نبرد آزما نہ ہوئے ہوں۔ ان کی جدوجہد مسلسل جاری رہتی ہے مگر بالآخر ہوتا وہی ہے، جو ان کے مجموعی ماحول اور اس ماحول سے رونما ہونے والے واقعات کی ناقابل تسخیر منطق کے مطابق پہلے سے مقرر ہو چکا تھا۔ کوئی بھی انسان آپ اپنے جہنم سے آزاد نہیں اور ہر ذی روح اپنے سینے میں اپنی آگ لیے پھرتا ہے۔ اسی لیے تو سب کے سب اپنے دکھوں میں اپنا سراغ پاتے ہیں اور اپنے دکھوں کی امانت سے دست بردار نہیں ہوتے۔

اقبال مجید نے اس ناول کے واسطے سے ایک مخصوص انسانی تجربے اور صورت حال کے سیاق میں اپنا ایک بیان (Statement) قلمبند کیا ہے۔ ان کی تخلیقی کامرانی کا رمز یہ ہے کہ اس بیان کے لیے زمانے کی عدالت میں انہیں بہ نفس نفیس حاضری کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ فن کارانہ تجربے اور ادراک کی سب سے موثر شکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اپنے مطلوبہ معروضی تلازموں کی تلاش میں لکھنے والا کامیاب ہوجائے اور اسے بے وجہ بھٹکنا نہ پڑے۔ اس ناول کا سب سے نمایاں وصف یہی ہے کہ اقبال مجید نہ تو کہیں بھٹکے ہیں، نہ ہی ان کی جستجو کہیں اپنے مفہوم اور اپنے تخلیقی مقصد سے عاری ہوئی ہے۔

- بقیہ -

زہرپاش طیارے

''میں کیا جواب دوں گا''

اسی وقت یکبارگی کمرے کے دروازے کے دونوں پٹ آندھی طوفان کی طرح کھلے جن کے پیچھے سلّو کی ماں کان لگائے سن رہی تھی۔ تو وہ چیخی۔

''ہاں۔ بتاؤ تم کیا جواب دوگے؟ جب خاندان کی پردہ دار عورتوں نے تم سے پوچھا کہ تمہاری لڑکی چوتڑوں پر منڈھی ہوئی جینز پہن کر اور بغیر آستین کے ٹاپس کے اندر چھاتیاں اُچھال کر مردوں کو رِجھاتی ہے تو تم کو کیسا لگتا ہے۔ کیا تم نے انہیں کوئی جواب دیا تھا، ساری زندگی میری بچی کو بے دینی کے زہر میں نہلا کر تم مجھے جہنم کی آگ میں سینکتے رہے، وہ ماں کو چٹکیوں میں اُڑانے لگی۔ میں ذلتیں جھیلتی رہی اب لڑکے کو جہنمی نہ بننے دوں گی۔ جب تمہاری لاڈلی یاریاں کر کے حمل گرائے گی تو کیا پنکھے میں لٹک کر مروگے یا تب بھی شرم نہ آئے گی۔'' یہ سن کر ٹھیکیدار کا منہ یکایک شرم سے سرخ ہوگیا اور وہ تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دوسری شام سلّو کے گھر کے باہر پڑوسیوں کی بھیڑ لگی تھی، کچھ پولیس والے فوٹوگرافر کے انتظار میں بار بار گھر کے اندر باہر آجا رہے تھے۔ ٹھیکیدار عبدالکریم بھیڑ سے الگ ایک کونے میں گردن جھکائے کھڑے تھے ایک سفید پوش پڑوسی ان کے پاس گئے، دھیرے سے بولے۔

''کیا آپ کو معلوم ہے لاش مردانی ہے یا زنانی'' عبدالکریم کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، گھٹی آواز میں کہا۔

''نہ مردانی ہے نا زنانی۔ شاید وقت کے دباؤ میں آئے ہوئے انسانوں کی لاش ہے۔'' پھر انہوں نے گردن جھکائی اور بڑبڑائے ''اس دنیا سالی کی تو ماں کی۔۔۔'' گردن اُٹھائی تو دونوں آنکھیں چھلچھلا پڑیں، وہ آنسوؤں سے تر چہرے کو دونوں ہتھیلیوں سے صاف کرنے لگے۔

اقبال مجید کی افسانوی منزلیں

مہدی جعفر
(ممبئی، بھارت)

الوجہ

اس بار اقبال مجید صاحب ملے تو انہوں نے اپنے مخصوص جوشیلے انداز میں کہا۔

''یو۔جی۔کرشنا مورتی کی ایک کتاب پڑھی۔''سوچ تمہاری دشمن ہے یہ ایک نیا فلسفہ پیش کرتی ہے۔''

''اچھی ہے۔''میں نے جواب میں کہا۔''اس میں آتنک واد اور بلڈ پریشر دونوں کا علاج ہے۔کہاں جائے گا گلوبلائزیشن۔''

ہم دونوں ہنسنے لگے۔یوں بھی ہنسنا سوچ کا ردِ عمل ہے۔ایک تصادم جو سوچ اور مخالف سوچ کے درمیان رہائی کا کام کرتا ہے۔

میں نے کہا''چلیے ہم ہنس ہنس کر گریہ سر کریں گے۔سوچ کی دشمنی نہ پالیں تو بہتر ہے۔بس محسوس کریں۔''

اقبال مجید دوستوں کے دوست ہیں۔ابھی الہ آباد سے بھوپال آیا تو سب سے پہلے انہیں فون کیا۔ایک سال کے وقفے کے بعد ہم لوگ اس طرح ملے گویا مدتوں بعد ملے ہوں۔

یاد آتا ہے سرکار نے مجھے سن اکہتر میں منتقل کر کے بمبئی سے بھوپال روانہ کر دیا تھا۔کہاں بمبئی، جو شہر کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے اور کہاں بھوپال، جس کی حیثیت اور جسامت ایک تحصیل سے زیادہ نہ تھی۔یہ برّ وکاٹ بھوپالیوں اور دفتری ملازمین کی آماج گاہ تھا مگر سنگلاخ چٹانوں والی زمین، مسجدوں بڑے بڑے تالابوں اور پہاڑیوں والا شہر بھی تھا جس کے عین وسط میں ایک پہاڑی پر خوبصورت برلا مندر دور سے نظر آتا ہوا۔یہ تھا مالوہ کی معتدل آب و ہوا کا فرحت بخش اور شاعروں اور ادیبوں کا مردم خیز علاقہ جو غزل سرا شاعر اختر سعید خاں کی جائے سکونت بھی ہے اور جہاں رہ کر ابو محمد سحر، حامد حسین اور عبدالقوی دسنوی نے ادب نوازی کا علم بلند کیا اور جس کے ادبی حلقے میں کبھی غالب اور اقبال بھی شامل ہوئے تھے۔یہاں کی ہواؤں نے گیت گائے تھے اور پرندوں نے نغمے سنائے تھے۔یہ خوش الحانیاں دیار بہ دیار ملک بہ ملک گشت کرتی رہی ہیں۔

میں نے اپنے سامنے اس خوبصورت فطری مناظر والے مگر پس ماندہ سے علاقے کو عالی شان شہر میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے جس کے ترقی پذیر ہونے میں کسی نہ کسی زاویے سے خود بھی شامل رہا ہوں اور اقبال مجید بھی اور آج یہ سنٹرل انڈیا کا مخصوص ڈسٹرکٹ بھی ہے اور کیپٹل بھی۔

سن اکہتر میں اقبال مجید سیتا پور (یوپی) میں تھے۔اسی زمانے میں میں بھوپال آیا تو میری فیملی کو رہنے کے لیے شہر کے درمیانی علاقے میں ایک سرکاری مکان الاٹ ہوا۔اسے نارتھ ٹی ٹی نگر کہتے ہیں۔میرے گھر کے سامنے والے گھر میں لکھنؤ سے آکر بسی ہوئی ایک فیملی رہتی تھی جس سے ہمارے اچھے قریبی مراسم ہو گئے تھے۔ان لوگوں نے ہماری بے وطنی میں وطن کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ایک بزرگ میاں بیوی، جو ہمارے لیے ماں باپ کی طرح شفیق تھے، ان کا ایک بیٹا شاعر تھا نام اجلال مجید اور بہو آرٹسٹ۔ہم بہترین پڑوسیوں کی طرح گھل مل گئے تھے۔ماں نے جب اقبال مجید کا ذکر کیا تو میں چونکا۔

یہ اقبال مجید کے والدین تھے۔اجلال مجید کی شادی بھوپال میں ہوئی تھی اور اب یہ شہر اپنا تھا۔

بھوپال میں اقبال مجید کی آمد پہلے پہل عارضی طور پر ہوئی۔انہوں نے سیتا پور اور گردونواح کے شہروں میں اپنا کامیاب ڈرامہ (کُتّے) اسٹیج کیا تھا۔پھر اس کی نمائش بھوپال کے ٹیگور ہال میں کرنے کے لیے آئے تھے۔اقبال مجید جلد ہی دوبارہ بھوپال آئے تو آل انڈیا ریڈیو کی سروس نے انہیں بھوپال کی جز و لاینفک شخصیت بنا دیا اور وہ یہیں کے ہو رہے۔

اس طرح میں نے اقبال مجید کی وجیہ شخصیت کو توجہ سے دیکھا۔مگر انہیں افسانہ پڑھتے ہوئے سنا بھوپال کی ایک نشست میں جو فضل تابش کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی جس کی صدارت شفیقہ فرحت نے کی تھی۔انہوں نے کسی مزار کے موضوع پر لکھا اپنا مزاحیہ افسانہ بھی پڑھا تھا۔یہاں پر کوثر جہاں اور فرحت جہاں کے علاوہ دوسرے ادیب و شاعر جمع ہوئے تھے اب ان کے نام حافظہ میں محفوظ نہیں ہیں۔اقبال مجید نے اپنا نیا افسانہ ''پیشاب گھر آگے ہے'' سنایا تھا اور افسانے کے علاوہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کر دیا تھا۔

الاظہار

''عدو چچا'' سے اب تک اقبال مجید کو افسانے لکھتے ہوئے آدھی صدی گزر چکی ہے۔اس لمبے عرصے میں ان کی تحریریں کئی تبدیلیوں سے گزریں۔ان کے مجموعے ''دو بھیگے ہوئے لوگ''،''ایک حلفیہ بیان''،''شہر بدنصیب'' اور ''تماشا گھر'' (جو اشاعت کی منزل میں ہے) ان کی افسانہ نگاری کے الگ الگ پڑاؤ کی نمائندگی کرتے ہیں۔یہ پڑاؤ اسلوبیاتی رجحانات، ملکی اور عالمی صورت حال، ماحول اور تفکیری انداز کی واضح تبدیلیوں سے عبارت ہیں۔جو چیز نہیں بدلی ہے وہ ہے نظریاتی طرز فکر جس پر وہ سختی سے قائم ہیں۔''عدّو چچا'' اور ''ٹوٹی چمنی'' میں اس دور کا انداز بیان ہے جب منٹو، بیدی، کرشن چندر، اے حمید، حیات اللہ انصاری، عصمت، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی جیسے فنکاروں کی تحریریں نئے افسانہ نگاروں کو متاثر کر رہی تھیں۔مصنف کی نوجوانی کی عمر تھی جو اس پر دباؤ ڈالتی تھی کہ ارد گرد کا دلچسپ بیان وضع کرے اور سامنے کے کردار کو من وعن اور ہو بہو حقیقی تصویریت کے ساتھ برتے اور کوئی بات نکالے۔افسانہ نگاری کی اساس زبان، ماحول سازی

اور کردارنگاری تھی۔ زندگی انہیں دائروں میں محدود تھی اور تحریر میں شباب کی جھلک تھی۔ ''ٹوٹی چمنی'' میں عشو باجی کے رونے کے پیچھے جو بات چھپی ہوئی ہے اس نے افسانوی تجسس کو بے حد بڑھا دیا ہے۔ ''عدّو چچا'' کو پڑھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے لاشعوری طور پر فسانۂ آزاد چھنتا چھناتا ہوا اس دور کی کردار نگاری قائم کرنے کے لیے اپنا کام کر رہا ہو۔ یہ افسانے بہرحال اسی زمانے کے ہیں جس زمانے میں (سنہ ۵۳ء) مصنف نے انہیں وضع کیا ہے۔ مگر ''عدو چچا'' افسانے کے اختتامیہ حصہ میں زماں سے باہر آ جاتا ہے کہ اس کردار نے اپنی اکڑ والی خصوصیت چھوڑ دی ہے اور اس سے باہر نکل کر حالات سے سمجھوتا کیا ہے۔ یہ کردار آج پچاس سال بعد بھی اس طرح فکر انگیز ہے کہ شاید مصالحت آج کے دور میں بھی اپنی وہی قدر رکھتی ہے۔

اقبال مجید نے جب ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' لکھا تو اس میں وقت کی یہ تبدیلی صاف نظر آتی ہے کہ کردار کی مرکزیت نہیں رہی بلکہ ماحول مرکزی ہو گیا ہے۔ اسلوب بیان کی بنیاد حالات ہیں۔ اس افسانے میں پرانی اور نئی پیڑھی کے اپروچ کا عمل ردّعمل ہے۔ لگاؤ، حیرت وجستجو اور عقیدہ جیسے رگ وید والے الفاظ پر اپنا اثر اور معنویت کھو دیتے ہیں۔ بیانیہ نے فسانۂ آزاد کے اثر سے گلوخلاصی حاصل کر لی ہے۔ یہاں قدروں کو محفوظ کرنے اور نہ کرنے کی کشمکش ہے، صورت حال ابسرڈ ہو چکی ہے۔ یہ افسانہ اپنے عہد کی اسلوبیاتی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ اسی طرح ''پیٹ کا کیچوا'' میں گوشت و پوست کی کردار سازی سے گریز نظر آتا ہے۔ اس میں ایک شدت نظر آتی ہے ایک منطقی سوچ اور بیان ہے ایک احساساتی عمل اور ردّعمل ہے جسے معاشرتی مذہبی اور غیر مذہبی فکر کے درمیان رکھ کر واضح انداز میں برتا گیا ہے۔ یہاں احساس اور فکر کی آویزش عجیب اور دلچسپ ہے۔

ان دونوں افسانوں کے برخلاف ''پیشاب گھر آگے ہے'' میں داخلیت اس قدر (مگر اہم) ہے کہ ایک شخص پیشاب کے ''تناؤ'' میں مبتلا ہے اور سارا شہر اس کے تناؤ (Tension) سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا۔ پیشاب گھر کی تلاش وہ استعارہ ہے جس میں انسان کو اپنے درد اور دکھ سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ جو بھی ملتا ہے یہ امید دکھلاتا ہے کہ آگے مصیبت سے گلوخلاصی ہو جائے گی مگر یہ دھوکا ہی ہے۔ اس افسانے کا بیان استعاراتی ہے۔ شہر کا غیر دلچسپ ردّعمل اور پیشاب کرنے والی جگہ کا معدوم ہو جانا۔ یہ فنکاری کا نیا رویہ ہے جس میں توجہ خارجی شہر کی انسانی بے توجہی پر مرکوز کی گئی ہے۔ یہاں فردیت کی تڑپ اور کرب کی نشاندہی کی گئی ہے۔

الایقان

''پیشاب گھر آگے ہے'' کے بعد لکھے جانے والے افسانوں میں اقبال مجید کا پُر یقین اور پُر اعتماد لہجہ شدت اختیار کر گیا ہے جس کی نمائندگی ''ایک حلفیہ بیان'' میں ہوتی ہے۔ یہ افسانہ قاری کی سوچ کو مہمیز کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ قاری کی عام فکر سے الجھتا جوجھتا کچوکے مارتا ہوا اتنا پُر اثر ہو گیا ہے کہ خود ہی اس کی فکری استعداد بڑھانے کا سبب بن جائے۔ بیان کا رویہ حملہ آورانہ (Attacking) اور صدماتی ہے۔ مصنف پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ہلچل پیدا کرتے ہوئے برقی رو دوڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ایک ذہنی جنگ ہے ایک تصادم کی سی کیفیت ہے گویا یہ خود کلامیہ تصادم ہو۔ راوی کو الٹے پڑے ہوئے بڑے سے کیڑے پر سخت غصہ آتا ہے کہ اسے سیدھے ہونے اور اپنے آپ کو گرفتار اور تکلیف دہ صورت حال سے آزاد کرنے کی سکت (صلاحیت) پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ اسے سہارا کیوں چاہیے کہ کوئی رحم کھائے اور سیدھا کرے۔ فرد اور معاشرے کی یہ عملی مذلّت تو قوموں کو پسپا کر دیتی ہے۔ میں نے فون پر پوچھا کہ اس افسانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو مصنف نے کہا:

''سیدھی سادی واردات اور کردار کا منطقی بیان کرنے والی بیانیہ کہانی سے گریز کی صورت میں ایک حلفیہ بیان جیسی مختلف کہانی لکھی گئی ہے۔ مختلف ان معنی میں کہ یہ کہانی بحث انگیز پیش کش میں جس کو Discourse کہتے ہیں لکھی گئی ہے۔ یعنی اس کہانی میں ڈسکورس ہی کہانی کے واقعات پیش کرتا ہے۔ یہ دراصل Discursive Narration کی مثال ہے۔ یہاں پہلے سے فرض کئے ہوئے نہ تو کردار ہیں نہ واقعات اس کا اسلوب کہانی کو غور طلب اور بحث طلب بناتا ہے۔ اس میں وارداتی تسلسل یا ایک کیڑے کا پیٹھ کے بل پلٹ کر بے بسی میں ہاتھ پیر چلانا تو ایک ٹھہرا ہوا عمل ہے جو کچھ جاری و ساری ہے وہ بحث انگیز بیانیہ یعنی Discursive Narration ہے۔ اسی لیے اس قبیل کی کہانیاں اپنے اسلوب الفاظ اور متن کے لحاظ سے غور طلب اور بحث طلب بن جایا کرتی ہیں۔''

شاید ''ایک حلفیہ بیان'' انسان کی فکری اور عملی کمزوری کی بنا پر پیدا شدہ لایعنیت کی جانب شرارت آمیز بیانیہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کا اسلوب گو کہ فردیت والا ہے مگر قسموں کی راہ سے پورا معاشرہ جھلاہٹ کی زد پر ہے۔ ''جنگل کٹ رہے ہیں'' اور ''مدافعت'' میں بھی اقبال مجید کی اسلوبیاتی قوت نمایاں ہے۔

الاوہام

''شہر بدنصیب'' والے افسانے اپنے اسلوب کے لحاظ سے اور مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان میں استعارہ سازی علامتی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے۔ حکایتی اور داستانی اسلوب ''سکون کی نیند''، ''حکایت ایک نیزے کی'' اور ''شہر بدنصیب'' میں موجود ہے مگر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے منظر نامہ میں دراصل آج کے ماحول پر طنز ہے۔ غم و غصہ، وسوسے، اندیشے، واہمے اور شک و شبہہ کی بنا پر لکھے گئے افسانے اقبال مجید کے پچھلے افسانوں سے مختلف ہیں۔ ''شہر بدنصیب'' کے شرارت آمیز بیانیہ کی مثال دیکھئے:

''اے مسافر'' داروغہ بولا۔ ''تجھے مجھ پر غصہ کرنا ہوگا، مجھے گالیاں دینا ہوں گی، میری پیٹھ پر تازیانے مارنا ہوں گے۔'' حاتم نے ''شہر بدنصیب'' کی سیر کرنے کے شوق میں دیر رات تک داروغہ کو گھونسے لاتیں اور تازیانے مارے

خوب گالیاں دیں۔ حاتم جیسے جیسے داروغہ پر غصہ کرتا داروغہ کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے نقوش ابھرتے جاتے۔ جب حاتم غصہ کرتے کرتے بے دم ہو گیا تو داروغہ نے اسے گلے لگا لیا۔۔'' کہیں کہیں بیانیہ معنویت شفاف انداز میں ابھر آتی ہے۔ اس افسانے میں آگے چل کر فقرے دیکھیے:

''سنا ہے آگے کہیں ایک شہر خوش نصیب بھی ہے۔'' حاتم بولا۔

''جہاں لوگ غصے کو ایسی طاقت بنا چکے ہیں جو برتر کو قائم کرنے اور کم تر کو ختم کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔''

''ایک دن غصے کے گودام سے بو آنا شروع ہو گئی۔ اسے کھول کر دیکھا گیا تو پتہ چلا سارا غصہ رکھے رکھے سڑ چکا تھا اور شہر کے باسی تازہ غصہ تلاش کرنے میں لگے ہوئے تھے۔''

''اس داستان کا انجام یہ ہے کہ برسوں بعد اس شہزادے کا اس ملک کی جانب سے گزر ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس ملک کے باسی خدا سے یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اے خدا تو ہم سے ہمارا سب کچھ لے لے اور اس کے بدلے ہمیں دو پل سکون سے سو لینے کی نیند دے دے۔'' (شہر بدنصیب)

''سوئیوں والی بی بی'' میں اقبال مجید علامتی ٹریٹمنٹ دیتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ وہ کردار سازی اور ارد گرد کے واضح بیان (جو ''ٹوٹی چمنی'' کی پہچان ہے) کی جانب لوٹتے نظر آتے ہیں۔ وہ شاید آج کی پیچیدگی کی ترسیل و ابلاغ کے لیے ایسے موڑ پر آکر ٹھہر گئے ہیں تاکہ کوئی بہتر اسلوب جو صاف و شفاف بیانیہ کا نمونہ بن سکے اسے تلاش (Explore) کر سکیں۔ یہی چیز ''دسترس'' کے لیے کہی جا سکتی ہے جس میں فساد زدگی کے ماحول میں خوف اور شک و شبہ کو افسانوی اظہار عطا کیا ہے۔ ''سڑی ہوئی مٹھائی'' اقبال مجید کے صاف ستھرے بیانیہ کے انکشاف کی چغلی کھاتی ہے۔ یہاں استعاراتی رچاؤ نہیں ہے اور Absurdity کے کھیل سے ہٹ کر کہانی بنانے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ ''سرنگیں'' اس مجموعے کی بہترین کہانی ہے۔ اسے اقبال مجید نے ویسے ہی بہ سہولت لکھ دیا ہے جس طرح نیر مسعود نے ''طاؤس چمن کی مینا'' اور سریندر پرکاش نے ''بجوکا''، ''سرنگیں'' کے مقام کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ یہ ہر جنگ زدہ علاقہ کا افسانہ بن گیا ہے۔ بارودی سرنگوں کی سرزمین پر خوف و دہشت کے درمیان لٹی پٹی برہنہ عورت کی تصویر ہے جس کے عریاں جسم کی پوشیدگی کے لیے واحد متکلم اپنا جیکٹ اس کی طرف اچھال دیتا ہے۔ جلد ہی اس کی لاش پائی جاتی ہے۔ واحد متکلم دیکھتا ہے کہ اس عورت کی مردہ ہتھیلی میں اس جیکٹ کا بٹن دبا ہوا ہے۔ اسے وہ وہاں سے گھر لے آتا ہے اور جانماز پر ماں کی پیشانی کو جہاں سجدہ کرتا تھا اس بٹن کو وہاں رکھ دیتا ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔'' ''سرنگیں'' میں اقبال مجید کو انسانی + افسانوی برتاؤ کا وہ سراغ (Clue) مل جاتا ہے جو آگے چل کر ان سے ''سوختہ ساماں''، ''ہم گریہ سر کریں گے'' یا ''سخت جانوں کا انتظار'' لکھواتا ہے۔ ''تماشا گھر'' کے سبھی افسانے اقبال مجید کے غیر پیچیدہ اور صاف رواں بیانیہ پر عبور کی مثال ہیں۔

اَلبحر

اقبال مجید اب جو افسانے لکھ رہے ہیں ان میں وہ پہلے والی آبشار جیسی صورت نہیں ہے۔ پختگی تو ان کے یہاں پہلے بھی تھی مگر اب زیادہ منجھے ہوئے اور وسیع پس منظر کے ساتھ فکشن زیر تحریر ہے۔ یہ عمر کے سمندر جیسے پھیلاؤ اور تہ میں ذخیروں کے جماؤ کا نتیجہ ہے۔ اب پانی کا وہ پہلا والا اچھال نہیں ہے ہاں یہ سمندر مواج ہو گیا ہے۔ ان کے فکشن کا بیانیہ حقیقی (matter of fact) انداز میں ترسیل پر متوجہ ہے۔ نتیجہ کے طور پر انہوں نے دو ناولٹ تشکیل کیے اور کئی افسانے لکھے جو ''تماشا گھر'' کے عنوان سے ان کے زیر طبع مجموعے میں شامل ہیں۔

انہوں نے جب ''سوختہ ساماں'' لکھا تو ملک دنگے فساد کی لپیٹ میں تھا۔ بابری مسجد کا انہدام ہو چکا تھا اور مکانوں، سامانوں اور بستیوں کو نذر آتش کیا جا رہا تھا۔ اب بیانیہ ''ٹوٹی چمنی'' کی طرف لوٹا مگر اس طرح کا بیانیہ نہیں تھا بلکہ تاثر کی طویل اثر خیزی کے ساتھ تھا۔ مکانوں میں آتش زنی ہوئی تو فسادیوں نے مکینوں کے ذہنوں کو جلا کر کالا کر ڈالا۔ صرف ان مکینوں کے نہیں جن کے مکان جل گئے بلکہ ان مکینوں کے بھی جنہوں نے اس آتش زنی اور لوٹ پاٹ کا مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کو ٹھیک ٹھاک (untouched) سامان بھی جلے ہوئے کالے نظر آتے ہیں۔ وہ جدھر بھی نظر ڈالتے ہیں انہیں ایک ہی رنگ نظر آتا ہے، خوف اور دہشت کی ہوا میں جلا ہوا کوئلے جیسا رنگ۔ ''ضمیر اپنی تاریخ اپنے جغرافیے اور اپنے مکان کا اسیر ہے۔'' ایک اسی طرح کے نہ جلے ہوئے مگر جل کر سیاہ ہو جانے والے مکان کے تعلیم یافتہ (انٹلکچول) مکینوں کی داستان اقبال مجید کی زبانی اس افسانے میں کہی گئی ہے۔

میں بھوپال سے الٰہ آباد منتقل ہو رہا تھا۔ اقبال صاحب نے تردّد سے پوچھا ''اتنا زمانہ یہاں گزارنے کے بعد اب آپ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''جلے ہوئے مکان میں رہتے رہتے عاجز آ گیا ہوں۔ اب نہیں رہا جاتا۔ بس مکان بدل رہا ہوں الٰہ آباد میں سہی، دعا کیجیے بدلا ہوا مکان بھی جلا ہوا نہ ہو۔'' نئی جگہ آیا تو آنکھوں سے جلے ہوئے مکان کی سیاہی دھوتے دھوتے دو سال گزر گئے۔

الٰہ آباد میں آکر ''مشق فغاں'' کے عنوان سے چھپا ہوا ان کا افسانہ پڑھا (جسے وہ نئے مجموعے میں ''ہم گریہ سر کریں گے'' کے عنوان سے شامل کر رہے ہیں) سوختہ سامانی کے بعد مشق فغاں کے سوا چارہ نہیں اور پھر گریہ سر کرنے کی استطاعت پیدا کرنا۔ انسان ایک عالم میں نہیں رہتا سفر کرتا ہے منتقل ہوتا ہے جینے کی ہمت جٹاتا ہے پھر آخری سفر کے لیے سامان سمیٹتا ہے کہ اجل راہ میں ہے، قریب و دور کا پتہ نہیں دیتی۔ ''سخت جانوں کا انتظار'' (یہ افسانہ پہلے پہل ''صغریٰ کا بلا'' کے عنوان سے شائع ہوا) لکھتے ہوئے انہیں پوری زندگی کے وسیع ترکینوس نے گرفتار کر لیا۔ اقبال مجید ہر بار افسانہ مختلف اس لیے لکھتے ہیں کہ شاید وہ ایک بے حد فعّال افسانہ لکھنا چاہتے ہیں، شاید ایک ہی۔ اسی لیے جیسے ہی کوئی

کرید پیدا ہوتی ہے یا کوئی صدمہ انہیں للکارتا ہے وہ پچھلے کو بھول بھال کر نئے سرے سے افسانہ لکھنے پر جٹ جاتے ہیں۔ ''سخت جانوں کا انتظار'' کا وسیع پس منظر اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ یہ افسانہ ان کے شعور کے کسی تہ خانے میں دبا پڑا تھا اور وہ مصنف کی مناسب عمر کی تاک میں تھا جہاں پہنچ کر وہ اپنی مدت انتظار ختم کرے اور قلم کے ذریعہ رہائی اختیار کرے۔ اسے فنکار کی اس پختگی کی تلاش تھی جس میں پوری زندگی کی گہرائی کی تاب لانے کی سکت ہو۔ جس کے مشق قلم میں ''عدو چچا'' سے لے کر ''مشق فغاں'' تک کئی قابل توجہ افسانے شامل ہوں۔

''سخت جانوں کا انتظار'' میں اب نہ فسانۂ آزاد جیسی کردار نگاری کا عکس ہے نہ داستانی نہ علامتی بیان۔ یہاں وہ بیانی اسلوب نگارش ہے جو اقبال مجید کے اپنے پراعتماد رویہ پر مبنی ہے۔

گردوپیش کی تذکیریت کے درمیان سوانحی تانیثیت قائم کرنے کے لیے صغریٰ کا کردار خلق ہوا ہے، سمجھ میں نہیں آتا یہ عورت بول رہی ہے یا اس کی ماحولیاتی تہذیب کا احوال سنا رہی ہے، یا زندگی خود کو تہہ در تہہ نمایاں کر رہی ہے۔ یہ عورت کی اپنی صورت حال ہے یا صورت حال کی عورت ہے جس نے ابتلا زدہ محسوسات کے درمیان خوشیوں اور غموں کا سہارا لیا ہے۔ افسانے میں ایک کلچر کی صورت گری ہے جو صغریٰ کی آنکھوں کے سامنے فنا کی راہ پر ہے۔ یہ افسانہ مصنف کے حسّی اور ذہنی افق پر آہستہ آہستہ طلوع (Evolve) ہوا ہے۔

الکلام

یہ مضمون ایک قاری کے زاویۂ نظر اور افسانوی ادراک کے ساتھ اس کے احساساتی تفاعل کی بنیاد پر آگے بڑھا ہے۔ دیکھیں اپنی تحریری منزلوں کے بارے میں خود مصنف کیا کہتا ہے۔

''میری افسانہ نگاری کا سب سے پہلا دور وہ ہے جو کسی مبتدی افسانہ نگار کا ہو سکتا ہے۔ ان افسانوں کی بنیاد کرداروں پر ہے۔ شفاف اور سیدھا سادا بیانیہ ہے۔ کرداروں کی تراش خراش اور بیانیہ تحریر کرنے کی مشق کے ساتھ عہد کا تہذیبی سماجی اور سیاسی پس منظر افسانوں میں ساتھ چلتا ہے۔ یہ افسانے ۵۳ء سے ۷۰ء کے درمیان کی تحریریں ہیں۔

افسانوی سفر کا سب سے پہلا موڑ ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں روایت اور اجتہاد کی ضرورت اور افادیت سے پیدا ہونے والے Dilemma کو میں نے شدت سے پہلی بار محسوس کیا۔ مجھے لگا کہ روایت کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتی ہو نئے Challenges سے پنجہ کشی بھی بہت ضروری ہے۔ نئی اور پرانی سوچ اور اس کے ٹکراؤ کو ہماری نسل الگ نہیں رکھ پا رہی تھی۔ ہمیں لگا کہ عقیدہ، تحیّر اور تجسس ہم سے چھینا جا چکا ہے تو ان کی جگہ پر جو کچھ نیا آ رہا ہے وہ کیا ہے؟ اس کی تلاش اور جستجو تو Explore کرنے پر ہی ممکن تھی۔

اب میری کہانی کا وصف استعاراتی اور علامتی صورت حال کو کہانی میں پیدا کر کے اس صورت حال کی مدد سے خود کو اپنے عہد کو سمجھنے اور بیان کرنے کی ایک کوشش کہی جا سکتی ہے۔ اس کوشش کے عہد میں جو قابل ذکر افسانے میں نے لکھے وہ زیادہ تر صورت حال افسانے ہیں۔ مثلاً دو بھیگے ہوئے لوگ، پیشاب گھر آگے ہے، ایک حلفیہ بیان، پیٹ کا کیچوا، مدافعت وغیرہ۔ یہ افسانے بڑی حد تک استعاراتی اسلوب میں تحریر ہیں۔ جیسے چکنے فرش پر پیٹھ کے بل پڑا ہوا کیڑا انسانی تاریخ کے سیاق و سباق میں Helpless Being کا استعارہ ہے۔ یا ''پیشاب گھر آگے ہے'' میں انسان کو اپنے درد اور دکھوں سے نجات پانے کا کوئی Out let نہیں مل رہا ہے۔

تیسرا موڑ زندگی کے اس عرفان سے نسبت رکھتا ہے کہ ہمیں انسان کو اس کی تمام اچھائیوں، خوبیوں، کمزوریوں، نیکیوں اور بدیوں کے ساتھ جیسا وہ تھا، جیسا وہ تھا اور جیسا ہونے کی سعی کر رہا ہے اس سب کے ساتھ قبول کرنا ہوگا۔ کیوں کہ کوئی کہانی انسان کے اس وصف سے اس کو ہٹا کر نہیں لکھی جا سکتی۔ یہ نوحہ بیکار ہے کہ انسان قادر ہے یا لاچار ہے، یہ غم بیکار ہے کہ اس کو جھوٹی امیدوں کے ساتھ جینا پڑتا ہے، کیوں کہ وہ خواب اور حقیقت میں ایک ساتھ جیتا ہے، کیوں کہ ع اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا۔ اس لیے کہانی کو انسان کے رنگا رنگ پہلوؤں کی لطافتوں اور کثافتوں کا عکس ہونا چاہیے۔ اس لیے صورت حال کی دہشت کی کہانیوں میں صورت حال کا قد بڑھا کر اور انسان کا قد گھٹا کر پیش کرنے کی ایک غلطی غالباً غیر ارادی طور پر مجھ سے Repeat ہو رہی تھی اور یہ غلطی میرے علاوہ بھی اکثر دوسرے لوگ کر رہے تھے، جو ماضی کی کہانیاں ہی لکھتے ہیں وہ یہ شاید نہیں جانتے کہ حال کے بغیر نہ ماضی کا کوئی وجود ہے نہ مستقبل کا۔ پھر میں اس زبان اور پریس کے لیے لکھتا ہوں جس کو چند لوگ چھاپتے ہیں اور چند لوگ پڑھتے ہیں۔۔۔ میں سلمان رشدی کی طرح انگریزی پریس اور بین الاقوامی مارکیٹ کے لیے لکھنے والا ادیب نہیں ہوں۔ میں تو اس زخمی جمہوریت والے ملک کی اقلیت کی آخری سانسیں لیتی زبان کا ادیب ہوں جو اپنی زبان کے پانچ سو سالہ ادب کو خراج عقیدت پیش کرتے رہنے کے لیے دل سے نکلنے والی فغاں کی تہذیب لکھنے کی صورت میں کرتا ہے اس فغاں میں اپنے عہد کے انسان، اسکی Totality کے ساتھ سمجھنے کے لیے ایک بار پھر شفاف روایتی اور مکمل بیانیہ میں تازہ کاری کے ساتھ اپنے عہد اور اس عہد کے انسان کو افسانوی شکل میں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خیال رہے کہ عہد اور عہد کے انسان کو سمجھنے کی کوشش تو چکنے کاغذ پر چھپنے والی سیاسی اور سماجی میگزینیں بھی کر رہی ہیں لیکن ان کا زاویۂ نظر صحافت زیادہ افسانوی کم ہے، ان کے یہاں عہد زیادہ زندگی کم ہے، جبکہ افسانے میں زندگی زیادہ ہوتی ہے عہد کم۔ ان کے یہاں بابری مسجد ٹوٹنے کی تصویر ہوتی ہے افسانے میں دلوں کے ٹوٹنے کی تصویر۔ ان کے یہاں ریلوے کمپارٹمنٹ کے جلنے کی تصویر ہوتی ہے افسانے میں انسان کے خوابوں کے جلنے کی تصویر۔ ان کو گاندھی اور جناح کی تصویریں تو ہزاروں میسّر ہیں لیکن ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک بھی تصویر میسّر نہیں۔ یہ میرے افسانوں کے حالیہ موڑ کی عبارت ہے جس کی نمائندگی

سرنگیں، ہم گریہ سر کریں گے، سوختہ ساماں، سخت جانوں کا انتظار، انو کا گھر وغیرہ کرتے ہیں۔

الادراک

آیئے ''سخت جانوں کا انتظار'' کو بہ نظر غائر دیکھیں۔ اس کا پس منظر وسیع اور دبیز ہے۔ اس میں مسلم معاشرے کی اہم تاریخیت کا عکس ہے اور ایک عام سی زندگی جینے والی مسلم عورت کے طرز حیات کی تصویر اتاری گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ افسانہ کسی حقیقی کردار کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہو۔ صغریٰ کی راہ سے افسانے میں نسائیت کا برتاؤ ہے۔ افسانے کے مرکزی وسعت صغریٰ کی تنہائی ہے جسے وہ اپنے جینے کی معنویت عطا کرتی ہے اور جس میں ایک تہذیب (کلچر) کی گہرائی اور گرفت ہے۔ اس کلچر کی شیرازہ بندی اور تاریخی تصادم ہے۔ ''صغریٰ'' اس کلچر کے شعوری اور لاشعوری عمل اور ردعمل کی زندہ مثال ہے۔ اس میں شامل مذہبیت کا آخری کنارہ انتظار کی انتہا اور آخر کار مایوسی ہے۔ ''صغریٰ کو اب یقین ہو چلا ہے کہ انتظار کی اس منزل سے انہیں محروم رہنا ہے جو منزل منتظر کو شہادت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچاتی ہے۔ شہادت کا لفظ کربلا کے تاریخی واقعے کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ افسانے میں جگہ جگہ اس کا بیان ہے۔ شہید ہونے والے کے لیے شہادت پُر مسرت ہوتی ہے۔ چونکہ صغریٰ کی زندگی محرومیوں سے عبارت ہے، مسرت کی گنجائش کم ہے۔ مسرت کی نشانیوں کا بس انتظار ہے۔ انتظار کے عالم میں زندگی گزرتی رہتی ہے۔ یہ ایک بڑی اور خوشگوار تبدیلی کا امید افزا خواب ہے، جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور جس کی بشارت کتابوں میں ملتی ہے۔ صغریٰ کو قرب قیامت کا یقین اور امام زمانہ کے دور کا انتظار ہے، جس میں سوچ کو حق کو کسوٹی پر رکھ کر دیکھا جائے گا، جہاں سکینہ (ایک افسانوی کردار) کی خیر خبر لینے جانے پر وہاں گھر والے اس شک میں نہ پڑیں گے کہ صغریٰ چوری سے کچھ اٹھانے آئی ہے۔ اس تبدیلی سے زندگی میں رونق آئے گی۔ اونچ نیچ کا فرق مٹ جائے گا۔ ہر شخص کو اس کا جائز حق ملے گا۔

کب امام کی خاطر ہم نے کی ہے تیاری
کتنا ہے خلوص دل کس قدر ریا کاری
کیسے منہ دکھائیں گے جب امام آئیں گے
(سبط جعفر)

بلّے کی شمولیت افسانوی حیثیت کو بیحد بلند کرتی ہے اور اسے اعلیٰ بناتی ہے۔ بلّے پر شوہر سے متعلق صغریٰ کی یادیں مرکوز ہیں۔ بلّے کی حرکات وسکنات کے ساتھ وصی کاظم والی کیفیت، بلّے میں شوہر کی بنیان کی حسیاتی بو کا ہونا مصنف کے تصور کا کمال ہے۔ وصی کاظم کی موجودگی کا تاثر صغریٰ کے شامّہ کی لاشعوری امیجرم ہے۔ بو یادداشت کو برانگیخت کرتی ہے۔

افسانہ پڑھتے ہوئے ہم جانتے ہیں کہ جہاں صغریٰ انسان بنی رہتی ہے وہیں بلاّ وصی کاظم نما ہو جاتا ہے۔ عموماً بلّے بلیاں پر اسرار ہوا کرتی ہیں مگر اس افسانے میں بلّے کو پراسرار ہو جانے سے روکا گیا ہے۔ چنانچہ صغریٰ کے کہنے پر بلّے کا بستر پر چلے آنا پراسرار ہے بھی اور نہیں بھی۔ (وہ اکیلی رہتی تھی اور اس سے بلاّ ہلا ہوا تھا)۔ بلاّ دیوار پر رور ہا تھا اور وہ یوم عاشور کی رات تھی، یہ اتفاق عین ممکن ہے۔ یہی بات بلّے کے کتاب کھولنے کی بابت کہی جا سکتی ہے۔ راوی بھی اس واقعے کو اتفاقاً کہہ کر بیان کرتا ہے۔ صغریٰ دھیرے دھیرے بلّے کو وصی کاظم سمجھنے لگیں مگر افسانہ پڑھنے والے کو یقین نہیں آتا کہ صغریٰ کو اس کا یقین بھی تھا۔ بس صغریٰ کو شک تھا کہ وصی کاظم مرا نہیں کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے بلّے کو وصی کاظم کا مفروضہ بنا لیا تھا۔ مصنف چاہتا تو بلّے کو علامتی اظہاریت بنا کر پیش کر سکتا تھا یا اسے ایسی مخلوق بنا دیتا جو روپ بدل بدل کر سامنے آتی رہتی۔ بلاّ بس بلاّ ہے۔

الوضع

افسانوی بیان کے لیے ہمہ ذان (Omniscient) راوی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس تکنیک کی بنا پر افسانے کے کینوس کو وسیع تر کرنے اور ماحولیاتی اور معاشرتی بیانیہ خلق کرنے میں سہولت پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح صغریٰ کی طویل زندگی کو برتنا ممکن ہو سکا۔ زاویہ نظر روای کا ہے۔ اس کا تعلق کسی فرقے سے قائم نہیں کیا گیا۔ وہ جو دیکھ رہا ہے دکھاتا جا رہا ہے۔ اسے صغریٰ اور دوسرے کرداروں کے دل ودماغ میں اتر جانے کی آسانی ہے۔

افسانے کو دہری مرکزیت عطا کی گئی ہے یعنی صغریٰ اور بلّے کے درمیان کہانی نمو پذیر ہے۔ اس میں یادوں کا فلیش بیک ہے۔ حافظے کو بنیان کی بوشدت سے مہمیز کرتی ہے۔ تانیثیت کے بیان کو ممتاز کرنے کے لیے شوہر کی جگہ بلّے کو منطبق کیا گیا ہے۔ جنسی رنگ آمیزی بیان کو دلچسپ بناتی ہے۔ پہلے اور آج کے معاشرتی رویوں کا افتراق ہے چنانچہ جنسی رویوں کے فرق کے ساتھ نئی نسل کی شناخت قائم کی گئی ہے۔ معاشرے کی صورت گری میں اس کی شرافتیں، غلاظتیں، مذہب پرستیاں، رونقیں، ماتمی جلوس اور مدح صحابہ، ہنگامے، تصادم، مردانگی، ٹھنا ٹھنی، گہما گہمیاں، ان سے متعلق ڈائیلاگ اور بیانیہ نظام کے پارے خلق کئے گئے ہیں۔ افسانے کو اس ہیئت میں تعمیر کرنے کے لیے مصنف نے کرداروں سے بنائے گئے ڈھانچے پر توجہ صرف کی ہے۔ کردار سازی افسانے کی تجسیم کرتی ہے اور سالمیت میں اضافہ کرتی ہے۔

بیانیہ میں ٹکراؤ کا ٹریٹمنٹ ہے۔ مخالف تاثرات دیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک فرقہ/ دوسرا فرقہ/ مسلمان لڑکی/ ہندو لڑکا، جنسیت/ غیر جنسیت، خوشی/غم، انسان/ جانور، انتظار/محرومی، زندگی/موت وغیرہ۔

افسانے کا تخلیقی تناؤ میلوڈرامائی ہے۔ بڑھتا ہوا یہ تناؤ نقطۂ عروج تک پہنچاتا ہے۔ افسانے کے انتظار یہ طنز کو ڈرامائی انداز میں اختتامیہ بنایا جاتا ہے۔ یہ Anticlimax ہے۔

افسانے کی ٹیکنیک اور ٹریٹمنٹ کے ذریعے مصنف

Demonstrate کرتا ہے کہ غیر علامتی، غیر استعاراتی اور سریت سے عاری افسانہ کس طرح لکھا جاسکتا ہے۔ علامتی اسالیب اسی وقت استعمال ہوں جب ان سے مفر ممکن نہ ہو۔ مصنف کا مرکز توجہ عام قاری ہے۔

سریت اور علامت کا رکھنا یا سریت اور علامت کو نکال دینا یہ دونوں افسانوی کھیل ہیں اور کھلاڑیوں کے کھیل کی طرح مزا دیتے ہیں۔ کہانی بیان کرنے بلکہ اسے سنانے کا فن اقبال مجید کے افسانوں کی منفرد اور مستحکم خاصیت ہے۔

اَلنَاوِله

اقبال مجید نے اب تک دو ناولٹ لکھے ہیں۔ ان کا قد طویل مختصر افسانوں سے تھوڑا سا نکلتا ہوا ہے۔

''کسی دن'' کا ایک پورا صفحہ البیئر کامیو کے ایک قول کی نذر کیا گیا ہے۔ ''سچائی کی جستجو مطلوبہ سچائی کی جستجو نہیں ہوتی۔'' میرا خیال ہے کامیو یہ کہنا چاہتا ہے ''سچائی کی جستجو میں ہمیں اس سچائی کی طلب ہونی چاہیے جس کی تلاش مستحسن ہے نہ کہ دوسری مطلوبہ سچائیوں کی جستجو۔ سیاست پر طنز کرتے ہوئے ناول کا بیان یوں ہے۔ ''سیاست میں ہمارا کام یہ تلاش کرنا نہیں کہ سچ کیا ہے۔ ہمارا کام یہ تلاش کرنا ہے کہ وہ سچ کیا ہے جو ہمیں درکار ہے۔''

''کسی دن'' کے تار و پود اقبال مجید کا لاشعوری ذہن ایک عرصے سے تیار کر رہا تھا اور مختلف اجزاء کو چھان پھٹک کے عمل سے گزار رہا تھا۔ پہلے پہل اپنی عام روش سے ہٹ کر مصنف نے ''جنگل کٹ رہے ہیں'' کے عنوان سے یکے بعد دیگرے سیریز میں چار افسانے لکھے۔ پھر ''سڑی ہوئی مٹھائی'' کے نام سے ایک بے حد مختصر افسانہ لکھا۔ ان میں کردار، ماحول، بیان وغیرہ ویسے ہی ہیں مگر ان کی ساخت ناول کی نہیں بلکہ افسانے کی ہے اور مکمل ہے۔ ''کسی دن'' میں یہ سارے اجزا از سرِ نو خلق ہوئے ہیں اور گھل مل کر ایک نئے تناظر میں نظر آتے ہیں۔

''کسی دن'' کی تھیم آج کی سیاسی معاشرت ہے جس پر طنز و تشنیع کے وار کئے گئے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ ناول کے فن میں احتجاج اپنی روایتی سطح سے اٹھ کر تیغ بے نیام ہو گیا ہے۔ اقبال مجید طنز ل کی حدود سے نکل کر اور ابہام علامت وغیرہ سے پہلو بچا کر واضح بیانیہ عمل کے ذریعے اور فنی دائرے میں رہتے ہوئے violate کرتے ہیں، ان کی چیخ Violent ہو جاتی ہے۔ یہی ان کے ناولٹ کی کامیابی ہے۔ یہاں افسانوی عمل نہ صرف شفاف ہے بلکہ ہوش مند کردار اور سیاسی ماحول کی زندہ صورت گری بھی صاف ستھری ہے۔ مصنف قاری کو اس ماحول میں مبتلا اور ملوث کر دیتا ہے۔ اقلیتی کردار کے دروغم کو منظری احساس عطا کیا گیا ہے۔ دیکھو کہ وہ کس طرح جبر کے درمیان سانس لے رہا ہے۔ پورا کا پورا ناول دورِ جدید یعنی حال کی مصوری کرتے ہوئے سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے۔ آغاز سے انجام تک سیاسی معاشرتی تنظیم کے رویوں اور ان سے عمل اور ردّ عمل کا ایک تسلسل قائم ہے۔ نہ تو یہ کسی سیاسی دور کی تاریخ ہے نہ سیاست نامہ بلکہ حالیہ سیاسی رجحان اور طرزِ فکر کی طنز آمیز (Ironical) عکس گری ہے۔ ناول کا ڈسٹرب کر دینے والا بیانیہ کلام فکشن کا رنگ و روغن اختیار کرتا ہے نہ کہ حقیقت بیانی کا تاریخ نامہ۔ یہ سیاسی معاشرتی رنگوں کو بھرپور تناؤ سے گزار کر جان دار اور دم دار تخلیق کاری ناول کو ''عید نظارہ'' کی تمثیل بنا دیتا ہے اس بات کے باوجود کہ ناول میں استعاراتی یا علامتی پرتیں موجود نہیں ہیں۔

دوسرے ناول ''نمک'' کا تانا بانا کردار زہرہ خانم کی بیتی ہوئی اور بیتتی ہوئی زندگی کو مرکز میں رکھ کر بُنا گیا ہے۔ یہ مرکز دراصل ایک گھیراؤ ہے جس کا ایک اور مرکز ہے، وہ ہے نمک۔

نمک وہی ہے جو روز کھانوں میں ڈالا جاتا ہے یا سمندروں یا کھانوں سے برآمد ہوتا ہے اور جس کے بغیر پکوانوں کا ذائقہ ذائقہ نہیں رہتا۔ مگر اقبال مجید کے ہاتھوں میں آ کر یہ نمک ذوق کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف یہی نمک تمام لذتوں کو ایک نقطہ پر لانے کا کام کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی مرکزی فوقیت کی بنا پر الگ الگ لوازمات کے ذائقوں کی تسخیر کرتے ہوئے نئے رنگ و آہنگ سے ہمکنار کرتا ہے۔ ذائقے کی یہی تفاعلی خصوصیت کلچر کی علامت بن کر جوہر کو ممیز بھی کرتی ہے اور ممتاز بھی۔ یہی نمک ناول کی مرکزی تھیم ہے۔

یہ تھیم نمک ہے بھی اور نہیں بھی۔ بلکہ بیشتر نمک نہیں ہے۔ اگر نمک نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ ہوا یہ ہے کہ اقبال مجید نے نمک سے بنی ہوئی کھچڑی سے باہر نکال کر اس کے خوب تر ذائقے مثلاً تاریخ، تہذیب، کلچر، زہرہ خانم کی حیات، اس کے گرد گزرے ہوئے پر تکلف یا تکلیف رساں ماضی اور گزرتے ہوئے حال کی بے نمک حالت کا عطر کشید کیا ہے اس طرح ''نمک'' قدروں کی گرتی ہوئی دیواروں اور زندگی کو جوڑنے والی خوش ذوق حقیقتوں سے گریز پائی کا آئینہ ہے اور نئی نسل کی ''بے نمک'' لامرکزیت کی تصویر کشی بھی۔ یہ نئی صورت حال ہے۔ جسم وہی ہوں گے، Genes وہی ہوں گے، کلوننگ کے ذریعے زہرہ خانم کے Replica تیار کئے گئے ہوں گے مگر اسی آسمان کے نیچے اور اسی زمین کے اوپر ان گنت زہرہ خانموں کا رنگ کہیں رہ گیا ہوگا اور دوپٹہ کہیں''۔ یہ کلچر اور کلوننگ کا نمایاں فرق ہے۔

نمک دھڑکتی رواں دواں زندگی کے چہرے کی ملاحت ہے۔ اس کی عرق ریزی میں زہرہ خانم کی گزری ہوئی زندگی اور شخصیت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ وہ تنہا ہے بھی اور نہیں بھی۔ دوسرے کردار ہیں استم، سم سم، نوید، آشوتوش، کیتھرین وغیرہ (اقبال مجید ناموں کو بھی استعاراتی رنگ آمیزی سے بچاتے ہیں) جن کا تعلق حالیہ اور نئی نسل سے ہے، ناول کی دنیا کے زندہ کردار بن کر زہرہ خانم کی شخصیت کا انعکاس کرتے ہیں۔ ان کرداروں کے گردا گرد صاف دکھائی دینے والے ماحول کا بیان ہے۔ یہ Narrative ہے۔ بیانیہ کو معاشرتی تہذیب کے نمک کے ساتھ اس طرح گوندھا گیا ہے کہ نثری بیان شعری جہت سے اپنا تعلق قائم کرتا ہے۔ عطر کشید کی ہوئی شعری تہذیب کی تصویر نظر آتی ہے۔ بیانیہ صرف شعری نہیں بلکہ سائنسی، تاریخی، تحقیقی، فلسفیانہ، ثقافتی، احساساتی اور ابتلائی حدود

میں داخل ہوکران سے،ہم رشتہ ہوتا ہے۔ظاہر ہے جس نمک کا یہاں عرق کھینچا گیا ہے وہ کلچر کی طرح غیر خالص ہے۔بیانیہ کا شعری زاویہ نمک کا جوہر بن گیا ہے۔

اقبال مجید نمک کی معاشرتی اور مرکزی حیثیت کی شناخت قائم کرنے اوراس کی نمایاں لطافت کے ذریعے عہد حاضر کے انتشار خیز بے نمک رویوں کوطنز کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہیں اس کی زد میں کلوننگ کا پروگرام بھی آجاتا ہے۔وہ دکھانے میں کامیاب ہیں کہ رواں دور کی نئی نسل واضح طور پر کیا کھوتی جارہی ہے۔

البیان

''انوکا گھر'' کی تشکیل میں اوپر بیان کی ہوئی بیانیہ تکنیکیں تو استعمال ہوئی ہیں مثلاً نیم ڈرامائی طریقہ، یادیں، طنز، کردار سازی وغیرہ۔مگر اس میں ڈرامائی تکنیک کا برتاؤ بہت زیادہ ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال مجید نے ''زہرہ محل'' کے عنوان سے ایک ٹی وی سیریل بنایا تھا جو اسکرین پر دکھایا گیا۔غالباًاس کے ڈائرکشن میں وہ شامل رہے ہیں۔لہٰذا''انوکا گھر'' کا Narrative اور تکنیک کے مختلف زاویے لامحالہ طور پر اس سے متاثر ہیں۔یہ افسانہ قاری کے لیے بہت زیادہ Communicative ہے۔باتیں صاف صاف دوٹوک کی گئی ہیں جن کا بھرپور اثر پڑتا ہے۔

بیان کا لطف لینے کے لیے''انوکا گھر'' کے دوپارے پیش ہیں تاکہ براہ راست مصنف نے Discourse قائم ہوجائے۔

''عائشہ انو سے بے خبر نہ تھی۔ وہ انو کے ذہن میں چپ چاپ جھانک لینا بھی جانتی تھی۔اس نے یونہی یوجی کی وہ کتاب انو کونہیں دی تھی اور وہ یونہی انو کی عیادت کے بہانے اسے نہیں سمجھا رہی تھی کہ تھیٹر تو خیال کی پیداوار ہے اور خیال تبدیلی لانے کا اوزار نہیں بلکہ ایک خود حفاظتی میکانزم ہے جو ایک Value System کی جگہ کوئی دوسرا Value System رکھ دیا کرتا ہے۔لیکن انو کواس وقت نہ تو پلیٹو میں دلچسپی تھی اور نہ کرشنا مورتی میں۔وہ کچھ دنوں سے مختلف موقعوں پر عائشہ کے حیدر کے ساتھ لگاوٹ کے برتاؤ کو کنکھیوں سے دیکھ کردل ہی دل میں جل رہا تھا۔وہ چلا اٹھا۔

''بند کرو یہ مانگے کے فلسفیوں کا بکھان اور میری بات کا جواب دو۔''

بار باراس کولگ رہا تھا کہ شہر میں یکا یک روشنی گل ہوگئی ہے۔ ہر طرف اندھیرا گھپ چھا گیا ہے۔آسمان میں چہار طرف سے کالے دھوئیں اٹھ رہے ہیں۔کرفیوزدہ سڑکوں پر پولیس گاڑیاں دوڑ رہی ہیں اوراس کے کمرے کا باہری دروازہ کھلا رہ گیا ہے اوراسی وقت تیزی سے دروازہ کھلتا ہے اور سراسیمہ حالت میں عائشہ اندر داخل ہوتی ہے،دروازہ بند کرتی ہے کمرے کی بتی بجھاتی ہے اورانو کے پہلو میں لیٹ کراسے اپنی بانہوں میں بھرلیتی ہے اورانو سوجاتا ہے۔

اس نیند میں وہ خواب میں محسوس کرتا ہے کہ عائشہ اس کے چہرے پر اپنے گرم گرم بوسوں کی بارش کررہی ہے اور کہہ رہی ہے''نہ میں دنیا کو کچھ دینے کا دعویٰ کرسکتی ہوں اور نہ تم کو۔لیکن میں تم سے بھی کچھ نہیں چاہتی صرف تمہارا پیار چاہتی ہوں،تمہاری نازبرداری کرنا تمہارے نخرے سہنا تم سے ہم بستر ہوکر تھک تھک جانا اوراس تھکن کے خیالوں میں دن بھر ڈوبے رہ کر تمہارے اور صرف تمہارے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں۔تمہاری بیوی ہونے اور ساری بلاؤں سے تمہاری حفاظت کر کے تمہاری زندگی کو آسان بنانے والی تمہاری سکھی سہیلی ہونے اور پورے زور اور زبردستی سے پوری دہشت گردی کے ساتھ تم کو Terrorise کر کے تمہاری چھاتی پر سوار ہوکر اپنا معمولی سا تشخص بار بار واضح کراتی رہنا چاہتی ہوں تا کہ تم کہیں بھول نہ جاؤ عام طور پر مرد عورت کو تحفظ خود سے بھی نہیں دیتا یہ تو عورت کو طرح طرح کے ہتھکنڈوں اور فحش طور طریقوں سے عیّاریوں اور مکاریوں کے ساتھ خود زندہ رہ کر اوراسے زندہ رکھ کر جسم اور روح کے پورے انہاک اور لگاؤ کے ساتھ اکثر اپنی پوری پونجی داؤں پر لگا کر یہ تحفظ نواز رفاقت اس سے حاصل کرنا پڑتی ہے۔اس لیے اگر میں نے مرد کو فتح کرنے کا فضول اور پرفریب خبط پالا ہی ہے تو پھر مجھے اپنے پیٹ پر Explosive کی پٹی باندھ کر آتم گھاتی حملہ آور کی طرح پل پل مرد کواس کے عدم تحفظ کا خوف دلا کر ہی اس کو تسخیر کرنا ہوگا کیوں کہ زندہ رہنا سب کی سب سے انمول خواہش ہوتی ہے۔''

اَلْاِمکان

اب دیکھیں اقبال مجید اپنی وہ کہانی کب لکھتے ہیں جس کی تلاش انھیں ہمہ وقت بے چین رکھتی ہے۔

انسانیت کی لاج

بھارتی ریاست اُڑیسہ میں ۴۲ سالہ دانا ماجھی کسان کی بیوی کا ہسپتال میں انتقال ہوا تو غریب کسان کے پاس پیسے نہ ہونے کے سبب ہسپتال کی انتظامیہ نے ایمبولنس فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ دانا ماجھی بیوی کی لاش کمبل میں لپیٹ کر اٹھارہ کلومیٹر دور اپنے گاؤں تک پیدل گیا۔ساتھ میں اُس کی معصوم بچی بھی آنسو بہاتی باپ کے ساتھ پیدل چل رہی تھی۔کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ٹی وی چینل نے دانا ماجھی کو ایمبولنس فراہم کر کے انسانیت کی لاج رکھی۔

ایک روایت پسند جدید فنکار

الیاس شوقی
(ممبئی، بھارت)

میرا مزاج کچھ ایسا ہے کہ موسمی تبدیلیوں کے اثرات مجھ پر بہت جلد ہوتے ہیں۔ایک بار مَیں نے اپنے ایک دوست سے کہا: ''ڈاکٹر صاحب، جب ذرا سا موسم بدلتا ہے تو مجھے سردی زکام گھیر لیتے ہیں۔مَیں ان سے بہت پریشان رہتا ہوں۔کوئی ایسا علاج بتایئے کہ ان سے چھٹکارا ملے'' انہوں نے ہنستے ہوئے کہا:

''یہ تو اچھی علامت ہے کہ تمہارے احساسات زندہ ہیں اور تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہیں۔ورنہ یہ تو بے حسی ہوئی کہ سارے موسم گزر جائیں اور کچھ پتہ ہی نہ چلے۔''

اقبال مجید کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے یہ بات اس لیے یاد آئی کہ کہ شروع سے ان کے تخلیقی رویے میں اس طرح کی تبدیلی کا بجا طور پر احساس ہوتا ہے۔ چاہے وہ ترقی پسند تحریک ہو، جدیدیت ہو یا مابعد جدیدیت، عصری رجحانات کے اثرات ان کے یہاں بہت واضح ہیں لیکن ان کی اندھی تقلید سے ایک شعوری گریز بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔اقبال مجید نے جب اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تو اُس وقت ترقی پسند تحریک کا اثر باقی تھا اور افسانے کی دنیا میں کرشن چندر اور عصمت چغتائی کی مقبولیت اپنے عروج پر تھی، لیکن اسی کے ساتھ اسلوب اور موضوع کی سطح پر ایک تبدیلی بھی جدیدیت کی شکل میں تیزی سے رواج پا رہی تھی۔ جس میں اجتماعی مسائل کے مقابلے میں سماجی جبر کے تحت انفرادی و شخصی شکست وریخت نے ایک خاص موضوع کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اسی نے علامتی اور استعاراتی اسلوب کو فروغ دیا جو بہت جلد ترسیل کے المیے اور عدم تفہیم جیسے مسائل کا شکار ہو گیا۔ جب کے دوسری طرف ترقی پسند افسانے کا روایتی بیانیہ قاری کو اپنے سے جوڑے ہوئے تھا۔اقبال مجید بیانیہ کی قوت اور اثر پذیری سے واقف تھے اس لیے انہوں نے اپنے افسانوں میں اسلوب کے اس تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے بیانیہ کو اس وقت کے روایتی بیانیہ سے الگ تو کیا لیکن فیشن زدگی کا شکار ہو کر اسے رد نہیں کیا بلکہ بیانیہ اسلوب سے بھی کسی قدر رشتہ باقی رکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ابتدا سے ہی بیانیہ اسلوب کے ساتھ استعاراتی انداز میں اپنی بات قاری تک پہنچانے کی ایک شعوری کوشش کا احساس ہوتا ہے۔یعنی جو کہا جا رہا ہے بظاہر بات سامنے کی ہے لیکن اس کے باطن سے ایک اور مفہوم بھی سر نکالے جھانکتا ہے، جس تک ایک ذرا سی توجہ کے بعد رسائی مشکل نہیں رہ جاتی۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ترقی پسندوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی روایتی ترقی پسند نہ بن سکے۔حالاں کہ اس وقت ترقی پسندوں کی منعقد ہونے والی نشستوں اور جلسوں کا یہ احوال تھا کہ اس زمانے کے تقریباً سارے چھوٹے بڑے اور نو وارد ادیب و شاعران میں شرکت کرتے تھے، چاہے وہ تحریک سے متاثر رہے ہوں یا نہ رہے ہوں۔اقبال مجید ان دنوں لکھنؤ میں تھے اور وہ بھی ان نشستوں میں اکثر شریک ہوتے تھے۔قمر رئیس نے لکھنؤ کی ادبی صورت حال اور کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال مجید پر لکھے اپنے ایک مضمون ''اقبال مجید، نصف صدی کی دھوپ چھاؤں میں'' میں اس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

لکھنؤ کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ آزادی اور تقسیم کے نتیجہ میں اچانک اس میں کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔کمیونسٹ پارٹی کی نئی پالیسی کہ آزادی فریب ہے اور انقلابی لڑائی جاری ہے کے نتیجہ میں ۱۹۴۹ء سے دارو گیر کا سلسلہ جاری رہا۔بے شمار ادیب بھی گرفتار ہوئے۔لیکن اس کے باوجود لکھنؤ میں بائیں بازو کی سیاست کا بول بالا تھا۔انجمن ترقی پسند مصنفین بھی سرگرم تھی اور ہر اتوار کو اس کے جلسے پابندی سے آل احمد سرور مرحوم کے گھر نعمت اللہ روڈ پر ہوا کرتے تھے۔جن میں ہم بھی شریک ہوتے۔ مجھے یاد ہے کہ اقبال مجید نے اپنی پہلی کہانی ''عدّو چچا''، یا پھر ''پیٹ کا کیچوا'' جب انجمن کے جلسہ میں پڑھی تھی تو وہ بے حد نروس تھے۔ہم لوگ انکا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اس طرح لے چلے جیسے کربلا کے میدان میں جا رہے ہوں۔لیکن جب اس پر اچھے تبصرے ہوئے تو باغ باغ ہو گئے۔اور پھر سب نے مل کر اس کا جشن منایا۔''

حالانکہ انہوں نے ترقی پسند افسانے کے روایتی بیانیہ سے انحراف کی راہ اپنائی تھی لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھا تھا۔اسی طرح موضوع کے انتخاب میں بھی اقبال مجید نے ترقی پسندوں کی تقلید میں مزدوروں اور غریبوں کے مسائل کو اپنا manifesto نہیں بنایا بلکہ اس سے گریز کرتے ہوئے سماجی اور عصری مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ان کا افسانہ ''تھکن'' سرمایہ دارانہ سماج میں عورتوں کے استحصال کے موضوع پر ایک بیانیہ افسانہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں جدیدیوں کے نمائندہ رسالہ ماہنامہ ''شب خون'' میں شائع ہوا تھا لیکن اس دور کے شب خونی افسانوں سے بالکل مختلف تھا۔ترقی پسندوں اور جدیدیت کی شدت پسندی سے احتراز کرتے ہوئے انہوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکالی اور ان کا یہ انداز ان کی پہچان بن گیا۔انہوں نے اس بارے میں لکھا ہے:

''آج سے پچاس برس پہلے یہ بات کہتے مجھے مشکل لگتی کہ اختر حسین رائے پوری کی ترقی پسندی کا ٹھرّا یعنی کچی شراب کبھی میرے حلق سے نہ اُتری، اس میں میرے ذوقِ سلیم سے زیادہ میرے فطری مزاج کو دخل ہے۔جدیدیت نے اپنی دُکان لگائی تو اس کے خم خانے سے اٹھی ٹھرّے کی بو جس میں تیزی، شدت پسندی اور انتہا پسندی وغیرہ کی بو بہت تھی اس نے بھی میرے ذہن کو پراگندہ کیا۔'' (مَیں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں: قصہ رنگِ شکستہ: مطبوعہ ۲۰۱۱ء)

یہاں ترقی پسندی اور جدیدیت کے تئیں انہوں نے اپنا موقف واضح کر دیا ہے۔اسی فکری رویے کے تحت انہوں نے اپنے افسانوں کے تانے بانے بُنے ہیں۔عصری آ گہی کے معنی اگر یہ لیے جاتے ہیں کہ جس زمانے میں ہم جی رہے ہیں اس میں عالمی سطح پر کیا ہو رہا ہے اس کی تفصیلات سے ہم بھلے ہی واقف نہ ہوں لیکن ملکی و سماجی سطح پر اس سے انسانی زندگی اور معاشرے پر جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں اس سے واقفیت ضرور ہو، تو اقبال مجید کے افسانوں اور ناولوں میں نہ صرف گہری عصری آ گہی کا ادراک ہوتا ہے بلکہ اسی کے ساتھ فن کار کا جو ردِعمل ہے اس کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے اپنا تخلیقی رویہ اپنے ابتدائی دور میں ہی طے کر لیا تھا۔اس کی بہت اچھی مثال انہوں نے بارش کے استعارے کے ذریعے اپنے افسانے ''دو بھیگے ہوئے لوگ''میں پیش کی ہے۔

''دیکھتے ہی دیکھتے بارش نے سڑکوں اور چوراہوں کا سارا نظام درہم برہم کر دیا تھا۔لوگ گھروں سے نہ تو برساتیاں لے کر نکلے تھے اور نہ چھاتے۔اپنے اپنے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔''

نظام درہم برہم ہونے میں سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کی آمد ورفت کا متاثر ہونا، سڑک پر نمودار ہونے والے گڑھوں سے راستہ چلنے والوں کی دشواریاں، چوراہوں پر ٹریفک میں رکاوٹوں کا پیدا ہونا سب شامل ہے۔حالاں کہ اس کی تفصیل نہیں ہے،بس ایک جملے میں اس کی طرف افسانہ نگار نے اشارہ کر دیا ہے۔لیکن استعاراتی انداز میں اس بارش سے حالات میں غیر متوقع طور پر ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے زندگی پر اثرات کی نشاندہی ملتی ہے۔اچانک بارش کے سبب لوگ احتیاطی تدبیر کے طور پر برساتیاں اور چھاتے بھی نہیں لے کر نکلے تھے اس لیے بچاؤ کی خاطر ادھر اُدھر بھاگنے لگتے ہیں۔انہیں بھاگنے والوں میں دو اشخاص ایک سائبان کے نیچے پناہ لیتے ہیں اور اُن کے درمیان آپس میں گفتگو کا آغاز ہوتا جس میں اس بارش پر اُن کے مختلف ردِعمل کو افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔بظاہر بیانیہ انداز میں بارش سے پیدا ہونے والی ایک صورتِ حال کا بیان ہے لیکن پسِ پردہ استعاراتی انداز میں جو بات کہی گئی ہے وہ بہت دور تک جاتی ہے۔اس میں نئی نسل اور نئے رجحان کا پُرانے نظریات اور اقدار کے ساتھ ایک تصادم کی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔نئی نسل کی عجلت پسندی اور اس سے ہونے والے نقصان کے ساتھ پُرانی نسل کا اپنی اقدار کو بچانے اور اس کی حفاظت کے لیے کوشش کرنے کی استعاراتی ترسیل بہت عمدہ ہے۔علی احمد فاطمی نے اس افسانے کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔

آج سے تقریباً ستر پچھتر سال پہلے ترقی پسندی کی جو لہر چلی تھی اس نے بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا تھا۔صدیوں سے چلے آ رہے فرسودہ معاشرتی نظام میں چند لوگوں کی اقتدار کی ہوس نے سماج میں اقتصادی عدم مساوات کے تحت ظلم اور ناانصافی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔اس پر طرہ یہ کہ اسے مذہب کی آڑ میں جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی۔اس صورتِ حال نے اس کے مقابل ایک باغیانہ رویے کے لیے جواز فراہم کیا۔اس تناظر میں سماجی اور فکری انقلاب وقت کی ایک ناگزیر ضرورت تصور کیا جانے لگا تھا اور مارکس کے اس قول سے متاثر ہو کر کہ ''مذہب ایک افیون ہے۔''مذہب بیزاری اور مذہب کی تردید کی ایک ہوا چل پڑی تھی۔خاص طور پر ترقی پسندوں میں اس کا عام رجحان ملتا ہے کیوں کہ ترقی پسند تحریک مارکسزم سے بہت متاثر تھی۔اقبال مجید کے یہاں بھی اس کے اثرات نظر آتے ہیں لیکن ترقی پسندوں سے بہت مختلف۔وہ دہریت پسندی اور مذہب بیزاری کا اعلان نہیں کرتے بلکہ دیگر سماجی مسائل کے ساتھ اُن کے یہاں مذہب کے نام پر ہونے والی ریاکاری کے خلاف بھی ایک احتجاجی رویہ ملتا ہے۔اسی کے ساتھ وہ ادب میں نئے پن کا بھی استقبال کرتے ہیں اور سماجی نظام میں ثقافتی اقدار کی پاس داری کے بھی حامی ہیں۔''دو بھیگے ہوئے لوگ'' کی طرح ''پیٹ کا کیچوا'' اور ''خلیق الزماں کی ٹم ٹم'' اس کی اچھی مثالیں ہیں۔مذہب و عقائد کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے رسم ورواج کس طرح معاشرے میں آدمی کے لیے پریشانی اور آزمائش کا سبب بنتے ہیں''پیٹ کا کیچوا'' میں اس پر انہوں نے بڑی سنجیدہ بحث کی ہے۔''حکایت ایک نیزے کی''۔''پوشاک''۔''سخت جانوں کا انتظار'' اور اس طرح کے کئی افسانے ہیں جن میں روایات اور تاریخی واقعات سے استفادہ کرتے ہوئے انہوں نے اسے بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔اس سے نہ صرف وہ افسانے کی فضا بندی کا کام لیتے ہیں بلکہ ایک معنوی گہرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔وہ ماضی پرست نہیں ہیں اور نہ ہی اس سے نالاں ہیں بلکہ وہ اسے زندگی کا ایک ناگزیر حصہ سمجھتے ہیں۔اقبال مجید ماضی کی بازیافت سے حال کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ اسی پر مستقبل کا بھی دارومدار ہے،لیکن جب یہی ماضی کی روایات بگڑے ہوئے عقائد کی صورت میں زندگی کا حصہ تصور کی جانے لگتی ہیں تو وہ اس کا تمسخر اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔محمد علی صدیقی نے اپنے مضمون:''اقبال مجید فکر و نظر'' میں اس کی صراحت یوں کی ہے:

''ہر چند کہ وہ انتظار حسین کی طرح ماضی کی بھول بھلیوں میں ''گرفتار'' رہنا نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ ترقی پسندوں کی طرح ماضی کو قصۂ پارینہ سمجھ کر صرف اس کے مفید طلبِ خیر سے سروکار رکھتے ہیں بلکہ وہ ایک اور کام کرتے ہیں۔وہ ایک وجودی Existentialist ادیب کی طرح اپنے اوپر اور اپنے کرداروں پر ہنسوانے (یا اپنا تمسخر اڑانے) سے باز نہیں آتے اور اس طرح اقبال مجید ایک ایسے افسانہ نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں جو کسی نظریہ کسی اسلوب اور بشارت کا خوگر نہیں ہے۔وہ خاصا سفّاک ہے اور شاید یہی وہ ہتھیار ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔''

کسی بھی عقیدے کی عینک آدمی کو وہی دکھاتی ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے لیکن وہ حقیقت نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایک موہوم سی تعبیر ہوتی ہے۔اسی لیے عینک کے بغیر حقیقت تک پہنچنے اور اسے دنیا کو دکھانے کے لیے سفاکیت ضروری ہے کیوں کہ حقیقت اضافی رنگ آمیزیوں سے مبرّا ہے۔یہ اقدام آسان نہیں،بہت سے

اختلافات اور فتنوں کا باعث بنتا ہے مگر زندگی کی تفہیم کے لیے یہ ضروری بھی ہے۔

مذہب کا بنیادی کام انسان میں موجود چھوٹی بڑی کمزوریوں کا احساس دِلا کے اس سے بچنے اور ایک اچھا انسان بننے کی ترغیب دینا ہے۔ایک اچھے اور صحت مند معاشرے کے لیے یہ ضروری ہے لیکن جب وہ اپنی کمزوریوں سے بچنے کی بجائے ان کی تاویلات کے نت نئے راستے نکالتا ہے اور اس سے اپنے جذبے اور انا کی تسکین چاہتا ہے اور مذہب کے نام پر ہی اس کی ترویج کرتا ہے تو صورتِ حال اذیت ناک ہو جاتی ہے۔ جب مذہب کے نام پر ضعیف الاعتقادی فریب کاری اور مکر وریا کاری کا ذریعہ بنتی ہے تو اقبال مجید خاموش نہیں رہ پاتے۔اُن کا افسانہ ''صغرا کا بلاّ '' جو اُن کے مجموعے ''تماشا گھر'' میں ''سخت جانوں کا انتظار'' کے نام سے بھی شامل ہے کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کبھی خبر آتی کہ جعفری وکیل کے عزا خانے میں امام حسین کے علم سے خون کی دھار بہی، کبھی عورتیں خبر لاتیں کہ بینک منیجر نقوی صاحب کے امام باڑے میں آقا مولا کے علم سے سنہری شعاعیں پھوٹتی ہیں۔صغریٰ یہ خبریں سنتیں، عورتوں کو جوق در جوق ایسے امام باڑوں میں دھکا مکی کر کے گھستے ہوئے دیکھتیں اور سانس روکے کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر پاتیں۔ دوسروں کے بارے میں تو وہ کچھ نہ کہہ سکیں، لیکن جس دن مہندی کا جلوس تھا اس شام انہوں نے اپنی بہو کو شہیدِ کربلا حضرت قاسم کے تابوت پر استادہ علم کو مہندی سے بستے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بعد میں سینہ پیٹ پیٹ کر پکارتے بھی سنا: ''ہائے علم پر مہندی کہاں سے آئی'' پلک جھپکتے میں مشہور ہو گیا کہ وصی کاظم کے گھر پر مولا کا معجزہ ہوا ہے۔صغریٰ کس سے کہتیں اور کیسے کہتیں کہ کبھی نماز روزہ بھی نہ کرنے والی عورت اور ہر دم اپنا لباس، اپنے کھانے، اپنے جسم اور اپنی پسند کی خواہش کو کسی بھی طرح پورا کرتے رہنے کی جتن میں لگی رہنے والی ان کی بہو کتنی بڑی جھوٹی فریبی اور مکار ہے۔''

آج معاشرے میں دنیا داری اور مادّی آسائشوں کی خواہش نے جس طرح آدمی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے وہ عیاں ہے۔اس کے حصول کے لیے اسے مذہب کو آلۂ کار بنانے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے۔ یہ افسانہ مذہب کے نام پر ہونے والی اسی ریاکاری کی تصویر پیش کرتا ہے اور اس پر ایک کاری ضرب بھی لگاتا ہے۔اسی طرح ہمارے سماجی نظام میں رائج خود ساختہ نسل پرستی اور جھوٹی شان وشوکت پر بھی ایک طنز ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہم یہ سب دیکھتے ہوئے بھی ان کی طرف سے آنکھیں بند کیے رہتے ہیں۔اسلام میں چھوا چھوت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی طبقاتی درجہ بندی ہے بلکہ یہ مذہبی تعلیمات کا مذاق اُڑانا ہے۔عزت وبزرگی کا حصول تو کردار وعمل پر منحصر قرار دیا گیا ہے:

''وصی کاظم سید زادہ تھا۔اس کے باپ کو بھلا یہ کیسے پسند آتا کہ وہ ایک پیشہ ور دائی کی لڑکی کو اپنی بہو بنائے۔اس نے اپنے بیٹے وصی کاظم کی زندگی اجیرن کر دی۔وصی کو بھی غصہ آ گیا۔اس نے پہلے تو باپ کو سمجھایا صغریٰ دائی ہے، رنڈی نہیں ہے، جب کہ سید زادوں کے کئی گھروں میں رنڈیاں ان کی ازواج کے طور پر پل رہی تھیں۔جب وصی کاظم کا باپ اپنی ضد پر قائم رہا تو صغریٰ نے سنکھیا کھانے کی کوشش کی، مگر وصی کاظم نے اس کو بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بچا لیا اور اپنے باپ کا گھر یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ امام زمانہ کو زیارت میں یاد کر کے ختم ہو جانے والے محنت مشقت سے کمائی کرنے والی ایک دائی کو اپنے کنبے میں جگہ نہیں دے سکتے تو وہ امام غائب کے عالمی تصور کو کیسے قبول کریں گے جس میں عدل وانصاف ہوگا، احساسِ محرومی ختم ہو جائے گا اور احساسِ کمتری نابود ہو جائے گا۔''

ہندوستانی مسلمانوں پر یہاں کے ثقافتی اثرات نے اُن کی معاشرت کے ساتھ ان کی سوچ کو بھی متاثر کیا ہے۔ بہت ساری رسومات کے ساتھ مسلمانوں میں نسلی امتیاز اور مذہبی فرقہ پرستانہ تعصب اسی کی دین ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں اس کی مثال موجود ہے۔اس افسانے میں وصی کاظم کی موت کے بعد اپنی بہو اور بیٹے کی بے التفاتی سے تنگ آ کے جب صغریٰ نے مجبوراً مویشی خانے کی کوٹھری میں پناہ لی تو غم زدگی کے ساتھ تنہائی بھی ان کے لیے اذیت ناک تھی۔یہیں انہیں ایک کالا بھجنگ بلاّ ملا تھا۔صغریٰ کو فطری طور پر اس سے انسیت ہو گئی۔جانوروں کی یہ فطرت ہے کہ وہ ذرا سا التفات پا کے بہت جلد انسانی صحبت میں ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔اس اکیلے پن میں چوں کہ صغریٰ کا کوئی مونس اور غم خوار نہیں تھا جس سے وہ اپنا دکھ بانٹ سکتیں اسی لیے وہ بلاّ جب بھی آتا تو اسے وہ کھانا دیتیں اور غیر شعوری طور پر اس سے باتیں کرتیں لیکن ایک دن جب وہ بلاّ زخمی حالت میں آیا اور کراہنے لگا تو صغریٰ کو لگا کہ بلّے میں ان کے مرحوم شوہر کی روح ہے:

''ایک بار انہیں ایسا لگا کہ ان کے مرحوم شوہر وصی کاظم شیعہ سنی کی لڑائی میں اپنے بازوؤں پر لاٹھیوں کی بند چوٹوں کے درد سے جس طرح کراہا کرتے تھے، یہ بلاّ بھی ویسے ہی کراہ رہا ہے۔بلّے نے انہیں گھورتے ہوئے پھر ویسے ہی کراہنے کی آواز نکالی۔صغریٰ دل پر ہاتھ رکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے بلّے کو دیکھتی رہیں۔ کچھ دیر بعد وہ زخمی بلاّ دیوار سے نیچے اترا اور دُم اوپر اُٹھا کر ان کے پیروں کے گٹوں پر اپنا بندر گڑنے لگا۔یکا یک ان کے نتھنوں میں ایسی بو محسوس ہوئی جیسی وصی کاظم کے پسینے میں ڈوبی بنیان سے آیا کرتی تھی۔صغریٰ کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ پہلے بھی وہ اس بلّے کی موجودگی میں وصی کے پسینے کی بُو محسوس کر چکی تھیں۔''

انسان کو سماجی جانور کہا گیا ہے۔اس کی نفسیات بھی بڑی عجیب ہے۔ایک طرف وہ اپنی فطرت اور ترجیحات کی بنا پر اپنوں سے کنارہ کشی تک پر آمادہ ہو جاتا ہے تو دوسری طرف تنہائی سے خائف بھی رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کوئی ایسا بھی ہو جو اس کے دُکھ درد کا شریک بن سکے۔بلّے سے باتیں کرنا اور اس واہمے میں گرفتار ہونا کہ اس کے بدن سے وصی کاظم کے بنیان کی بُو آتی ہے اسی نفسیاتی ضرورت کی دین ہے۔اسلام میں آواگون یا دوسرے جنم کا تصور موجود نہیں ہے لیکن ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے بھی ہیں جو غیر شعوری طور پر اس نظریے سے متاثر ہیں اسی لیے صغریٰ اپنے شوہر کی روح کو اس بلّے میں محسوس

کرنے لگتی ہیں۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سی رسومات اور عقائد ایسے ہیں جن پر ان کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مضمون ''اقبال مجید کا فن'' میں شاید اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اقبال مجید کے فکشن کی ایک خصوصیت اس کی سماجیات ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے عہد، اس کے تضادات، اس کی کمزوریوں اور اس کے مطالبات بڑی شدت کے ساتھ ان کے افسانے اور ناول میں سامنے آتے ہیں۔اقبال مجید کے فکشن کا ہر استعارہ اور ہر علامت وسیع تہذیبی اور سماجی حوالے اور معنویت رکھتی ہے، جو کہانی کے کینوس کو محدود موضوعی حوالوں سے نکال کر پورے عہد پر محیط کر دیتی ہے۔''

اقبال مجید کے یہاں مذہبی اور سماجی مسائل کی علامتی انداز میں پیش کش بہت عمدہ ہے۔ کئی افسانے ہیں جو اس کی مثال بن سکتے ہیں۔ افسانہ ''چیلیں'' میں بھی انہوں نے چیلوں کو بڑی خوبی سے علامت بنا کے اپنی بات کہی ہے۔افسانے میں ایک لڑکے کی عمر کے تدریجی ارتقاء کے ساتھ وہ اس کے ذاتی تجربات اور خارجی تبدیلیوں سے ایک منظر نامہ تیار کرتے ہیں جس میں زندگی کے مختلف رنگ اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ پچاس برس کی عمر کے بعد آدمی میں شعور کی پختگی کے ساتھ ایک ٹھہراؤ سا آجاتا ہے اسی لیے آئندہ زندگی میں نئے تجربات کرنے سے خائف رہتا ہے۔عمر کے اگلے مراحل پر عقائد اور جبلتوں کے درمیان داخلی ٹکراؤ کے سبب وہ ایک انتشار کی کیفیت کا بھی شکار ہو جاتا ہے:

''جب وہ لڑکا اکیاون برس کا ہوا تو سڑک پر چلتے چلتے اس کے قدم یکا یک تیز ہو جایا کرتے کیوں کہ وہاں منڈیروں پر اکثر سیاہ اور بھیانک آنکھوں والی چیلیں اسے بیٹھی دکھائی دیتیں۔ مگر جب وہ لڑکا پچپن برس کی عمر کو پہنچا تو ایک دن پورا آسمان اسے سیاہ چیلوں سے ڈھکا ہوا نظر آیا۔اسے اطلاع ملی کہ قصائی کی دوکان سے گوشت لے کر اب لوگ محفوظ نہ نکل پاتے، ہاتھ سے مال ایک جھپٹے میں نکل جاتا ہے۔لڑکا فکر مند ہو کر اس افتاد کی معلومات کے لیے ضلع کے صدر دفتر گیا تو دفتر کے نوٹس بورڈ پر اس کو ایک مختصر سی عبارت چپکی ہوئی ملی۔ لکھا تھا: ''چیلوں سے خوف زدہ نہ ہوں۔ یہ اپنے رزق کے ساتھ ہی دنیا میں اُترتی ہیں۔''

دوسروں کی محنت کا ثمرہ موقع پرست کیسے لے اڑتے ہیں اور ہمارے اطراف لوٹ مار کا جو بازار گرم ہے وہ بالکل اسی طرح ہے جیسے چیلوں کی فطرت جھپٹا مار کے چیزیں لے اڑنا ہے۔ پریشان حال لوگ اس افتاد پر کس کی طرف دیکھیں گے۔ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے انتظامیہ کی طرف دیکھیں گے چاہے وہ مذہبی ادارے ہوں یا حکومتی مگر وہاں بجائے انہیں روکنے کی تدبیریں کرنے کے صدر دفتر پر چپکی اس عبارت ''یہ اپنے رزق کے ساتھ ہی دنیا میں اُترتی ہیں'' کو دیکھتے ہیں۔المیہ کے اس طنز کو دیکھئے کہ جن کا کام عوام کے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے، انہیں مصیبت سے نجات دلانا ہے وہ کس طرح کی تاویل پیش کرتے ہیں۔ اقبال مجید نے اس جملے کے ذریعے اپنی بات، بہت سہج انداز میں کہہ دی ہے۔

''بے شمار'' بھی اقبال مجید کے یہاں ایک خوب صورت علامتی افسانہ ہے۔اس کا مرکزی کردار ''مانو'' غیر معمولی طور پر ذہین ہے اور مانو کی یہ غیر معمولی ذہانت ہی لوگوں میں اس کی امتیازی پہچان ہے۔افسانہ نگار نے ابتدا میں ہی اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''مانو نے تعلیم کے زمانے میں ہمیشہ امتیازی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کیں۔ دوبارہ ڈبل پروموشن پا کر اس نے ایم۔اے، بڑی کم عمری میں کیا۔ گولڈ میڈل پانے پر نہ تو اس کو حیرت ہوئی اور نہ دوسروں کو۔ مانو کو جب اس کے دوست سڑک کے کنارے پُرانی کتابوں کے ڈھیر کے پاس کھڑے ہوئے پاتے تو یہ سمجھ جاتے کہ میتھ میٹکس کی کوئی کتاب اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ مزہ تو اس کے دوستوں کو تب آتا جب وہ کسی سوال کو سمجھانے کے لیے کاغذ پر لکھتے لکھتے اس کے آخری سرے تک پہنچ جاتا اور کاغذ پر جگہ نہ رہ جانے پر کاغذ کے نیچے رکھے تکیے کے سفید غلاف پر سوال کا باقی حصہ حل کرنے لگتا۔''

دراصل ہم نے سماجی نظام میں انسانی بہبود کے نام پر جو اصول وضابطے بنائے ہیں اور جو نظریات پیش کیے ہیں اس میں اچھائی اور بُرائی سیاہ وہ سفید کی صورت دِکھائی جاتی ہے۔، ہم ان کی افادیت کے قائل تو ہوتے ہیں مگر اُن پر خود عمل پیرا نہیں ہو پاتے کیوں کہ ہماری فطری کمزوریوں کے سبب اسے اس صورت میں قبول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا۔اس طرح زندگی میں تضادات پیدا ہو کر ایک ٹکراؤ کی صورت سامنے آتے ہیں۔ ہم دن رات کی اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے مفاہمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور حسبِ ضرورت سفید وسیاہ کو آمیز کر کے اپنا مطلب حاصل کر لیتے ہیں۔ مانو کی دانشوری آدمی کی اس منافقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی، اس کی یہ ذہانت ہی اس کے لیے باعثِ آزار بنتی ہے۔ اسی موضوع پر اختر الایمان کی ایک طویل نظم ہے ''رویائے صادقہ'' جس میں ایک ایسے ہی شخص کے المیے کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی جب اپنے آس پاس کی دنیا کو دیکھتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش میں جو تضادات اس کے سامنے آتے ہیں وہ اسے پریشان کرتے ہیں۔اس کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

خلا میں گھورتا رہتا تھا وہ بیٹھا ہوا تنہا
لڑکپن ہی سے اس کو سوچتے رہنے کا سودا تھا
زمانے بھر کی باتیں، وسوسے اس کو ستاتے تھے
ہزاروں طرح کے الجھے خیالات آتے رہتے تھے
وہ سیارے جو لاکھوں میل کی دوری پہ ہیں ہم سے
وہاں آباد ہے کوئی کہ یوں ہی خاک اُڑتی ہے

....

یہ مانا فرقِ این و آں بڑی حد تک شعوری ہے
گنہ کیا نیکیوں کی کھاد ہے، کرنا ضروری ہے
ملا کیا آدمی کو بھید بھاؤ اور دوری سے
خدا جب ایک ہے تو اتنے مذہب کیوں ضروری تھے

وہ اکثر سوچتا تھا جب یہ دنیا ایک میلہ ہے
تو انساں برسرِ پیکار ہیں کیوں کیا جھمیلا ہے
یہ سارے فلسفے، دستور، دنیا کے طریقے سب
بدل جاتے ہیں، بہہ جاتے ہیں لمحوں کی روانی میں
نہ جانے کتنے موڑ آتے ہیں چھوٹی سی کہانی میں
یہ خیرو شر کا تانا بانا، یہ آواگون، محشر
خدا جب قادرِ مطلق ہے پھر کیسا ہے یہ چکّر
نہ جانے اور کیا کیا کچھ پریشانی کا باعث تھا
وہ لاکھوں الجھنوں کا صرف تنہا ایک وارث تھا

یہ سارے سوالات آدمی کے عقائد اور مفروضات پر قائم ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور اس کے یقین کو مجروح کرتے ہیں۔ مانو کی تیسری آنکھ بھی اسے وہ سب دِکھاتی جو دوسروں کو نظر نہیں آتا۔ وہ جو پیشنگوئیاں کرتا ہے سب صحیح ثابت ہوتی ہیں لوگ خوش ہیں، لیکن اسی کے ساتھ لوگوں کی مفاد پرستی اور منافقت اسے پریشان کرتی ہے اور دوسروں کے تئیں اس کا یقین مسلسل ٹوٹتا رہتا ہے۔ اسے جب ماہرِ نفسیات کے پاس علاج کی غرض سے لے جاتے ہیں تو اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس کا علاج کرے وہ خود اس کی نفسیاتی کمزوری پر انگلی رکھ دیتا ہے۔

ڈاکٹر کو ریس کھیلنے کا شوق ہے۔ مانو اسے جو گھوڑا تجویز کرتا ہے وہ ریس جیت جاتا ہے۔ یہاں سے انسانی لالچ، ہوس اور خود غرضی کا کھیل شروع ہوتا ہے۔ اقبال مجید کا طنز افسانے میں یہاں اپنی پوری سفاکیت کے ساتھ نظر آتا ہے۔

''جب مانو کا میڈیکل چیک اَپ ہوا تو ذہنی مریضوں کے ماہر کافی دنوں تک اسے ایک سے دوسرے کی جانب اُچھالتے رہے۔۔۔ وہ ذہنی امراض کے ماہرین سے ایسی باتیں کرتا اور ایسے موضوعات پر باتیں کرتا کہ ان کے ہوش اڑ جاتے۔''

مانو کی یہی ذہانت اور دانشوری اسے ہمیشہ ایک داخلی اضطراب اور خود سے نبرد آزمائی میں مبتلا رکھتی ہے۔ عام آدمی کے مقابلے میں اس کا above Normal ہونا ہی دوسروں کی نگاہ میں اسے abnormal بنا دیتا ہے۔ ایک طرف دنیا کی بے ثباتی اور اس کے فانی ہونے کا احساس اور دوسری طرف لوگوں میں اس کی ہوس، اس کے حصول کے لیے کسی بھی حد سے گزر جانے میں کوئی تامل نہیں اس کا ادراک۔ وہ کچھ عرصے بعد اپنے ہر ٹوٹے ہوئے یقین کو ایک ڈائری میں لکھنا شروع کرتا ہے اور یہ سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے۔ یہیں سے زندگی اس کے لیے عذابِ جاں بننا شروع ہوتی ہے۔ آخر میں جب وہ ان کا شمار کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ افسانہ ''بے شمار'' کا موضوع آدمی کا یہی المیہ ہے۔

حق اور ناحق کی لڑائی بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آدمی ہی جب آدمی کو اپنے مفادات کی خاطر نشانہ بناتا ہے اور اس کے درپے ہوتا ہے تو سچ کے معنی بدل جاتے ہیں۔ ایک ہی صورتِ حال دو الگ پس منظر میں الگ معنی دیتی ہے۔ حکومت کے مظالم اور غیر منصفانہ رویوں کے خلاف جدوجہد ایک کی نگاہ میں بغاوت اور قابلِ سرزنش جرم ہوتا ہے جب کہ دوسری طرف عوام کے حقوق اور ان کے مسائل کے لیے آواز اُٹھانا انقلاب ہے، جہاد ہے۔ دولت اور اقتدار کے نشے میں جو صاحبِ اقتدار یا بارسوخ ہے وہ جو چاہے کر لے بے گنا ہے، وہ جو کرے ہو حق ہے اور جو مظلوم ہے وہ مظلوم ہو کر بھی گنہ گار ہے۔ اس کی کوئی فریاد، کوئی سنوائی نہیں ہے۔ اس کی حمایت میں اگر کوئی آواز اٹھائے تو مانو وہ بے وقوف ہے کیوں کہ system پھر اس کے خلاف ہو جاتا ہے۔ سچ کی یہ دو تعبیریں صدیوں سے یوں ہی چلی آ رہی ہیں۔ ''ہم گریہ سر کریں گے'' میں اقبال مجید نے اسی موضوع سے بحث کی ہے۔ افسانے میں دو کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں اور ایک دوسرے کو inter support کرتی ہیں جس سے افسانے کی اثر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔

اسی طرح فسادات اور خون خرابے بھی اسی انسانی جبلت کی تشریح کرتے ہیں جس میں وہ اپنے احساسِ برتری کی تسکین کا سامان تلاش کرتا ہے، اپنی اقتدار کی ہوس پوری کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ اس زمین پر جہاں وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا دعوے دار ہے وہیں اس زمین کا سب سے خوں خوار جانور بننے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اس کی سفاکی اور بربریت کی مثال چنگیز خان اور ہلاکو تک محدود نہیں بلکہ وقت آنے پر وہ ہمیں اپنے درمیان بھی مل جاتے ہیں۔ فسادات کی رودادیں اس کی ننگی تصویریں ہیں جس میں انسان ہی انسان سے سب سے زیادہ خوف زدہ نظر آتا ہے۔ اس موضوع پر اردو میں سعادت حسن منٹو سے لے کر ساجد رشید تک کئی افسانہ نگاروں نے بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ فسادات اور اُس کی بربریت کے موضوع پر اقبال مجید کے یہاں بھی ایک اثر آفریں افسانہ ''سوختہ ساماں'' ہے۔

'' کہتے ہیں سناٹا ایک عجیب سی پُر اسرار زبان بولتا ہے۔ اس کا اصل سبب تو نہیں پتہ، شاید اس کی زبان میں اس لیے طاقت ہوتی ہے کہ دوسروں کو چپ کرا کے اکیلے بولتا ہے۔ بہر حال سناٹا پورے دن ایک ایسی زبان بولتا رہا جس کا اپنی اپنی زبان میں لوگ خاموشی سے ترجمہ کر کے اپنی اپنی جگہ پر مفہوم سمجھتے رہے۔''

اچانک پھوٹ پڑنے والے فساد سے جو ایک خوف اور دہشت کا ماحول پیدا ہوتا ہے اس میں خوف سے طاری ہونے والی خاموشی ایک ایسے سناٹے کو جنم دیتی ہے جو بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور جس میں کم سے کم الفاظ بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اندیشوں اور امکانات کے بھنور میں پھنسے ہوئے آدمی کی ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ اقبال مجید نے اس افسانے میں اُس ماحول کو پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فساد تھمنے کے بعد جب افسانے کے کردار میاں بیوی اپنے گھر واپس آتے ہیں تو گھر کی حالت کا منظر ملاحظہ ہو:

''مسہری اور ٹی وی وغیرہ تو شاید اسی وقت جل کر راکھ ہو گئے تھے جس وقت انہوں نے دروازے پر تالا لگا کر گھر چھوڑا تھا۔ بیوی اب تک الماری

کے لاکر کا جائزہ لے کر خوش ہو چکی تھی، اس نے اپنی خوشی میں شوہر کو شامل کرنا چاہا۔

''ہر چیز اپنی جگہ پر ہے، یہ تو معجزہ ہو گیا''

پھر بیوی نے تازی ہوا اور روشنی کے لیے کھڑکی کھولی اور بستر جھاڑ کر مسہری پر دراز ہوئی۔ شوہر کھلی کھڑی کے پاس گیا ایک ہاتھ سے کھڑکی کی لوہے کی سلاخ پکڑی اور باہر کی طرف جھانکا، سلاخ پر سے ہاتھ ہٹایا تو دیکھا کسی دیمک لگی کھوکھلی لکڑی کی طرح سلاخ پر انگلیوں کی گرفت والا حصہ ٹوٹ کر ان کی مٹھی میں آ گیا تھا۔ بیوی نے ایک بار پھر بستر پر کروٹ لیتے ہوئے گھر کی ایک ایک چیز اپنی جگہ پر موجود ہونے کی اس حیرت انگیز انہونی پر خوشی کا اظہار کیا تو شوہر کو بھی مکان کے جلے ہوئے فرش پر ہر چیز اپنی جگہ پر دکھائی دینے لگی مگر ہر چیز جہاں تھی وہاں جل چکی تھی اور ان کے جلے ہوئے ڈھانچے ہی قائم رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ دیوار پر لگی گھڑی کچھ اس طرح جل چکی تھی کہ اس کی جلی ہوئی پرچھائیں دیوار پر چپک کر رہ گئی تھی۔''

فساد کے ساتھ آتش زنی کی وارداتیں بھی عام سی بات ہیں۔ اقبال مجید نے اس منظر میں جہاں ایک طرف یہ دکھایا ہے کہ کھڑکی کی لوہے کی سلاخ آتش زنی کے بعد دیمک زدہ کھوکھلی لکڑی کی طرح ان کے ہاتھ میں آ گئی اور ''مسہری اور ٹی وی وغیرہ تو شاید اسی وقت جل کر راکھ ہو گئے تھے جس وقت انہوں نے دروازے پر تالا لگا کر گھر چھوڑا تھا'' لیکن بیوی کا اسی مسہری کا بستر جھاڑ کر اس پر دراز ہونا اور کروٹیں لینا بظاہر یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن اس کا ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ عورت اس بھیانک منظر کو دیکھ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتی ہے اور اسے ساری چیزیں اپنی جگہ پر اصل حالت میں نظر آنے لگتی ہیں۔ اسی لیے وہ خوش ہو کر اپنے شوہر کو ہر چیز دکھانے لگتی ہے۔ فساد کے بعد کی یہ صورتِ حال بڑی اذیت ناک ہوتی ہے اور جس پر گزرتی ہے بس وہی جانتا ہے، دوسرے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بابری مسجد کے انہدام کے بعد بھوٹ پڑنے والے فسادات کے زمانے میں میرے ایک کالج کے ساتھی لیکچرر جو بمبئی کی ورلی چال کے علاقے میں رہتے تھے، حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی وہاں سے راتوں رات گھر پر تالا لگا کر نکل گئے تھے۔ حالات بہت دہشت ناک ہو چکے تھے۔ ان کے وہاں سے ہٹنے کے بعد فسادات نے خاصی شدت اختیار کر لی تھی۔ چند دنوں بعد جب کرفیو ہٹا اور ماحول بظاہر پُرسکون ہوا تو ان کے ساتھ ہم دو تین لوگ ان کے ورلی چال والے مکان پر پہنچے۔ وہاں کا منظر دیکھ کر دماغ میں ایک سناٹا گونجتا سنائی دیا۔ ان کے گھر کا دروازہ غائب تھا اور اس کے ساتھ ہی سارا سامان بھی۔ گھر کی جگہ صرف دیواریں کھڑی تھیں۔ جگہ جگہ جلنے اور توڑ پھوڑ کے نشانات بھی تھے۔ میرے ساتھی جن کا گھر تھا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ فسادات تو رُک گئے تھے مگر ماحول میں ایک تناؤ کی کیفیت باقی تھی۔ فسادات تھمنے کے بعد انہوں نے مسلم علاقے میں ایک کرایے کا گھر لیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد ایک عرصے تک ان کی دماغی حالت ایسی تھی کہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔

مذہب، انسانیت ان سب پر سے جیسے ان کا یقین اُٹھ چکا تھا۔ ان کے اندر ایک عجیب قسم کی نفرت انگیز خونخواریت پیدا ہو چکی تھی۔ حالاں کہ فسادات کا وہ دور ہم پر سے بھی گزرا تھا، ایک زبردست خوف ہم پر بھی ایک عرصے تک طاری رہا مگر جب وہ اپنی اس کیفیت کے ساتھ یاد آتے ہیں تو جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ اپنی بے بسی کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے۔ دراصل دھیرے دھیرے ہمارے اطراف ایک ایسا ماحول تعمیر ہو چکا ہے جس میں ہمارے اختیار میں کچھ بھی نہیں بچا ہے اور جس کے اندر جینا ہماری مجبوری ہے۔ ان سب حالات سے واقفیت کے باوجود ہم کتنے بے بس ہیں، لاچار ہیں۔ اقبال مجید کو اس پر غصہ ہے۔ انہوں نے انسان کی اس بے بسی کا اظہار اپنے ایک افسانے ''ایک حلفیہ بیان'' میں مختلف قسمیں کھاتے ہوئے اس صورتِ حال کو اس طرح علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے:

''اس کے بعد ایک عجیب بات ہوئی۔

کیا بات ہوئی؟ آپ سوال ضرور کریں گے۔

اگر مَیں چاہوں تو آپ کے اس سوال کو پسِ پشت ڈال کر آپ کو بہت دیر تک دیگر معاملات میں اُلجھا سکتا ہوں کیوں کہ اب مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کی دلچسپی اس کیڑے میں کچھ بڑھ گئی کیوں کہ اس طرح کے کیڑے آپ نے بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو ایک بار پیٹھ کے بل اُلٹ جائیں تو پھر سیدھے نہیں ہو پاتے۔''

یہ افسانہ ایک بھاری کیڑے کے زمین پر پیٹھ کے بل گر کر سیدھے ہونے کی جدوجہد کی کہانی نہیں ہے جو اپنے آپ کو سیدھا کرنے کی تگ و دو میں اپنے ننھے ننھے پیر فضا میں مسلسل چلائے جا رہا ہے۔ بلکہ یہ ایک استعارہ ہے کہ زندگی میں ہماری کیفیت بھی کچھ اسی کیڑے جیسی ہی ہے۔ ہم جن حالات میں جیتے ہیں ان کی اذیت ناکی سے باہر نکلنے کے لیے اسی کیڑے کی طرح بے بسی سے ہاتھ پیر مارتے رہتے ہیں۔ علامت اور استعاروں کی مدد سے وہ اپنی بات بڑی فنکاری سے کہتے ہیں۔ ان کے حالیہ دو افسانے ''اوزاروں کا بکس'' اور ''حنوط کی ہوئی تلوار'' اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

احتجاج کی ایک دبی دبی لہر تو اُن کے تقریباً ہر افسانے میں موجود ہے۔ چاہے وہ سماجی مسائل کی نشاندہی کرتا ہو، چاہے انسانی نفسیات کو موضوع بنا کے لکھا گیا ہو چاہے سیاسی موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہو۔ ہمارے سیاسی نظام میں جبر و تشدد کے ساتھ خود غرضی اور سفاکی نے جس طرح اپنے لیے مضبوط جگہ بنا لی ہے وہ یقیناً افسوس ناک ہے۔ بے حسی کی دیمک اندر ہی اندر ساری اقدار کو کھوکھلا کرتی جا رہی ہیں۔ افسانہ ''دیوار پر جڑی تختیاں'' میں علامات کے ذریعے اقبال مجید کی نگاہیں ان حقائق کی تہہ تک پہنچ کر اس کا تجزیہ کرتی ہیں۔ یہ پورا افسانہ ہمارے سیاسی نظام کا آئینہ دار ہے۔ اس افسانے کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''وہاں قیام کے آخری دن تک وہ ناقابلِ یقین مماثلت بھی مجھ پر واضح ہو گئی کہ ان عمارتوں میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ، ان کی آنکھوں کے

چشمے، ان کے پہناوے، بات کرنے اور سگریٹ کا گُل جھاڑنے کا انداز اور کمرے میں آ کر دلیل کے بغیر دعوے کرنے والے پیغمبروں کی لن ترانیوں اور آمدورفت کے باعث بار بار کمرے کی لال بتی کا جلنا بجھنا اور آخر کار فیوز ہو جایا کرنا اور پھر تمام ردّیوں کی ٹوکریوں میں پھینکا ہوا سامان نازیبا، وہاں کے بہ ظاہر مہربان مگر درحقیقت ہلاکت خیز منافق سب ایک سے تھے ویسے ہی جیسے میری عمارت کے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ ان سب کا لہجہ، غیبت کا طریقہ، زبان کی موقع پرست لکنت بھی ایک سی تھی اور یہی نہیں کونے کھدروں میں چھپے ہونٹوں پر ایک سی مسکراہٹ جمائے رکھنے والے دھیمی آواز میں بولنے والے کرتے، شیروانی اور واسکٹ کو گلے تک بند رکھنے والے مہذب دلال بھی بالکل ایک سے تھے۔''

شہر کی بلدیہ سے لے کر پارلیمنٹ ہاؤس کے ممبران تک ہمارے نام نہاد لیڈروں کی اکثریت تقریباً ایک جیسی ہے۔ ان کا مکرومنافقت اور موقع پرستی سب ایک جیسے ہیں۔ الیکشن کے زمانے میں عوامی جلسوں میں ان کی فلاح و بہبود کے منصوبوں کا اعلان اور ان کی تکمیل اور افادیت کے جو دعوے یہ عوام سے کرتے ہیں، الیکشن کے بعد وہ مستقبل کی کھونٹی پر ٹانگ دیے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے مفاد پرست مہذب دلال بھی ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ یکسانیت کیس حد تک معاشرے کی بے حسی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ ان کی ظاہری وضع قطع اور اندازِ گفتگو سے اقبال مجید نے ان کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ پھر عوامی رائے کو استوار کرنے کے لیے کس طرح منصوبہ بند طریقوں سے حکمتِ عملی تیار کی جاتی ہے اس پر بھی انہوں نے بھرپور طنز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''میَں جانتی ہوں کہ Openion Mafia کیسے بنتی ہے اور کس طرح کام کرتی ہے۔'' شاید وہ خود سے کہہ رہی تھیں:

''جو دانش ور آپ کے مقتدر سے اس کے وفادار رہتے ہیں، وہ خراج کے طور پر انہیں وفاداروں کو اپنی مرضی کے فیصلے کروانے کے لیے نامزد کرتا ہے۔ ان وفاداروں کو لگاتار اپنی پناہ میں رکھا جاتا ہے۔'' پھر اس نے اپنی ناول کی ایک جلد میری طرف بڑھائی۔

''اسے پڑھیے۔ جمہوریت کے ضابطے کو دست پناہ بنانے کا کھیل کیسے کھیلا جاتا ہے۔ پھر اقتدار والے کی چھپتی خود مرکزیت کے نازک ہاتھوں کو یہ دست پناہ انگاروں سے جلنے سے کیسے بچاتا ہے۔''

لفظ سیاست نے اصطلاحی سطح پر جس معنی کا تعین کر لیا ہے وہ سیاست دانوں کی عیاری اور سفّاکی کا کماحقہٗ احاطہ کرتا ہے۔ معاشرتی زندگی کا احوال یہ ہے کہ عوام ہمیشہ کسی نہ کسی طور پر پریشان رہتے ہیں اور اس سے نجات چاہتے ہیں لیکن سیاست میں اپنے اقتدار کی بقا کے لیے جو حکمتِ عملی تیار کی جاتی ہے اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ عوام کبھی سکون کا سانس نہ لے سکیں اور مذہب و معیشت کی مدد سے اس طرح نئے مسائل پیدا کیے جائیں کہ وہ پریشان ہی رہیں۔ ساتھ ہی ان میں عدم تحفظ کا احساس بھی ہمیشہ زندہ رہے۔

''آپ نے ہماری عمارت کے بڑے کمرے میں جا کر کیا پھر کبھی ان سے ملاقات کی؟''

''ہاں کی تھی'' وہ بولیں۔ ''انہیں یاد دلایا تھا کہ وہ اپنی اجارہ داری کے لیے Despotic Rule کو کتنا بڑھاوا اور دیں گے؟ کیا ان کے عمل سے لوگوں میں اعتماد کے بجائے عدم تحفظ نہیں بڑھ رہا ہے۔''

''وہ کیا بولے؟'' میرے اس سوال پر پہلے تو وہ خاموش رہیں پھر کہنے لگیں:

''میری بات پر انہوں نے مجھ سے اُلٹا سوال کر لیا۔ پوچھا یہ بتایئے عام لوگوں کو تحفظ دینے میں اسٹیٹ اپنی ذمہ داری کتنی نبھاتی ہے۔ ہمیں بدقماشوں سے بچانے میں کیا وہ کامیاب ہوئی ہے۔ وہ افلاس کی گود میں جرائم پیشہ لوگ تیار کرتی ہے۔ وہ لوٹ مار کرتے ہیں تو جیلوں میں بند کرتی ہے'' پھر انہوں نے اپنے لہجے میں شہد گھولتے ہوئے کہا تھا:

''یہ تو آپ دیکھتی ہوں گی کہ ریاست اپنی غیر منصفانہ اجارہ داریوں کو خود ہی انتہائی مضبوط تحفظ مہیا کرتی ہے۔ جو ریاست اجارے داریوں کی حفاظت کرتی ہو وہ ان اجارہ داریوں کو ختم کس لیے کرے گی؟''

اس افسوس ناک صورتِ حال پر نوحہ پڑھنے کے ساتھ وہ سیاسی حلقے کے باہر بھی آدمی کے خودغرضانہ رویے کی جس طرح تصویر کشی کرتے ہیں وہ بھی کم عبرت ناک نہیں ہے۔ آدمی مادّیت کے دام میں گرفتار ہو کے جس سفاکانہ خودغرضی کا مظاہرہ کرتا ہے اور انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کے اپنی مطلب براری کے لیے راہ استوار کرتا ہے اس پر افسانہ ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

''انسان Genetically اور Neurologically ازل سے ہی ناقص پیدا ہوا ہے، اس لیے اس سماج میں شیکسپیئر ہمیشہ پیدا ہوں گے اور ٹریجڈی لکھی جاتی رہے گی۔ پھر پروڈیوسر نے بات آگے بڑھائی۔ ''جب سے دنیا بنی آپ دیکھ رہے ہیں کہ اِدھر کچھ ٹھیک ہوتا ہے تو اُدھر کچھ بگڑ جاتا ہے، اِدھر کوئی ہنستا ہے تو اُدھر کوئی رونے لگتا ہے۔ ہمیں ان چکروں میں نہیں پڑنا، سب کما رہے ہیں، جیبیں بھر رہے ہیں ہمیں بھی بھرنا ہے۔''

اقبال مجید نے کس جھنجھلاہٹ سے کہا ہے کہ ''اس سماج میں شیکسپیئر ہمیشہ پیدا ہوں گے اور ٹریجڈی لکھی جاتی رہے گی'' حقیقت یہی ہے کہ انسان کا استحصال انسان کے ہاتھوں صدیوں کی روایت ہے۔ ہم اس الیے کا سبب بھی بنیں گے اور اس پر ماتم کناں بھی رہیں گے۔ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ ازل سے ہی آدمی ناقص پیدا ہوا ہے اور اپنی نفسیاتی کمزوریوں کے ہاتھوں وہ بے بس ہے، اگر بات صرف اتنی سی ہوتی تو شاید مسئلہ نہ بنتی مگر جس طرح آدمی کی اس کمزوری کا خود آدمی ہی بڑی بے رحمی سے آج فائدہ اٹھانے لگا ہے۔ استحصال کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا ہے اور اس کی تاویلیں بھی پیش کرتا ہے، یہ بات

تشویش ناک ہے۔

آزادی کی لڑائی کے دوران ہمارے عوام اور لیڈروں کا ایک ہی مقصد تھا انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنا۔''ملک کو آزاد کرنا'' اس جدوجہد میں چھوٹے بڑے سب اپنی بساط بھر لگے ہوئے تھے بلکہ جس سے جو ہو سکا اس نے اس مقصد کے حصول کے لیے کیا۔کیسی کیسی قربانیاں دیں اور بالآخر ہم اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔افسانہ''پیاسے رہنے والے'' میں اقبال مجید نے اسی کو موضوع بنایا ہے۔

''میرے باپ بتاتے تھے کہ بستی سے ایک بار مہاتما گاندھی کا گزر ہوا تو وہ پیارے میاں کی چوکھٹ پر کچھ دیر کے وہیں بملا دیوی نے اپنا ایک ایک زیور اور صندوقچے میں پس انداز کی گئی ساری نقدی مہاتما کے حوالے کر دی تھی۔سنا ہے گاندھی جی نے کہا تھا:

''بیٹی تم نے تو سب کچھ مجھے دے دیا۔''

''آپ کو نہیں دیا ہے بملا نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا:''یہ تو مَیں اپنے بچوں کے بھوشے کو دے رہی ہوں۔اُن امیدوں کو دے رہی ہوں جو آپ کے اور میرے سپنے بن چکی ہیں۔''

آزادی کا تصور اس وقت اتنا نشاط آگیں تھا کہ ہر ایک اس میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ایسا گمان تھا کہ بس آزادی کے ملتے ہی سب کچھ بدل جائے گا۔ اس وقت لوگوں کی اکثریت ایسی تھی کہ ان کے پاس جو کچھ تھا اُسے اس جدوجہد پر نثار کرنے میں انہیں کوئی تامل نہ تھا۔ان خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا ایک جوش تھا، ایک جنون تھا جس میں لوگوں نے اپنی جان تک کی پرواہ نہ کی۔یہ اقتباس لاحظہ کیجیے:

''ایک سال گرمی بہت پڑی، لُو کی تمازت سے مویشی مرنے لگے، دُلارے میاں بھی لُو کی چپیٹ میں آ گئے۔پیاس کی شدت نے انہیں ہلکان کر دیا تھا۔ان کی بیماری کی خبر سن کر ایک جٹا دھاری جوگی ان کے سرہانے پہنچ گیا۔ کندھے پر لٹکے جھولے سے کسی پودے کی ایک ہری پتّی نکال کر دُلارے میاں کو آواز دی:

''مہاراج'' دُلارے میاں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔جوگی نے پتّی ان کی طرف بڑھائی۔

''اسے زبان پر رکھ لیں۔پیاس مٹے گی کلیجہ تر ہوگا۔'' دُلارے میاں نے اشارے سے منع کر دیا تو جوگی نے سمجھایا:

''مہاراج بڑی کراماتی بوٹی ہے'' دُلارے میاں نے پھر آنکھیں کھولیں تو جوگی بولا:

''''اس کے پودے کو آدی واسی کنواری کنیائیں اُگاتی ہیں۔وہ سارا دن خود پیاسی رہ کر منہ سے بوند بوند پانی ٹپکا کر اسے سینچتی ہیں۔سادھارن طریقے سے سینچنے پر وہ پودا سوکھ جایا کرتا ہے، یہ بوٹا دُرلبھ ہے مشکل سے اُگتا ہے۔'' دُلارے میاں نے تب بھی وہ پتّی زبان پر نہ رکھی تو جوگی نے پوچھا:''کیا آپ اپنی پیاس بجھانا نہیں چاہتے۔''

''چاہتا ہوں'' انہوں نے جواب دیا۔''مگر میری پیاس ایک لمبی لڑائی کا نام ہے۔ہر پیاس کراماتی پتّی سے نہیں بجھائی جا سکتی۔''

انگریزوں کے استبداد کے ہاتھوں ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے جس میں ہمارا دن رات کسی نہ کسی طرح استحصال ہوتا رہتا تھا۔عزتِ نفس پر بن آئی تھی۔آزادی ہم دراصل اس صورتِ حال سے چاہتے تھے جس میں زندگی کرنا دوبھر ہو چکا تھا۔آزادی مل گئی مگر کیا وہ حالات بدلے؟استحصال تو آج بھی جاری ہے۔صرف کرنے والے بدل گئے ہیں۔پہلے انگریز تھے اب ہمارے اپنے ہیں۔ اس افسانے میں ترقی پسند افسانے کی طرح خوش آئند مستقبل کا خواب اور رجائیت نہیں ہے بلکہ ان خوابوں کی شکستگی کا کرب ہے۔اسی لیے دُلارے میاں کہتے ہیں''میری پیاس ایک لمبی لڑائی کا نام ہے۔''

ترقی پسند تحریک کا خاص مقصد غریبوں اور مزدوروں کے استحصال کے خلاف آواز اٹھانا اور ان کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔ترقی پسند ادب کا موضوع بھی کم وبیش یہی رہا اور یقیناً اس پر بہت اچھے افسانے لکھے گئے۔ایک اکیلے کرشن چندر کے یہاں''کالو بھنگی''،''بھومی دان''،''آخری بس'' اور''مہا لکشمی کا پُل'' جیسے شاہکار افسانے اس موضوع پر ملتے ہیں۔اقبال مجید کے یہاں ''ایک سگریٹ لائٹر کی کہانی'' ترقی پسندوں کے پسندیدہ موضوع پر ایک بہت اچھا اور دل کو چھو لینے والا افسانہ ہے۔دامودر کے ٹی اسٹال میں کام کرنے والا لڑکا سدھیر جب گاہکوں کو ان کی طلب پر ماچس انہیں دیتا تو اکثر واپس کرنا بھول جاتا یا پھر جب وہ دوسرے گاہکوں کو چائے Serve کر رہا ہوتا تو لوگ اسے لے کر چلے جاتے اور مالک دامودر کا غصہ سدھیر پر اُترتا۔ایک دن غصے میں وہ سدھیر کو اس کی جو سزا دیتا ہے وہ اقبال مجید کی زبانی ملاحظہ ہو:

''اس نے مارے طیش کے کھولتی ہوئی چائے میں پڑی پیتل کی کھرچنی جس سے وہ لگاتار کھولتی ہوئی چائے چلاتا رہتا تھا کہ پینیدے میں چائے نہ لگ جائے اُٹھائی اور جلتی ہوئی کھرچنی میرے ہاتھ پر زور سے ماری۔اس سے میری داہنی کلائی اتنی گہری جل گئی کہ میں کئی روز تک اس کی جلن میں تڑپا اور پھر ہمیشہ کے لیے وہاں ایک داغ بن گیا۔''

سدھیر وہاں سے کام چھوڑ کر ایک فلم اسٹوڈیو کی کینٹین میں ملازمت کر لیتا ہے۔جہاں ایک روز ایک سوپر اسٹار اس کی کینٹین میں آتا ہے اور اس سے ماچس مانگتا ہے اور لے کر چلا جاتا ہے۔دوسرے دن اتفاقاً جب وہ دوبارہ آتا ہے تو سدھیر اس سے ماچس واپس مانگتا ہے لیکن جب اسے اپنے جیب میں وہ ماچس نہیں ملتی تو سدھیر اپنی کلائی کا داغ دکھا کر اس کی حقیقت بتاتا ہے۔سوپر اسٹار بدلے میں اپنا سونے کا سگریٹ لائٹر اُسے دیتا ہے لیکن وہ لینے سے انکار کرتا ہے تو وہ سوپر اسٹار اسے اپنی کہانی سناتے ہوئے اپنی جلی ہوئی انگلیاں دِکھا کے کہتا ہے:

باقی صفحہ ۲۱ پر ملاحظہ کیجیے

قصّہ رنگِ شکستہ

سیّد خالد قادری
(ممبئی، بھارت)

برسوں پہلے غالباً ستر کے دہے میں میرے بزرگ دوست اور معروف افسانہ نگار عوض سعید کے توسط سے میں غائبانہ طور پر اقبال مجید سے ان کی کہانی ''دو بھیگے ہوئے لوگ'' کے حوالے سے متعارف ہوا تھا۔ اُن دنوں جو نام اردو میں نئی نسل کے فکشن نگاروں کی حیثیت سے اعتبار حاصل کر چکے تھے ان میں بلراج مین را، انور سجاد، احمد ہمیش، سریندر پرکاش، جوگندر پال، اقبال مجید، نیّر مسعود اور غیاث احمد گدی وغیرہ تھے۔ بعد کے عرصے میں بھی میں اقبال مجید کو شخصی طور پر زیادہ نہ جان سکا مگر ایک ادیب کی حیثیت سے جب بھی خود ان کی تحریروں کی روشنی میں انہیں دیکھنے کی کوشش کی تو ایسا لگا کہ جیسے ایک وجودی فکر کے صاف گو، کھرے اور حقیقت پسند مگر کسی حد تک Self Consious انسان کے خول سے ان کے افسانہ نگار کا چہرہ باہر جھانک رہا ہے۔ یہ چہرہ متوسط طبقے کے عام آدمی کی کہانی لکھنے والے ادیب کا ہے جو بیک وقت اُسے اُس کی زندگی کی تمام تر معمول زدگی، بوالعجبی اور تضادات کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں معاشرے کے مقابلے میں افراد کو اہمیت دیتا ہے اور ان کی اُس ذہنی وجذباتی کشمکش کی پُر اثر تصویر کشی کرتا ہے جو معاشرے کے جبر سے آزادی کے حصول کے لیے کی جانے والی جدوجہد کے سلسلے میں ناگزیر ہے۔ اس کے یہاں فطرت کی عکاسی عموماً جزئیات نگاری کے طور پر ملتی ہے جب کہ حیاتِ انسانی کی کشمکش، انسان کا انفرادی عمل، ارادے کی آزادی، اخلاقی ذمہ داری اور شخصی نقطۂ نظر بیانیہ کا غالب حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ سیاسی، سماجی یا مذہبی ڈسکورس سے سیدھے سیدھے معاملہ نہیں کرتا بلکہ ایک بالغ نظر اور اپنے منصب سے پوری طرح آگاہ مصنف کے طور پر اُسے پس منظر میں رکھ کر ایک ایسی Strategy وضع کرتا کہ جس کے تحت ایک تمام تعصبات ومحرکات یا ترجیحات وترغیبات جوان سے متعلق ہیں اور اس کے کرداروں پر اثر انداز ہوتے ہیں، ان کے افعال یا ردِعمل کے فطری جواز بن کر سامنے آئیں۔ یہ افسانہ نگار محض تجریدی خیالات، محسوسات وکیفیات پر ہی افسانے کی بنیاد نہیں رکھتا بلکہ اپنے عصر کے مسائل اور زمانے کی انسانی صورتِ حال کو اپنی فکر مندیوں سے جوڑ کر ایک پوری افسانوی دنیا تخلیق کرتا ہے۔ اس کا اسلوبِ اظہار علامتی، استعاراتی اور کبھی کبھی تمثیلی ہے مگر ہیئت یا فارم پر اس قدر فوکس بھی نہیں کہ آخر میں کہانی میں مفقود ہو کر رہ جائے۔

اِدھر اقبال مجید کے سوانحی حالات سے مزید واقفیت ہونے پر پتا چلا کہ انہوں نے اپنا زیادہ تر تخلیقی سفر ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیانی عرصے میں پورا کیا جو ادبی رجحانات کے اعتبار سے ایک عبوری دور تھا۔ اس میں جدیدیت ترقی پسندی کی جگہ لے رہی تھی اور انہیں ایک اُبھرتے ہوئے افسانہ نگار کے طور پر اس صورت حال سے Negotiate کرنا تھا۔ اپنی انفرادیت پسندی کے باعث ترقی پسندوں سے فاصلہ اختیار کر لینے میں تو انہیں زیادہ دیر نہ لگی مگر جدیدیت کو بھی وہ بلاشرط قبول کرنے پر تیار نہ تھے، پھر بھی اگر یہاں ان کی تحریروں کو ہی رہنما بنا کر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدیدیت کے ہی پالے میں کھڑے رہے، گو کہ اپنی خود حفاظتی کے شدید احساس نے انہیں اس میں بھی اتنا آگے تک نہ جانے دیا کہ راستہ بھٹک جانے کا خطرہ درپیش ہو۔ اس سلسلے میں خود ان کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

''اختر حسین رائے پوری کی ترقی پسندی کا ٹھرّا، یعنی کچی شراب کبھی میرے حلق سے نہ اُتری کہ اس میں میرے ذوقِ سلیم سے زیادہ میرے فطری مزاج کو دخل ہے۔ جدیدیت نے جب اپنی دکان لگائی تو اُس خُم خانے سے اُٹھی ٹھرّے کی بُو جس میں تیزی اور شدت اور انتہا پسندی کی بُو بہت تھی، اس نے بھی میرے ذہن کو پراگندہ کیا۔۔۔ جو چیز میرے لیے پریشان کُن تھی وہ فکشن کی پھوہڑ، جاہلانہ اور اندھی توڑ پھوڑ اور لوٹ کھسوٹ تھی، جو کوئی فاتح فوج مفتوح شہر اور اس کی رعایا سے کرتی ہے۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر ادیب اپنی حفاظت خود کرتا ہے جب وہ لکھتا ہے یا لکھنے والوں میں اپنا نام زندہ رکھنا چاہتا ہے۔''

(میرا تخلیقی سفر۔ ''میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں'')

چنانچہ کسی مخصوص ادبی تحریک سے مکمل طور پر وابستہ نہ ہو کر وہ اپنے افسانوں میں بقول خود ان کے ''محبت کی استواری، انسان کے زندہ رہنے کی لافانی تمنا، سماج میں توازن قائم رکھنے کا خواب اور قدرت کو اپنے بس میں کرنے کی امنگ'' جیسی حسّی وفکری وابستگیوں سے سوکار رکھتے رہے نیز ادبی وتخلیقی ادبی وتخلیقی سچائی کے ہر طور میں زندگی کا ازلی حسن اور اس کے تسلسل وقوت کے نمو کا ہی عکس دیکھتے رہے۔ بحیثیت ادیب وہ اس بات سے بھی آگاہ رہے کہ وہ سو فیصدی غیر جانبدار نہیں رہ سکتے اور نہ ہی ان کی تحریریں زیرو (Zero) آئیڈیالوجی کی حامل، اور سب سے اہم بات جس کا انہیں اندازہ رہا کہ تخلیقیت سے پوری طرح جڑنا ہے تو اپنے ذاتی تعصبات یا ترجیحات وترغیبات کو ہٹا کر پرے رکھ دینا لازمی ہوگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اقبال مجید کے ایک کامیاب فکشن نگار بن کر اُبھرنے کی کئی وجوہات میں سے مجھے ایک اہم وجہ یہ بھی لگتی ہے کہ غالباً انہوں نے تخلیقی عمل کے دوران مصنف کے لیے اپنی ذات کی نفی (Annihilation of tyhe self یا Impersonality) کے اس کلیدی اصول کو ابتدا سے ہی گرہ میں باندھ لیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ ان کی کمزور کہانیوں کو بھی معروضیت کی کمی کے نام پر جینوئن ادب کے درجے سے نیچے گھسیٹ لانا آسان نہیں۔

یوں تو اقبال مجید کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے متعلق مضامین بھی، مگر اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا کہ میری کہانیوں کے بارے

میں وارث علوی کے پچیس صفحات او دو چار متفرق مضامین ہی میرا سرمایہ ہیں، واضح کر دیتا ہے کہ وہ اس سے مطمئن نہیں۔ حال میں پاکستان سے شائع ہوئے ان کی کہانیوں کے انتخاب ''قصہء رنگِ شکستہ'' (شہرزاد پبلی کیشن، کراچی) کے حوالے سے میرے کچھ لکھنے کا ارادہ کرنے پر اپنے مخصوص انداز میں ان کا یہ انتباہ تھا ''میری کتاب میں آپ کو تھوڑی بہت خوبیاں نظر آئیں جبھی قلم اٹھایئے گا ورنہ خدا کی قسم ایک سطر بھی مت لکھئے۔'' اس کے باوجود یہاں اس مضمون میں ''قصہء رنگِ شکستہ'' میں شامل کہانیوں کے خصوصی حوالے سے میں نے ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کرنے کی کوشش کی ہے۔

''قصہء رنگِ شکستہ'' کو اقبال مجید کی بہترین کہانیوں کا انتخاب نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں بہت اچھی، اچھی اور اوسط درجے کی کہانیاں سبھی شامل ہیں اور یہ قاری کو ایک ملاجلا تاثر فراہم کرتی ہیں۔ ان پر مزید تبصرے سے قبل میں ان کے مصنف کو اس ادبی پس منظر اور روایت کے درمیان رکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں جس کا وہ بحیثیت ادیب ایک حصہ رہا ہے۔

اکثر تجریدی و علامتی افسانے کو جدید افسانہ تصور کیا جاتا ہے۔ پلاٹ کا معدوم ہو جانا، کرداروں کا بے نام (Anonymous) ہونا یا ٹھوس اور Rounded نہ ہو کر سائے یا Phantoms سے لگنا اور ان کے افعال اور ردِ عمل کا غیر روایتی اور Out of the way یا unpredictable ہونا ساتھ ہی باہری واقعات کے بجائے ذات کے اندرونی ڈرامے پر زور، سوچنے کی زیریں لہریں اور understatement یا افسانے کا نمایاں لہجہ سرگوشی یا Soliloqui کا سانیز زندگی کا وجودی تصور وغیرہ۔ ساٹھ اور ستر کے دہے میں بلراج مین را، انور سجاد، خالدہ حسین (اصغر) جوگندر پال، عوض سعید، سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی، احمد ہمیش، اقبال مجید اور نیّر مسعود وغیرہ جدید افسانے کی اس نئی روایت کے امین بنے۔ ان سب نے افسانے کی ہئیت یا فارم میں اپنے اپنے انداز میں کچھ نہ کچھ تجربے کیے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تجربے یا تبدیلیاں زیادہ تر ہیئت میں ہی کی جاسکتی تھیں، نفسِ مضمون، تھیم یا Content میں اتنی نہیں۔ یوں بھی دیکھا جائے تو قدیم سے جدید عہد کے ادب تک نفسِ مضمون کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہیں ہوا جب کہ ہئیتیں ہر بڑے اور اہم ادیب نے اپنے طریقے انداز اور تجربے کی بنیاد پر بدلی، توڑی مروڑی یا آگے بڑھائی ہیں۔ ایسے تخلیقی عمل کا اکثر عدم قبولیت یا عدم تفہیم سے ہی واسطہ رہا ہے مگر یہ صورت حال جلد یا بہ دیر بدل جاتی ہے اور آگے جانے کے لیے راستہ استوار ہو جاتا ہے۔ اپنے دور میں کیے گئے ہیئت کے انہی جرأۃ مندانہ تجربوں کے باعث نئی کہانی روایتی قاری کے لیے کچھ عرصے تک تو غیر مانوس رہی مگر بعد میں کہانی کے فارم میں لائی گئی اختراعات اردو میں جدید کہانی کی شناخت بنے۔

جدید افسانہ عصری انسان سے مکالمہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس میں فکری عناصر کے پہلے سے کہیں زیادہ در آنے کے باعث قاری کے ذہن پر اس کے اثر انداز ہونے کی صلاحیت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ انسان کی فکری و جذباتی زندگی کی داخلی کشمکش و انتشار اور اس کے mechanization یا Dehumanization اور اس سے پیدا شدہ یکسانیت و لایعنیت کے مسائل کو بھی خط کشید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اقبال مجید کی کہانیوں میں بھی عصری شعور اور سماجی ذمہ داری کا احساس ملتا ہے اور انہوں نے زندگی کے سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی سبھی پہلوؤں کو نہ صرف اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے بلکہ انہیں نئے زاویوں سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کئی کہانیاں انسانی زندگی کے داخلی اور خارجی آشوب پر مبنی تجربات و احساسات کو اپنے بیانیے کی گرفت میں لانے کی کامیاب کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کہانیوں کی اوپری سطح پر کرداروں یا پھر ان کی صورت حال (Situations) کے درمیان اکثر محسوس ہونے والے تناؤ اس بات کا اشارہ ہوتے ہیں کہ کہانی کی زیریں سطح پر کوئی اور تناؤ کام کر رہا ہے جسے مصنف اپنے فنی صبر و ضبط کی بنا پر نہ تو بہت زیادہ ابھارتا ہے نہ پوری طرح مجسم کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ محض ایک فنی طریقہ کار ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق لکھنے والے کے تہذیبی و اخلاقی شعور سے بھی ہے۔ جہاں تک ان کی کہانیوں میں فکری عناصر کے در آنے کی بات ہے، اقبال مجید ان تخلیق کاروں میں سے نہیں لگتے جو اپنے قارئین کی ذہن سازی کا ایجنڈا بھی رکھتے ہیں اور اپنی تخلیق کو کسی آئیڈیالوجی کی ترسیل کا ذریعہ بنانے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے ان کی کہانیاں کسی قسم کی علمیت کے بوجھ تلے دبی ہوئی نہیں لگتیں۔

دراصل ہمیں وہی تخلیقات متاثر کرتی ہیں جن کے وجود میں آنے کے عمل میں سچائی اپنی کوئی شکل بناتی ہوئی معلوم ہوتی ہے گو کہ یہ شکل کبھی پوری طرح نہیں بن پاتی۔ اسی لیے تخلیق کار ایک سے دوسری تخلیق کی طرف بڑھتا ہے، تکمیلیت کے اُس خواب کے عرفان کے مکمل حصول کے لیے جس کی ہر بار وہ بس تھوڑی سی جھلک ہی دیکھ پاتا ہے۔ شاید کرشن چندر اپنے مداحوں کو یہی سمجھانا چاہتے تھے جب یہ پوچھے جانے پر کہ ان کی شاہکار کہانی یا ناول کون سی ہے؟ انہوں نے یہ غیر متوقع جواب دیا تھا کہ وہ ابھی تک لکھی نہیں گئی۔ میرے خیال میں اقبال مجید کو ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بلا تامل اس انتخاب کی ہی کم از کم تین کہانیوں کو اپنی شاہکار کہانیاں قرار دے سکتے ہیں جیسے کہ ''ہم گریہ سر کریں گے''، ''چیلیں'' اور ''قصہء رنگِ شکستہ'' البتہ اسی مجموعے میں ''بے شمار''، ''سوختہ ساماں'' اور ''فقدان'' جیسی ایسی کمزور کہانیاں بھی مل جائیں گی جن میں سچائی کی اپنی کوئی Convincing صورت بنتی نظر نہیں آتی۔ یہیں علامتی کہانی کی ایک عمدہ مثال ''مدافعت'' بھی ہے جس میں بلڈنگ میں بھرا دھواں اور اس سے مدافعت کی کوششیں معاشرے میں سرایت کر گئی برائیوں اور کرپشن کے بیچ رہنے والے انسان کی Survival کے لیے جدوجہد کی ایسی علامتیں بن گئی ہیں جنہیں علامتوں سے آگے جا کر موت سے برسرِ پیکار زندگی کا استعارہ بھی مانا جاسکتا ہے۔

اس انتخاب کی تین کہانیاں ''ہم گریہ سر کریں گے''، ''چیلیں'' اور

''قصۂ رنگِ شکستہ'' فکشن کے سنجیدہ قارئین اور ناقدین دونوں کی خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ یہ مجھے ایسی پُر اثر اور باکمال کہانیاں لگیں جنہیں پڑھ کر بھول جانا یا ان کے سحر سے جلد نکل آنا صرف ایسے قاری کے لیے ہی ممکن ہے جو محض وقت گزارنے کے لیے کہانی پڑھتا ہے (جیسے لوگ جاسوسی دنیا، گلشن نندہ یا رانو کی پاکٹ بکس پڑھتے تھے یا Stunt فلمیں دیکھتے تھے) مگر نہ زندگی کا کوئی گہرا ادراک رکھتا ہے نہ ادب کی سمجھ بوجھ یا پرکھ۔ چوں کہ اس مضمون کا مقصد ان کی کچھ مخصوص کہانیوں پر فوکس کرنا نہیں اس لیے میں یہاں اپنے طور پر صرف ان کی ایسی کہانیوں کی نشاندہی کر سکتا ہوں اور اُن کی خوبیوں کا مختصراً ذکر، نہ کہ اُن پر سیر حاصل بحث۔ اگر ان کی شناخت پہلے بھی ہو چکی ہے اور ان پر کچھ نہ کچھ لکھا جا سکا ہے تو بھی میرا خیال ہے کہ یہ ایسی کہانیاں ہیں جن پر جتنی بھی بات کی جائے کم ہی ہوگی۔ ایسی کہانیاں تخلیقی وفور کے کرشماتی لمحوں میں وجود میں آتی ہیں اور مصنف سے اپنے آپ کو لکھوا لیتی ہیں۔

اقبال مجید کی کہانی ''ہم گریہ سر کریں گے'' دراصل وہ بنیادی خاندانی کہانی نہیں جو کب کی ختم ہو چکی بلکہ اُس بھولی ہوئی کہانی کی یاد ہے۔ جیسے اور جس طرح وہ بیان کنندہ کے تصور یا یادوں میں بسی رہ گئی اور اب مدتوں بعد کبھی کی ٹھوس اور جیتی جاگتی حقیقتوں کا ایک hypnotic بیانیہ بن کر ظاہر ہوئی۔ اگر وہم اور حقیقت کا ازلی ساتھ ہے اور ایک صوفی کی طرح ایک افسانہ نگار بھی وہم اور حقیقت کے درمیان جیتا ہے، اُن کے بیچ ہونے والے کھیل کو اپنی یادداشت میں مسلسل بُنتے، سوچتے یا لکھتے ہوئے تو میں کہوں گا کہ اقبال مجید کی یہاں بھرپور ستائش ہونی چاہیے کہ اس کی کہانی میں بحیثیت ایک فن کار وہ حقیقت اور پرچھائیں کے اس کھیل میں اُن کے درمیانی فاصلے کو مٹا دینے میں پوری طرح کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی ethos کی تشکیل کرنے والی ان کی ایک کہانی ''پیاسے رہنے والے'' بھی ہے جس میں ان کا طاقتور فکشنل بیانیہ گئے زمانوں اور اُن میں بسنے والے انسانوں کو زندہ کر کے دوبارہ ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ ان کی یہ کہانیاں اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہیں کہ تخلیقی عمل میں جہاں جہاں اُنہوں نے اپنے ناسٹیلجک تخیل اور اپنی uncensored digital memory سے خاطر خواہ کام لیا ہے، وہیں ان کی فنکارانہ صلاحیتیں عروج پر دکھائی دی ہیں۔ ہندی ادیب نرمل ورما کے بارے میں کسی مبصر کے یہ الفاظ اقبال مجید کی ایسی کہانیوں پر بھی صادق آتے ہیں جن کا مواد انہوں نے ماضی کے بطن سے برآمد کیا ہے:

''ان کے بیانیے کا بیج اُن کے حافظے سے پھوٹتا ہے۔ ماضی ان کے لیے کبھی ماضی نہیں رہ جاتا، یہ حال کے گرد گھیرا ڈال دیتا ہے، اسے ناسٹلجیا یا اذیت سے بھر دیتا ہے، اسے گرما دیتا ہے یا پھر ایک برفیلے دھاکے سے اسے خوب ٹھنڈا کر دیتا ہے اور ماضی کی کھدائی کا عمل حال کے دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لیے، یہ عمل چاہے ایک پل کا ہو، ایک دن کا کہ ہفتے بھر کا، اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وقت کی تباہ کاری سے کچھ تو بچا لیا جائے۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مجید بھی بحیثیت ایک تخلیق کار معلومات اور اطلاعات و واقعات کی یلغار سے عبارت دنیا میں جینے کے باوجود اپنی نجی دنیا، اپنے اندر آباد دھندلاتے اور دور جاتے ہوئے زمانوں کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے میں ہی زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کہ یہی رویہ ان کی تخلیقی حیثیت کی افزائش میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ مگر ساتھ ہی انہیں اس بات کا پورا شعور ہے کہ ماضی کے قصے کو اب معنویت عطا کرنا ہے تو اُسے حال کی حقیقت پر ہی قائم کرنا ہوگا۔ ہر چند کہ دوسروں کی طرح ان کے بھی ایسے ناسٹیلجک بیانیے ان کے انفرادی تشخص سے مربوط ہیں کہ مذکورہ انسانی صورتِ حال میں وہ بھی کسی نہ کسی حیثیت سے شریک رہے ہوں گے۔ چنانچہ ان کی ان کہانیوں کے آئینے میں ان کی اپنی یا ان کی دنیا کی ویسے ہی دوسرے انسانوں کی خوشیاں و غم، کلفتیں اور ملال یا تمنائیں و خوابوں کے کتنے ہی عکس لرزتے دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال مجید کی ان کہانیوں کے مرکزی کرداروں (Protogonists) کی زندگیوں کی fatality اور ان کے اندرونِ ذات میں سمایا ہوا کرب قاری کے ذہن و اعصاب کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ زندگی کی رزم گاہوں سے اٹھائی گئی ان کہانیوں پر ایک گہرے المیے کی پرچھائیں پڑتی ہوئی بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ متوازی تمثیلی ڈھانچہ (Paralell allegorical structure) بھی جیسا کہ انہوں نے ''ہم گریہ سر کریں گے'' کو فراہم کیا ہے، کہانی کے اختتام (Culmination) میں اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر المیے کی اُس Streak کو مزید گہرا کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یقیناً اُس کہانی میں انہوں نے الفاظ کچھ یوں سر کیے ہیں کہ قارئین کے لیے گریہ سر کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔۔۔ (تم لفظ سر کرو گے ہم گریہ سر کریں گے)۔

''چیلیں'' اقبال مجید کی ایک ایسی علامتی کہانی ہے جس کی شمولیت اردو کی علامتی کہانیوں کے کسی بھی انتخاب میں ناگزیر ہے۔ چیلوں کو سفاکی، تشدد، ناانصافی یا ظلم و استبداد سے جوڑ کر دیکھنے کے لیے کوئی غیر معمولی تخیل درکار نہیں مگر اس علامت کو مرکز میں رکھ کر ایک غیر معمولی ادبی تشکیل کا خالق بن پانا کسی کسی کے ہی حصے میں آتا ہے۔ دکھوں، ناکامیوں اور محرومیوں سے عبارت انسانی زندگی میں تخیل یا Fantasy کے theapeutic رول سے متعلق اقبال مجید کی کہانی ''قصۂ رنگِ شکستہ'' کو ان کی بہترین تخلیقات میں سے ایک مانا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر کہانی کے کلاسیکل mould میں سوچی اور بُنی گئی ایک مکمل کہانی (Perfect Story) ہے جس میں ایک آئیڈیل کہانی کی جملہ صفات جیسے تجسس و تحیر، سسپنس، رمزیت اور انسانی ہمدردی یا دردمندی وغیرہ وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اس مجموعے کی ایک اور کہانی ''سوراخ'' کا ذکر بھی یہاں کم از کم اس لیے کیا جانا چاہیے کہ وہ اپنے موضوع، کردار اور اسلوبِ بیان تینوں کے لحاظ سے منٹو کی کہانیوں سے غیر معمولی مماثلت رکھتی ہے۔ منٹو کے بیشتر کرداروں کی طرح یہاں بھی سماج

کے حاشیے پر رہنے والے گوری شنکر کے دل میں ایک خطرناک سوراخ کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی بنیادی انسانیت بھی دبی پڑی ہے، دکھائی گئی ہے جسے منٹو کی ہی کی طرح یہ مصنف بھی ڈھونڈ نکالنے کا ادبی فریضہ انجام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اقبال مجید کے ۲۰۱۰ء میں شائع مجموعے 'آگ کے پاس بیٹھی عورت'' میں شامل کہانی ''چراغِ آرزو'' میں بحیثیت ایک فکشن نگار ان کی کردار نگاری کی صلاحیتیں اپنے عروج پر پہنچی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ''مُنی بیگم'' چاہے کسی ایسے حقیقی عورت کا پورٹریٹ (Portrait) ہو جسے وہ قریب سے جانتے تھے یا پھر یہ کردار پوری طرح ان کے تخیل کی اختراع، ان دونوں صورتوں میں اردو کے بڑے سے بڑے خاکہ نگار کو بھی یہاں انہیں اپنا حریف ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔ اگر میری رائے کو کچھ وزن دیا جائے تو میں اردو فکشن کے نہ بھلائے جانے والے کرداروں کی کسی بھی فہرست میں ''چراغِ آرزو'' کی ''مُنی بیگم'' کی شمولیت کی سفارش کرنا چاہوں گا۔

البتہ اسی مجموعے کی اُن کی کہانی ''زلزلے'' کو artistic misadventure کی ایک مثال قرار دیا جا سکتا ہے جس میں اُس کا مرکزی نسوانی کردار ''آ کرتی'' اور اس کے حوالے سے افسانے میں وقوع پذیر ہونے والی زیادہ تر باتیں، دونوں کے ضمن میں objective correlatives کا فقدان (ناکافی جواز) انہیں مشکل سے یقین میں آنے والی سچائی یا بڑھا چڑھا کر متشکل کی گئی حقیقت (inflated reality) کی صورتیں بنا دیتا ہے، (ہیملٹ کے کردار کے حوالے سے objective correlatives کے فقدان، ڈرامے میں اس کے ردِعمل اور افعال کا ناکافی جواز کی بنا پر ایلیٹ نے شیکسپیئر کے اس معروف ترین پلے کو ایک artistic failure قرار دیا ہے) ویسے بھی ہر ادیب کا ایک اپنا تخلیقی دائرہ کار ہوتا ہے جس کے باہر وہ کبھی کبھار ہی قدم رکھتا ہے۔ اقبال مجید کا افسانوی بیانیہ بھی معاشرت، سیاست یا تاریخ سے تو مسلسل سروکار رکھتے ہوئے اسے اپنی کہانیوں کے پس منظر کے طور پر استعمال کرتا آیا ہے مگر عورت یا جنس سے بحیثیت موضوع برائے نام ہی معاملہ کر سکا۔ یہاں یہ محض میرا انفرادی تاثر ہو سکتا ہے مگر ان کی اس کہانی ''زلزلے'' کی قرأت کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے اس کی تلافی کے طور پر مصنف نے یہ کہانی اور اس کے ذہنی و جنسی طور پر aggressive اور میلو ڈرامائی کردار ''آ کرتی'' کی تخلیق کر کے منٹو کی کم کم پڑھی گئی مگر غیر معمولی کہانی ''میرا نام رادھا ہے'' قسم کا کوئی کردار تراشنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف نے گارسیا مارکیز، ملن کندیرا یا دیگر ادیبوں کے تخلیق کیے گئے عصری مغربی فکشن سے clue لے کر تاریخ، سیاست، جنس اور سماجی اُتھل پتھل، ان سبھی کے juxta position سے فکشن کا ایک ڈھانچہ کھڑا کرنے کی تجرباتی کوشش کی تھی مگر تصوراتی سچائیوں کے ضمن میں کہیں کہیں کچھ زیادہ out of proportion ہو جانے کے باعث یہ تخلیقی تجربہ اتنا کامیاب نہ ہو سکا۔

بحیثیت مجموعی فکشن نگار اقبال مجید کے تخلیقی تشخص کی شناخت میرے نزدیک مندرجہ ذیل حوالوں سے کی جانی چاہیے:

microscopic قوتِ مشاہدہ اور جزئیات نگاری کی غیر معمولی صلاحیت۔ ایک uncensored ناسٹیلجک یادداشت جو بیانیہ اور حقیقت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ روا رکھتی ہے جتنا اسے فنی طور پر متشکل کرنے کے لیے ضروری ہے (اس کی الٹی مثال قرۃ العین حیدر) ادبی بیانیہ فراہم کرتا ہے جو بڑی حد تک رومانی اور narcissistic ہے)۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی یا اخلاقی ڈسکورس کو ادبی ڈسکورس کے متوازی نہ رکھ کر اُس کا تابع بنا کر رکھنے کی فہم و فراست (چیل، مدافعت، ہم گریہ سر کریں گے، چراغِ آرزو وغیرہ میں)۔۔۔ تمثیل کو ایک آئیڈیل کہانی کا ماڈل مان کر اس سے بار بار رجوع ہونا اور اُس کو جدید کہانی کے سیکولر فارم سے synthesize کرنے کا کامیاب تجربہ (پوشاک، ہم گریہ سر کریں گے اور ایک نیزے کی حکایت وغیرہ)۔ زندگی کے عصری منظر نامے میں اُس کی مہملیت اور مضحکہ خیزی کو خط کشید کرنے کی کوشش۔ (''پیشاب گھر آگے ہے''۔۔۔ انسان کی بے بسی کی مہمل اور مضحکہ خیز صورت حال کا علامتی اظہار، یا ''ایک حلفیہ بیان''۔۔۔ زمین پر الٹا پڑا ہوا کیڑا بے نتیجہ ٹانگیں چلاتے ہوئے۔ ٹریجڈی کی ایک مضحکہ خیز شکل جس میں نہ میلوڈراما کی گنجائش رہ گئی ہو نہ ہی فرار کی راہ۔ عصری انسان کی لاچاری و بے بسی کا استعارہ)۔ متوسط طبقے کی زندگی کا افسانہ لکھنے والا ادیب۔۔۔ بظاہر گمنام پورے چہرہ لوگوں کی ظاہری و باطنی زندگیوں کے پورٹریٹ۔۔۔ جمالیاتی طور پر ان کی مسیحائی کی artistic redemption اور ان کی انفرادیت کی بازیافت کی کوششیں۔۔۔ ایک غیر آرائشی، terse اور matter of fact قسم کے اسلوب سے عبارت ہے۔

اختتاماً میں یہ بھی کہنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اقبال مجید ہمارے عہد کے اردو کے اہم فکشن نگار ہیں جن کی تخلیقات اور فن پر ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

نوبل 2016

سویڈش اکادمی کے مطابق پچھتر سالہ راک لے جنڈ باب ڈائیلان کو امریکی روایتی نغمہ نگاری میں شاعری کا نیا انداز تخلیق کرنے پر ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔ ڈائیلان شاعری اور نغمہ نگاری کے ساتھ اداکاری میں بھی اپنے جوہر دکھا چکے ہیں۔ ان کے مشہور گانوں میں ''بلون ان دی ونڈ''، ''لائیک اے رولنگ اسٹون'' شامل ہیں۔ باب ڈائیلان پہلے شاعر اور نغمہ نگار ہیں جن کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔

''کسی دن''

(ناول کا ایک باب)

اقبال مجید

''میری بیوی اکثر کہتی تھی۔'' شہباز اس سے مخاطب ہوئے تھے۔
''عورت کو ہر لمحہ اپنے عورت پن کی تلاش میں رہنا چاہیے۔''
پھر انہوں نے سیدھا شوکت سے مخاطبہ جوڑا تھا۔
''تم بھی مکالمہ کرتی ہو؟''
''کس سے۔۔۔؟'' شوکت نے سوال کیا تھا۔
''خود سے'' شوکت کچھ نہ بولی۔ ''اپنے آپ سے مکالمہ'' کم سے کم ہفتے میں ایک بار۔۔۔بس تھوڑے سے سوال جواب۔''
''کس چیز کے بارے میں۔؟''
''خود اپنے بارے میں۔ اگر کچھ کیا ہے تو کیوں کیا ہے؟ نہ کرتیں تو کیا ہوتا؟ ایسا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے جس کے کرنے میں روشنی نہیں اندھیرے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔؟ ایسے ہی بہت سے سوال۔۔۔ پھر ان کے جوابوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی ساتھ ہی ساتھ قائم رکھنا چاہیے۔''

شوکت کو خبر نہ تھی کہ اس طرح کا مکالمہ اس کی سوتیلی ماں اکبری بیگم بھی گھر سے نکلنے سے پہلے اپنی بغلوں میں ولایتی سینٹ کی پھوار ڈالتے ہوئے اکثر اپنے آپ سے کرلیا کرتی تھیں۔

شوکت کی سوتیلی ماں اکبری بیگم لڑکیوں کے مڈل اسکول میں استانی تھی۔ گھر کی جلاؤ لکڑیاں وہ شوکت کے والد کی ٹال سے خریدنے آیا کرتی۔ تب اس کا بائیس تیئیس کا سن تھا اور مدرّسی کے پیشے کی قلیل آمدنی سے پریشان تھی۔ انہیں دنوں کچھ ایسا ہوا کہ وہ شوکت کے باپ کو دیکھ کر کچھ زیادہ ہی مسکرانے لگی۔ تب تک باپ رنڈوے ہو چکے تھے اور مسکاہٹوں کی ہی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اکبری بیگم کو مشورہ دیا کہ وہ ٹھوک بھاؤ میں ان سے جلاؤ لکڑیاں لے جایا کرے اور پھٹکر بھاؤ میں انہیں بیچا کرے۔ اکبری بیگم نے اپنے دروازے کے سامنے نگر نگم کو کھلا پلا کر ایک چھوٹا سا سائبان ڈال لیا تھا اور لکڑیاں بیچنے لگی پھر تو شوکت کے باپ کی ٹال پر ان کی گدی کے پاس مونڈھا ڈالے اکبری کو اکثر بیٹھا پایا جانے لگا۔ بس انہیں دنوں میں سے ایک صبح اکبری کے بدن پر مہکتے پھولوں کے گہنے شوکت کے باپ کے بستر پر مسلے پڑے تھے اور وہ ان کے نکاح میں آ چکی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے برس آندھی طوفان کی طرح گذر چکے تھے جس میں اکبری بیگم کی بیوگی کے پانچ سال بھی شامل تھے۔ حالانکہ شوہر کے مرنے کے تین مہینے بعد ہی سے اکبری کی بیوگی کے نشانات اس کے حلیے اور چہرے مہرے سے غائب ہو چکے تھے، لیکن اب تو اس کی چھل بل ہی کچھ اور تھی۔

جب بھی وہ دن بھر کے بعد گھر میں داخل ہوتی، سب سے پہلے اپنے کندھے پر لٹکنے والے پرس کو دیوار کی الماری میں بند کر کے تالا لگاتی۔ کئی بار شوکت جہاں کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ کبھی ماں کی نظریں بچا کر اس پرس کی تلاشی لے کر دیکھے۔ لیکن شوکت کو اس کا کبھی موقع نہ ملا۔ مگر ایک دن شوکت جب ماں کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ میز پر ماں کا پرس رکھا ہے۔ لیکن ماں تو کچھ دیر پہلے ہی اپنے روزمرہ کے مطابق گھر سے نکل چکی تھی۔ شوکت سمجھ گئی کہ جلدی میں وہ پرس میز پر ہی بھول کر چلی گئی ہے۔ شوکت پہلے تو بھاگ کر گھر کے صدر دروازے پر گئی۔ باہر ادھر ادھر جھانک کر دیکھا۔ پھر جلدی سے دروازہ بند کر کے اور اندر سے کنڈی لگا کر واپس ماں کے کمرے میں آئی۔ دھیرے سے پرس کو کھولا اور احتیاط سے اندر کا جائزہ لینے لگی۔ سب سے پہلے ایک چھوٹی سی ڈائری اس کے ہاتھ لگی۔ ڈائری میں معروف لوگوں اور پولیس کے کچھ حکام وغیرہ کے فون نمبر تھے اور ڈائری کے پلاسٹ فلیپ کے اندر آدھی پھنسی پاسپورٹ سائز کی کسی موچھوں والے مرد کی تصویر جھانک رہی تھی۔ ڈائری بند کر کے اس نے پھر ہاتھ ڈالا۔ دیکھا چھوٹے سے پرس میں چند روپے تڑے مڑے رکھے تھے۔ پھر اس کو لپ اسٹک، شیشہ اور دستی وغیرہ کے علاوہ اس میں سرکاری اسپتال میں تقسیم کئے جانے والے دودھ کے دو پیکٹ بھی دکھائی دئے اس کے ساتھ ربن بینڈ میں بندھے کچھ ملاقاتی کارڈ بھی رکھے تھے۔ جن میں زیادہ تر پولیس افسران اور ہوٹل کے پروپرائیٹروں کے کارڈ تھے۔ شوکت کو پس باہر سے ہی کچھ پھولا پھولا لگ رہا تھا اس لئے شوکت نے پرس کے باہری خانے کی زپ بھی کھولی جو غالباً کافی کھینچ تان کے بعد مشکل سے بند ہو پائی تھی۔ زپ کھلی تو اس خانے سے ایک شیشی نکلی جس میں پانی کی رنگت کا کوئی مشروب تھا۔ شیشی سیل بند تھی اور اس کے لیبل پر کسی ڈرائی جن کا نام لکھا ہوا تھا ساتھ ہی کنٹونمنٹ ایریا کی آرمی کینٹین کی رسید بھی رکھی تھی جو کسی کیپٹن کے نام کی تھی۔ اس کے علاوہ دو ایک سینما گھروں کی بالکونی درجے کے لال پیلے ٹکٹوں والے کاونٹر فوائل بھی پڑے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹے سے پرچے پر کسی ٹاکر نام کے سب انسپکٹر کا نام، اس کے موجودہ تھانے اور وہاں چارج لینے کی تاریخ وغیرہ کے ساتھ کسی نئے تھانے پر مطلوب تقرر کی تفصیلات درج تھیں۔ شوکت نے جلدی جلدی سب چیزوں کو ویسے ہی واپس پرس میں رکھ دیا اور بند کر کے پھر ٹھیک اس جگہ رکھ کر ماں کے کمرے سے باہر آئی تھی کہ باہر کے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ ان دنوں کال بیل کام نہیں کر رہی تھی، کیونکہ بجلی کے پچھلے دو بلوں کے بقایا کی ادائیگی کے نوٹس پر بھی رقم نہ جمع کئے جانے کے سبب کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔ شوکت نے باہر کا دروازہ کھولا تو دیکھا ماں ہے۔ وہ تیر کی طرح اندر آئی اور سدھے اپنے کمرے میں پہنچی۔ اپنے پرس کو تشویش کے ساتھ کھول کر ایک نظر دیکھا، پھر کندھے پر لٹکا کر الٹے پیروں واپس چلی گئی۔

دھیرے دھیرے شوکت نے یہ بھی دیکھا کہ ماں دو دو تین تین دن گھر سے غائب رہنے لگی۔ ایک دن بیٹی نے ماں سے مکالمے کی شروعات کی۔

''ماں۔۔۔تم کہاں چلی جایا کرتی ہو؟''

''تمہارا باپ کہاں چلا جایا کرتا تھا؟ کیا کبھی مجھ کو یا تم کو بتاتا تھا؟''

جواب ملا۔

کچھ دن بعد شوکت نے پھر مکالمہ شروع کیا۔

''ماں محلے والے اب بہت باتیں کرنے لگے ہیں۔''

''جب تم اشفاق سے سینما گھروں میں ملتی تھیں تب محلے والوں کو خیال آیا تھا تم کو۔۔۔؟'' شوکت کو جواب ملا۔

''ماں تمہارے پاس پولیس والوں کے اتنے فون کیوں آتے ہیں؟''

''میں تو تم سے کبھی نہیں پوچھتی کہ پرتاپ شکلا تمہیں کیوں فون کیا کرتا ہے۔'' شوکت کو جواب ملا تھا۔

پھر شوکت کو معلوم ہو گیا کہ اس کی ماں بڑے بڑے حکام کی عشرت کدوں کی زینت بن رہی ہے۔ وہ پولیس کی مخبری بھی کرتی ہے اور اعلیٰ حکام اور ان کے ماتحتوں کے درمیان رشتوں کے لین دین میں دلالی کا کام بھی انجام دیتی ہے۔ ڈھلتی عمر میں ہونے کے باوجود کمرہ بند کر کے ایک گھنٹہ ورزش کرتی ہے، جسم کو متناسب اور وزن کو قابو میں رکھتی ہے۔ اناج چھوڑ کر ایک وقت صرف سلاد کھاتی ہے اور ہر آٹھویں دن کسی بیوٹی پارلر میں پانچ گھنٹے کا مسلسل وقفہ اپنے چہرے مہرے کی زیبائش کے لیے گزارتی ہے پھر وقت بھی کہاں تھا؟ ماں بیٹی کے درمیان سارے مکالمے ختم ہو چکے تھے۔

موخان کے چہرے پر ان کی مونچھیں ایسی بہار دیتی تھیں کہ دیکھنے والا پلٹ پلٹ کر اور گھوم گھوم کر دیکھتا تھا۔ بالوں کی موٹائی، چمک اور شادابی کے ساتھ ان کی اینٹھن میں جو بانکپن تھا ممکن ہے وہ آصف الدولہ کی مونچھوں میں رہا ہو۔ جب انہوں نے آموں کا نیا باغ لگوایا تو ایک پڑوسی باغبان راحت میاں نے ان کے اس باغ کا پانی کئی بار چوری سے کاٹ کر اپنے نئے باغ میں لگوالیا۔ موخان کو پتہ لگا تو ایک دن وہ بڑے آرام سے شام کو سفید اور بے داغ شیروانی پہن کر اور اس کے آٹھوں بٹن بند کر کے اور گلے کا تکمہ بھی اچھی طرح لگا کر ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی گھماتے راحت کے گھر بڑی بے نیازی کے ساتھ پہنچ گئے۔ میزبان کے ساتھ حقہ پیا اور اس کی بیوی کی گٹھیا کی پرانی بیماری کے علاج کے لیے اپنا خاندانی تیر بہ ہدف نسخہ بھی بنوا کر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ راحت میاں کو خلوص سے دوا پیش کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''بھابھی جان کو اس دوا کی تیس پڑیاں بنا کر کھلائیے۔ ایک ماہ میں ہی انشاءاللہ خاطر خواہ شفا ہوگی۔''

لیکن جب راحت میاں موخاں کی ایک نیک دلی پر تشکر کے کلمات ادا کر رہے تھے تو اس وقت موخاں انگلیوں کی پوروں پر بیس بار گن کر اپنے دل ہی دل میں یہ جملہ دہرا رہے تھے۔

''میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا''

''میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔''

''میں۔۔۔''

''۔۔۔پانی کاٹا تھا''

اگلے سال جب موخاں راحت میاں کے نواسے کے عقیقے کی تقریب میں گئے تو بچے کے لیے جوتے موزے اور بنیان وغیرہ کے ساتھ مکمل جوڑا پورے تکلفات کے ساتھ خوان پوش میں سجوا کر پہنچایا اور بڑے تپاک سے پڑوسی باغبان کے ہاتھ سے پیش کئے گئے پان اور الائچی سے منہ لال کیا۔ لیکن اس وقت بھی انہوں نے انگلیوں کی پوروں پر گن گن کر دل ہی دل میں دہرایا۔

''میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔''

''میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔''

ایک آدھ سال اور گزر گیا تو موخاں کو کسی موقع پر ایک بار ایسا لگا کہ جو جملہ وہ بیس بار دل ہی دل میں دہرایا کرتے ہیں، اس کی قوت کو وقت غالباً کچھ کمزور کرنے لگا ہے تو انہوں نے آئندہ اس جملے کو اس طرح دہرانا شروع کر دیا۔

''قرآن قسم میں یاد رکھوں گا کہ تو نے میرے باغ کا پانی کاٹا تھا۔''

پھر یہ ہوا کہ سات آٹھ سال میں پڑوسی باغبان کا وہ باغ جسے اس نے کئی بار موخاں کا پانی چرا کر سینچا تھا، جب اپنی پہلی فصل کے بوجھ سے مستا رہا تھا تو موخاں نے اسی طرح سے سوچا جیسا کہ ان کے خیال میں آم کی باغبانی کرنے والے کو سوچنا چاہیے اور اسی طریقہ سے سات سال پہلے اپنے دل پر لگی چوٹ کو جھاڑ پونچھ کر باہر نکالا، جو ان کے خیال میں آم کو اپنا کلیجہ نکال کر چاشنی فراہم کرنے والی تہذیب کو کرنا چاہیے۔ وہ غصے میں اکثر کہتے تھے۔

''صبر اور انتظار کے معاملے میں حضرت ایوب کی قسم آم کے باغبان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا'' لہٰذا ان کی پرانی چوٹ نے سب سے پہلے یہ کیا کہ بڑی رازداری کے ساتھ آم کی منڈی کے آڑھتیوں اور تھوک خریداروں میں اپنے شاندار باغ کے آم کی پوری فصل مفت تقسیم کر دی اور ان کی یونین کو نقد پانچ ہزار روپے بھی چندے کے طور پر دیا اور آخر میں ان کے کھیاؤں کو ولایتی دارو فراہم کروائی۔ جب راحت میاں اس باغ کی فصل ٹرک میں بھر کر منڈی پہنچے تو سارا دن بھاؤ بٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن منڈی کے تھوک بیوپاری ایک ٹرک ریت کا دام بھی لگانے کو تیار نہ ہوئے۔ ٹرک واپس لوٹ گیا۔

دوسرے دن ٹرک پھر منڈی لایا گیا، اب دام ایک ٹرک مٹی بھر کے بھی نہیں رہ گئے۔

تیسرے دن جب مال پھر آیا تو داغ لگنا شروع ہو چکا تھا۔ آڑھتیوں نے ایسے دام لگائے جیسے بھیک دے رہے ہوں۔

راحت باغبان کو اپنے مال کی یہ ہتک دیکھ کر غصہ آ گیا۔ دیر تک وہ کانپتے رہے۔ انہیں ٹھنڈا فالودہ پلایا گیا تو دل ذرا ٹھہرا۔

''گائے بیل کو کھلا دونگا لیکن اب نہ بیچوں گا۔'' انہوں نے ایسی آواز میں یہ جملہ ادا کیا کہ آسمان دہل گیا۔

تھوڑی دیر بعد منڈی کی بھیڑ نے دیکھا ایک ٹرک سے آم لٹائے جا رہے ہیں اور سڑک پر گھومتی پھرتی آوارہ گائیں اور سانڈ ان پر جھکے ہوئے ہیں۔

ایک دن حقہ پیتے میں شفق رنگ شام کے حسن کے درمیان جسم کو بھلی لگنے والی مند مند ہواؤں کے جھکولوں کے ساتھ کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے راحت باغبان، منڈی کے کسی آڑھتیے سے پوچھ رہے تھے۔

''بھائی رام کھلاون جی۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آج بھی سوچتا ہوں تو دماغ کام نہیں کرتا۔ اس دن آخر منڈی والوں نے میرے اس مال کو نہ خریدنے کا دل میں فیصلہ کیوں کر لیا تھا؟''

''کیا آپ کو اس بات کا دکھ ہے؟'' آڑھتیے رام کھلاون نے پوچھا تھا۔

''اتنا ہی جتنا میری بہو بیٹیوں کے سر بازار رسوا کیے جانے پر ہوسکتا ہے۔''

''آپ کو ان آموں سے اتنی محبت تھی؟''

''ہاں، وہ دودھ اور شہد سے تیار کی گئی میرے سب سے دلارے باغ کی پہلی فصل تھی۔'' راحت میاں تڑپ کر بولے۔

''بھائی صاحب۔'' رام کھلاون نظریں جھکا کر بولا ''آپ کو پتہ ہوگا کہ آپ کے آدمیوں نے کئی بار موخاں کا پانی کاٹ کر اس باغ کو چوری سے سینچا تھا۔'' راحت میاں کا منہ دوپل کے لیے کھلا رہ گیا تھا اور پھر انہوں نے حقّے کا اتنا لمبا اور بھرپور کش لیا کہ کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ آنکھیں باہر نکل پڑیں، منہ بیر بہوٹی ہوگیا۔ وہ پھر اپنی سانس کو باوجود کئی ہچکیوں کے واپس نہ لا پائے۔ صرف اس شرمندگی میں کہ وہ صبر اور انتظار میں موخاں سے مات کھا گئے تھے۔ راحت کی دونوں آنکھیں کھلی تھیں لیکن اس شفق رنگ شام پر تیزی سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ موخاں نے دشمنی کی قلم لگانی بھی آم کی قلمیں لگانے سے ہی سیکھی تھی۔ شاخ کو پہلے تیز چاقو سے صفائی سے ترچھا کاٹو، پھر قلم کے ایک ایک ریشے کو دوسرے ریشوں سے جوڑ کر باندھو۔

موخاں کے باغات کئی تھے۔ زمینوں پر کاشت تھی، ٹریکٹر تھے۔ ایک کان میں ننھی سی بالی ڈالے گانجے کی چلم گھسیٹنے والے چوڑی اور مضبوط چھاتی کے وہ پاسی جن کے پردادا بیگم حضرت محل کے ساتھ کسی زمانے میں اودھ کی سرزمین پر انگریزوں سے لڑے تھے۔ موخاں کی گنے کی Cash Crop کی نگہہ داشت کرتے تھے اور موخاں کے لیے ہر دم اپنی جان ہتھیلی پر لئے رہتے تھے۔ ایک بار موخاں کے تین جانباز پاسیوں کی بیٹیوں کی شادیوں کا معاملہ آن پھنسا۔ موخاں نے ان لڑکیوں کے جہیز کے انتظام کا وعدہ کر لیا تھا۔ باغوں میں ابھی صرف بور آئے تھے۔ فصل بک گئی ہوتی تو وہ بادشاہ ہوتے۔ کعبے کی طرف منہ کر کے بولے۔

''میرے مالک میں جانتا ہوں کہ آم کے پیڑوں کے بور دکھا کر فصل کا سودا کرنا ہمارے لیے حرام کام برابر ہے۔ لیکن تو میری مجبوری کو معاف کرنا کہ مجھے تین تین کنواریوں کے ہاتھ پیلے کرانے ہیں۔ اور میرا تین لاکھ روپیہ دساور میں پھنسا پڑا ہے۔'' پھر موخاں نے ایسے بیوپاریوں کو فون کیا جو صرف پیڑوں پر بور دیکھ کر فصل کا سودا کر کے جوا کھیلتے تھے۔ ایک باغ کی فصل اونے پونے ہی بکی۔ موخاں نے ان پاسیوں کی تینوں بیٹیوں کا جہیز بیل گاڑیوں پر لدوا کر پہنچوا دیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کا باپ رات بھر موخاں کے پیر دباتا رہا اور روتا رہا۔ موخاں نے ڈانٹ لگائی تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''رو لینے دو مالک، نہیں تو مارے خوشی کے میرے پران نکل جائیں گے۔''

ایک دن شطرنج بچھی تھی، ادھر موخاں اور ادھر علاقے کے تحصیلدار راٹھور جی ڈٹے تھے۔ راٹھور جی کو زندگی میں صرف دو ہی چیزوں کا شوق تھا، ایک تو مسلمانوں کے گھروں کے شامی کباب جنہیں وہ پاؤ ڈیڑھ پاؤ پیاز کے لچھوں کے ساتھ کھا جایا کرتے تھے اور دوسرے شطرنج۔ شطرنج بھی اس حد تک جب تک وہ مقابل کو مات دیتے رہتے۔ مات کھا جاتے تو ان کی ٹھکرائی انہیں دیوانہ کر دیتی۔ وہ بساط پھاڑ دیتے اور مہرے جلتی ہوئی چلم میں ڈال دیتے۔ راٹھور جی کے اندر ایک چھوٹا سا بچہ پوری طرح تر و تازہ تھا۔ شاید اسی لیے انہیں سنسنی خیز اور اخباروں کے اسکینڈلوں میں اتنا مزہ آتا کہ وہ دو دو تین تین دن تک ان اسکینڈلوں کو بار بار بیان کر کے موخاں کا دماغ چاٹ جایا کرتے۔ اس وقت راٹھور کے چہرے کی چمک آنکھوں کا تحیّر اور اندر کی بے چینی اور پھڑ پھڑاہٹ چہرے پر کچھ اس طرح عیاں ہوتی کہ دیکھنے والے کو بھی لطف آ جاتا۔ وہ عموماً چارپائی پر بیٹھتے تھے، لیکن ان باتوں کے دوران جوش میں چارپائی پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور چھت کا پنکھا ان کے سر سے آدھا ہاتھ اوپر رہ جاتا۔

ایک بار موخاں کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کسی سنسنی خیز جواب کی امید میں وہ پوچھ بیٹھے۔

''جب شطرنج نہیں کھیلتے تو وقت کیسے کاٹتے ہو۔۔۔؟''

موخاں کچھ دیر منہ لٹکائے سوچتے رہے، پھر کچھ ایسا شرمائے جیسے سولہ برس کی لڑکی شرماتی ہے۔ پھر انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''کیا بتاؤں؟ کئی بار سوچا کہ تمہیں بتادوں لیکن ہمت نہ ہوئی۔''

''کیوں۔۔۔؟ بھلا ایسی کیا بات ہے؟'' راٹھور چونکے۔

''بات کچھ ایسی ہی ہے، بلکہ اب وہ کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔''

''اچھا۔۔۔؟'' راٹھور ایسے چلائے اور اچک کر چار پائی پر اکڑوں بیٹھ گئے جیسے ان کی مرادوں کی کلی کھلنے والی ہے۔

''تم میرے اچھے دوست ہو۔'' مموخاں دھیمے لہجے میں گردن جھکائے بولے۔''سوچتا ہوں بتادوں، پر ناراض نہ ہونا۔''

''بالکل نہیں۔'' راٹھور نے جلدی سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''بے دھڑک بتاؤ۔''

مموخاں نے کمرے کے ادھر اُدھر دیکھا۔ بار بار لفظ تلاش کرنے اور انہیں ادا کرنے کے لیے ان کے ہونٹوں میں کپکپاہٹ ہوئی، آخر کو وہ بڑی مشکل سے کہہ پائے۔

''جب سے استادگی میں کچھ کمی آئی ہے تب سے مجھ میں ایک شرم ناک شوق پیدا ہو گیا ہے۔''

''کیسا شوق۔۔۔؟'' راٹھور کی سانس جیسے رک گئی۔

''میں اپنا زیادہ وقت بس لگا تا دیکھتے رہنے میں بسر کرنے لگا ہوں۔''

''کیا دیکھتے رہنے میں؟'' راٹھور کی دونوں آنکھیں باہر نکلنے کی تیار میں تھیں۔

''گینگ ریپ Gang Rape''

''گینگ ریپ؟ کیا بکتے ہو۔۔۔'' راٹھور چار پائی پر کھڑے ہو گئے۔

''یقین مانو ایسی لذت ملتی ہے کہ جوانی میں ہم بستری میں بھی نہ ملی تھی۔''

''لیکن گینگ ریپ تمہیں دیکھنے کو مل کیسے جاتا ہے۔ یہ کہاں ہوتا ہے؟ تجھے میری قسم۔'' اب راٹھور کانپ رہے تھے۔

''خوب ہوتا ہے۔'' مموخاں کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔''پہلے بہت دنوں تک سوشلزم کا گینگ ریپ ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر فلاحی ریاست Welfare State کا دیکھا آج کل دھرم نرپیکشتا۔۔۔''

راٹھور کی ساری ہوا نکل چکی تھی۔ وہ مموخاں کی بات کاٹ کر چلائے۔

''تم ایک نمبر کے حرامی ہو۔۔۔'' راٹھور یہ کہتے ہوئے چار پائی سے اترے پھر انہوں نے بساط کے مہرے الٹے اور باہر نکل گئے۔

فرقہ پرست ہندو جماعت کے ہندی اخبار میں پارٹی کے نظریوں کی تشہیر کے سلسلے میں مضامین اور تحریریں چھپتی رہتی تھیں۔ قدرت اللہ سے کہا گیا کہ وہ ان مضامین کا ترجمہ پارٹی کے اردو ترجمان میں بھی کم سے کم ہفتے میں ایک بار دیتا رہے تا کہ عام مسلمانوں کو صحیح نقطۂ نظر کے بارے میں معلومات ہوسکیں اور ان کے دلوں میں صدیوں سے چلی آرہی منافرت اور علیحدگی پسندی کے رجحان کو ختم کیا جا سکے۔ قدرت اللہ غریب اس کام میں لگ گیا۔ اگلے ہی ہفتے اس نے اردو پڑھنے والوں کو سب سے پہلے جو بتایا وہ کچھ اس طرح تھا۔۔۔

بھارت اس لیے سیکولر ہے وہ ایک ہندو راشٹر ہے۔

اور Hindutva نام ہی ہے

رواداری

فیاض دلی

اور فکر و نظر کی کشادگی کا

یہ مذہب نہیں، ایک نظام حیات ہے جو الگ راستوں پر چل کر ایک ایشور تک پہونچنے پر یقین رکھتا ہے۔

جب تک بھارت کا مسلمان اپنے مذہب میں بھارت کے قدیم مذہب کو اور اپنی تہذیب میں بھارت کی قدیم تہذیب کو مدغم نہیں کرے گا، لڑائی جاری رہے گی۔

کہ ہندو ہی آغاز ہے

اور ہندو ہی انجام

کچھ لوگوں میں اخبار کی اس تحریر پر کچھ چیں چیں پیں پیں ہوئی۔ کبھی اخبار کھولا گیا۔ کبھی بند کیا گیا کبھی یہ سطر پڑھی گئی کبھی وہ۔۔۔ کوئی اچھلا۔۔۔

''اجی صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہندو ہو جاؤ۔۔۔''

امتابھ بچن کی فلم کا ٹکٹ لینے والی لائن میں لگی مسلمان برقعہ پوش عورتوں کو آج بھی کچھ پتہ نہیں تھا غالباً انہیں یقین تھا کہ وہ یہ سب پتہ لگائے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہیں کیونکہ قدرت اللہ نے اپنی آنکھوں سے ایک آدھ بار اس اخبار سے انہیں بچوں کو صرف غلاظت ہی صاف کرتے دیکھا تھا۔۔۔ مگر قدرت اللہ کی بھی مجبوری تھی ایک ہفتہ گیا نہیں کہ دوسرا آ گیا۔ اخبار پریس میں جانا تھا اس نے پھر ترجمہ کیا۔۔۔

سخت دل مسلم بادشاہوں نے ہمارے دریاؤں، ہمارے میدانوں اور ہماری بستیوں پر حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ سب تو معمولی چیزیں تھیں اصل گھاؤ تو انہوں نے تاک کر وہاں لگایا جہاں ہم بلبلا اٹھے۔ اور وہ تھا ہمارے سینکڑوں ہزاروں سال پرانے Hindutva کا قومی سبھاؤ۔

انہوں نے اپنی بربریت سے ہمارے اس بیش بہا سبھاؤ کو تہس نہس کرنے کی کوشش کی۔ اس سازش میں برطانیہ کے مورخوں نے برابر کا ساتھ دیا۔ انگریز نے بڑی چالاکی سے ہمیں غلط مغربی علوم کی انجان پگڈنڈیوں پر ہانک دیا۔ ہمیں بتایا گیا۔۔۔

سارا بھارتیہ گیان لنگڑا ہے۔

ادھورا اور فرسودہ ہے۔

علم و آگہی کا نیا سورج مغرب سے طلوع ہو چکا ہے۔

بھارت ایک جغرافیائی علاقے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس علاقے

میں مختلف گروہ اور سماج شامل ہیں۔

جن کا اپنا اپنا مذہب اور اپنی اپنی تہذیب ہے۔

اس جھوٹی اور بدیسی دھرم نرپیکشتا نے بھارت کے ہزاروں سال پرانے راشٹریہ سبھاؤ کی اصلی ایکتا اور اکھنڈتا کو دفن کر کے فرقہ پرستی، تشدد اور اگاؤ کی بنیاد ڈالی اور وندے ماترم گانے والوں کی آنکھوں کے سامنے بڑی بے رحمی سے ماں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

ہم بہت لڑے نہرو سے۔

بار بار ہم نے کہا کہ مہاراڑاں پرتاپ اور شیواجی کے بھاگوت دھوج یعنی کیسریا جھنڈے کو راشٹریہ جھنڈا بنا دیا جائے کیوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اس میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی۔ بدیسی اور جھوٹے علم کی انجان پگڈنڈیوں پر دور تک نکل جانے والے ضدی نہرو نہیں مانے اور اپنا جھنڈا اونچا رکھا۔

ہم کتنی بار ذلیل ہو چکے! کتنی کتنی بار!

اب اور کتنی بار ذلیل ہوں گے؟

یہ بات جو ذلیل کر رہا ہے اس کے سوچنے کی نہیں، جو ذلیل ہو رہا ہے اس کے سوچنے کی ہے۔

اس لیے۔۔۔

گرو سے کہو ہم ہندو ہیں۔۔۔

کچھ لوگوں میں اخبار کی اس تحریر پر کچھ چیں چیں پیں پوئیں۔ کبھی اخبار کھولا گیا کبھی بند کیا گیا، کبھی یہ سطر پڑھی گئی کبھی وہ۔۔۔ کوئی اُچھلا۔

''اجی یہ وہی تو ہیں جنھوں نے گاندھی کو گولی ماری تھی۔۔۔''

نہ تو پیر صاحب کے عرس پر لگنے والے میلے میں بھینسے کی کلیجی کے ٹکڑوں کو سیخوں میں پیوست کر کے انہیں کوئلوں پر سینک کر بیچنے والے کو اور نہ میلے کی بھیڑ میں لونڈیوں کے پیچھے آواز سے کستے، گلے میں لال رومال باندھے اور بالوں میں سستا خوشبودار تیل چپڑے مسلمان لونڈوں کو ہی اس بات کا پتہ تھا کہ کون کس کو ذلیل کر رہا ہے۔ قدرت اللہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کے اخبار کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھاڑ کر کلیجی والا اس میں بھنی کلیجی اور چٹنی رکھ کر گاہکوں کو بیچ رہا تھا۔ مگر قدرت اللہ کی بھی مجبوری تھی۔ اخبار پریس میں جانا تھا اس نے پھر لکھا۔۔۔ چیں! چیں!! پھر لکھا پیں! پیں!!

خانساماں کچن میں تھا، کتے غنودگی کی حالت میں سست پڑے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجو میاں نے سامنے کھڑے ہو کر انگور کی بیلوں میں بکروں کا خون مالی سے ڈلوایا تھا۔ رات پچاس لوگوں کا کھانا تھا موخاں نے باغ سے جس ادھے پر لنگڑا بھیجا گیا تھا اس کے بیل پچھواڑے سائبان کے نیچے آرام سے جگالی کر رہے تھے۔ کوٹھی کی شاندار بیٹھک سے ملحق چھوٹے کمرے میں جس کا سارا فرنیچر اعلیٰ قسم کے بید کا تھا اور جس پر باریک چمڑے کی گوٹوں والے آرام دہ گدے لگے تھے، ان گدوں پر آنسو بہاتی شوکت جہاں بیٹھی تھی اور اسے اپنا رومال دیتا ہوا شہباز خاں۔۔۔ یوں تو شہباز خاں بہت کچھ پہلے سے جانتا تھا لیکن اس وقت وہ چپ چاپ سب کچھ شوکت جہاں سے سن رہا تھا۔ شوکت جہاں، باپ کی دلاری، بی اے میں فرسٹ ڈویژن، جوڈو کراٹے کی مشقوں میں انعام یافتہ لمبی اور اونچی اڑانوں کی شوقین، شہباز سے یوں مخاطب تھی۔

''میں نے سنا تھا، دیکھا نہیں تھا کہ جب نہرو جی ہمارے محلے میں علما کے جلسے میں آتے اور میری بوڑھی نانی چھت پر عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر انہیں سڑک سے گزرتے دیکھتیں تو پھولوں کی بارش کرتیں اور دونوں ہاتھوں سے بلائیں لیتیں اور کہتیں میرا لعل آ گیا، میرا لعل۔۔۔ بات کو میں نے سیاست کے لیے سب کچھ ہی کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میرا بھی کچھ کرنے کا دل چاہا۔ پرتاپ شکلا کو میرے باپ نے کچھ زمین دلوانے میں بڑی مدد کی تھی۔ تب اوقاف میں اس کی کوئی بات پھنسی تھی۔ میرے گھر کے جب تب چکر لگاتا تھا۔ میں انٹر میڈیٹ میں پڑھتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہنسی ہنسی میں مجھ سے کہتا ''بے بی آپ پارٹی کا کام کریں۔۔۔ نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ انہیں آگے آنا چاہیے'' باپ مرا تو پتہ چلا کہ ہمارا ایک گھر بھی ہے۔ اس کی دال روٹی کیسے چلتی ہے، یہ تو ہم نے کبھی نہ جانا۔ قدرت ہماری سوتیلی ماں سے تھا۔ سوتیلی ماں نے مجھے اپنی گود تو دی لیکن دھیرے دھیرے سب ہتھیا بھی لیا۔ قدرت تو گھر سے ہمیشہ کے لیے چلا جاتا کہ ماں بس اپنی رنگ رلیوں میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ میرے باپ کو جوتی کی نوک پر رکھتی۔ باپ کے مرنے کے بعد ایک بار کسی بڑے ہوٹل کے کمرے میں اُسے کسی مالدار سندھی صنعت کار کے ساتھ۔۔۔ قدرت نے تو سکھیا کھالی تھی۔ اسپتال میں پیٹ صاف کیا گیا اور معاملہ بڑی مشکل سے رفع دفع کیا گیا۔ پچیس سال کی عمر ہونے کو آ رہی ہے۔ دس سال سے مردوں کی نظریں دیکھ رہی ہوں مرد کن کن پینتروں سے، کون کون سے حیلوں سے اور کیسے کیسے جادوئی لہجوں میں اور کتنی پر پیچ شیریں سریلی اور کہاں سے کہاں پہنچا دینے والی زبان میں عورت سے بولتا ہے اور کتنی چالاکی ہوشیار سے پر اسرار اور پر اثر لفظوں کو اپنی آنکھوں کے پر کشش کاغذ کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر جلی حرفوں میں لکھ کر انہیں عورت کی آنکھوں کے راستے پہنچا کر اس کے احساس کے دروازوں کو تھپکیاں دیتا ہے اور ہولے ہولے پکارتا ہے۔ کچھ اس طرح کہ صبح ہو کہ دوپہر، شام ہو کہ رات، خلوت ہو کہ جلوت، وہ تھپکیاں وہ مند مند گرم گرم اندر کہیں جھرجھری سی پیدا کر دینے والی اور دھڑکنوں تک میں سرایت کر جانے والی وہ پکاریں عورت کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ پھر وہ سرگوشیاں، وہ آوازیں، وہ پکاریں ایک دن عورت کو زیر کر دیتی ہیں اور آخر کار چیخ چیخ کر بھدے، کرخت، ذلت آمیز اور تمسخرانہ انداز میں اعلان کرتی ہیں۔ ''ہم نہ کہتے تھے، اس کم عقل جنس گزیدہ دو پیروں والی مادہ کو گھیر کر مار لینا کتنا آسان ہے۔''

شوکت سوچتی رہی۔

جوانی کے دس سال بارش، سردیاں، گرمیاں ویران دوپہریں اور تنہائیاں اور دس سال۔ اسے بتایا گیا تھا کہ فطرت کے بنیادی تقاضوں کو مت

بھولو۔تم جس راحت اور خوش بختی کی تلاش میں دن دن بھر یہاں سے وہاں بھٹکتی ہو، سڑکوں، بازاروں تیری میری چوکھٹوں ڈرائنگ روموں شامیانوں اور آڈیٹوریموں کی چھتوں کے نیچے اپنی نت نئی چھل بل کی چلبلاہٹیں لٹاتی رہتی ہو، یاد رکھنا کہ تمہاری برداشت کی قوت، غلیل کے ربڑ کی طرح ہے جسے ایک خاص حد تک ہی کھینچا جا سکتا ہے۔ پھر اس کے آگے وہ ٹوٹ بھی جایا کرتا ہے۔ شوکت کو خیالوں میں کھویا پا کر شہباز نے بات شروع کی۔

''کچھ پوچھوں۔۔۔؟''

''جی۔۔۔''

''ٹھیک ٹھیک بتاؤ گی؟''

''ضرور''

''پرتاپ کے بارے میں''

''کیا۔۔۔؟''

''مجھے بتاؤ۔۔۔''

''کیا بتاؤں۔۔۔؟''

''جو ابھی تک نہیں بتایا ہے۔ لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہے ضرور۔ تم چیخنا جانتی ہو لیکن چیخ نہیں پا رہی ہو۔ عورت کا سب سے بڑا گناہ احتجاج کرنے میں دیر کرنا ہے۔ افسوس کہ عورت جہاں دیر نہیں کرنا چاہیے وہاں دیر کر بیٹھتی ہے۔ پھر جب سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو۔۔۔''

''آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا۔۔۔'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وہ بولی۔۔۔'' میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ قدرت کو سستے غلے کی دکان کا پرمٹ دلا دے تو اس نے بتایا کہ فی الحال پرمٹ ان لوگوں کو دئے جا رہے ہیں جن کے اصل دھندے راتوں کے ہیں پھر بھی وہ قدرت کو پرمٹ ضرور دلوائے گا لیکن۔۔۔''

''لیکن۔۔۔؟'' شہباز نے اپنی بھوئیں اوپر کیں۔

''لیکن۔۔۔'' وہ کچھ دیر چپ رہی پھر آہستہ سے بولی ''پانی منگوایئے۔۔۔''

جب تک پانی آتا اور وہ اس سے اپنا حلق تر کرتی اس نے سوچ لیا کہ وہ شہباز کو سب کچھ بتانا چاہتے ہوئے بھی سب کچھ نہیں بتا سکتی۔۔۔ وہ الفاظ تلاش کرتی رہی کہ کم سے کم شہباز کو اتنا ہی بتا دے کہ ہر عورت اپنی زندگی میں ایک ایسے مرد کا انتظار جانے یا انجانے میں ضرور کرتی ہے جو اس سے کھلم کھلا، سب کے سامنے بغیر جھجک، مصلحت اور راز داری کے، اپنی محبت کا اقرار کرے۔ جو اس کی چاہت کو پہلے سات پردوں میں دھیمے دھیمے اپنے اور اس کے دل میں پکائے، پھر اس کی لذتوں کو اپنے اور اس کے ہونٹوں پر رکھے، پھر اس خمار آگیں دلنواز اور تڑپانے والے پیار کے انوکھے تجربے کو جو ابھی ان دونوں کی ذات تک ہی محدود تھا طشت از بام کر دے، پوری دنیا کے سامنے، چمکتے سورج کی روشنی میں بار بار اقرار کرے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ دیکھو، اور یہ دیکھو کہ اس کے قدموں کے اوپر ہی اس کا سر ہے۔ لیکن پرتاپ تو صاف لفظوں میں اسے بتا چکا تھا کہ وہ کسی ایسی سماجی شرافت زدگی کا قائل نہیں ہے جو اسے ساری زندگی شوکت جہاں کی کھوجڑ کھلاتی رہے۔ لیکن پانی پی لینے کے بعد وہ شہباز خاں سے بولی۔

''باتیں تو بہت سی ہیں لیکن کیا فائدہ۔''

''شاید کچھ فائدہ ہو سکے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی۔

''آپ تو جانتے ہیں اس کا نام پرتاپ شکلا ہے۔''

''ہاں''

''وہ گورکشا کی حمایت کرتا ہے۔ بالکل صاف صاف۔''

''اچھا تو۔۔۔''

''وہ بھی گائے کو ماں مانتا ہے جو پاکیزگی اور احترام کی علامت ہے۔''

''لیکن اس بات کا یہاں کیا ذکر؟'' شہباز نے اسے ٹوکا۔

''اس لیے کہ میں نے اسے کئی بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ میں عورت ہوں، اور عورت کے لیے اپنی پاکیزگی اور عصمت کی بہت بڑی اہمیت ہے لیکن اس کے جواب نے میری آنکھیں کھول دیں۔''

''کیسے۔۔۔؟'' شہباز نے سوال کیا۔

''خدا جانے یہ خیال وہ تاریخ کے کس دور سے لایا ہے۔ وہ کہتا ہے پرانی کتابوں کی رو سے عورت کبھی پاک نہیں ہو سکتی۔ وہ سال میں بارہ بار گندی ہوتی ہے، بچہ رکھتی ہے تو بھی گندی رہتی ہے۔ زچگی کے بعد بہت دنوں تک اس کے پاس آنا بھی خود کو گندہ کرنا ہے۔ پھر سب سے دہشت انگیز بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ عورت اعلیٰ روایتوں کی کتنی ہی پاسدار کیوں نہ ہو، مرد کو پانے اور بھوگنے کے لیے کہیں بھی فاحشہ بن جانے میں دریغ نہیں کرتی۔ جب کہ گائے کی پاکیزگی اور طہارت مسلم ہے، کیونکہ وہ ہانک بھی دی جاتی ہے تو طاہر رہتی ہے زخمی کئے جانے پر بھی اپنے زخم چاٹتی رہتی ہے، لیکن خود کو پاکیزہ یعنی بے ضرر رکھتی ہے۔ وہ ذبح ہو کر بھی لوگوں کو اپنی بوٹیاں کھلاتی رہتی ہے اور لوگ اس کے گن گاتے رہتے ہیں۔ مگر عورت گائے کی طرح بے ضرر نہیں وہ مرد کے سینہ پر سوار ہو کر کبھی کبھی اس کے جبڑے تک پھاڑ دینے تک کی قوت رکھتی ہے۔ وہ اسے تمناؤں کے لہلہاتے باغوں میں پھراتی ہے، وصل کی بہشتوں میں سلاتی ہے۔ اور ہجر کی دوزخوں میں جلاتی ہے۔ اس لیے مرد ایسی تمام چیزوں کو طاہر اور پاکیزہ ماننے میں صدیوں سے تامل کرتا آیا ہے اور آگے بھی کرتا رہے گا جو مرد کو للکارنے اور ایذا پہنچانے کی قوت رکھتی ہوں۔ کیوں کہ جو بے ضرر ہے وہی طاہر ہے۔

''تو پرتاپ تم سے کیا چاہتا ہے؟'' شہباز نے ٹوکا۔

''جب مجھے ہمیشہ گندہ رہنا ہے تو کیوں نہ کبھی کبھی اس کے بستر پر بھی گندی ہوتی رہوں''

''تمہارا کیا ردِعمل رہا؟'' شہباز نے ٹٹولا۔

''میرا کوئی بھی ردِعمل اس کے لیے اطمینان بخش ہی ہوا کرتا ہے۔''

''یعنی۔۔۔''

''اسے اطمینان ہے کہ میں ایک ایک کرکے ایسی تمام علامتیں ظاہر کرتی جا رہی ہوں جو کسی عورت میں بے ارادہ کسی مرد کے بستر تک پہنچنے سے پہلے ظاہر ہوا کرتی ہیں۔''

''اس وقت ملازم نے آ کر خبر دی، راشٹر یہ سیویکا سمیتی کی کوئی پریچا ریکا ملنے آئی ہیں۔

''شہباز نے لگاتار محنت کے بعد تقریباً سو ہم خیال عورتوں کا ایک حلقہ تیار کر لیا تھا جو شہباز کی بیوی کے خواب کو تعبیر دینے میں سرگرم ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس تنظیم کا نام ''کہکشاں'' رکھا تھا۔ وہ شہر کی کمزور طبقے کی بچیوں، بے سہارا بیواؤں، یتیم لڑکیوں، بیوہ بوڑھیوں اور خاندانی اور گھریلو تشدد کی شکار غریب خواتین کی سماجی خوشحالی کے لیے مختلف پروگراموں کے ذریعے جدوجہد کر رہی تھیں۔ اس انجمن کا اپنا ایک بیت المال تھا۔ اس کے ممبر اپنے اپنے ہم خیالوں سے زکوٰۃ کی رقمیں، قربانی کی کھالیں اور سات سو تیس روپیہ سالانہ یعنی دو روپے روز کی امدادی رقم، اور مالدار افراد سے بڑی رقمیں لیتے تھے۔ انجمن کی اپنی ایمبولینس تھی جسے ایک چھوٹے موٹے آپریشن روم اور لیبر روم میں منتقل کر لیا گیا تھا۔ اس میں لائق اور تجربہ کار ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹروں وغیرہ کی خدمت حاصل کی جاتی تھیں۔ اگرچہ پسماندگی کا شکار مسلمان عورتیں اس انجمن سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھا رہی تھیں، لیکن پڑھی لکھی بے شمار ہندو خواتین بھی اس تنظیم کو پیسے اور ہاتھ پاؤں سے اپنا تعاون دے رہی تھیں۔ کھلے ٹرک پر خاصہ کشادہ پلیٹ فارم بنا کر سستے لباس، میک اپ کا دیسی سامان، کچن کے لیے ریڈی میڈ کھانے پکانے کا سامان، اچار مربے وغیرہ کی نمائش ہوتی۔ اسی چلتے پھرتے پلیٹ فارم پر خواتین کو کام دلانے والی مختلف کارگر اسکیموں اور ان سے متعلق تنظیم کے ذریعے دیے جانے والے قرضوں کی بھی معلومات فراہم کی جاتیں۔ کبھی کبھی اسی چلتے پھرتے پلیٹ فارم پر خواتین کلاکار ناٹکوں کے شو کرتیں۔

شہباز کی مرحوم بیوی عائشہ کے دل میں اس طرح کی فلاحی تنظیم کے قیام کا خیال دراصل پشپا کھوٹے نے پیدا کیا تھا جو آر ایس ایس کی ایک تنظیم راشٹر یہ سیویکا سمیتی کی ممبر تھی اور عائشہ کی کلاس فیلو بھی رہی تھی۔ پشپا نے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے عائشہ کو بتایا تھا کہ سیویکائیں شادی شدہ زندگی گزارنے سے دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اس طرح سر سنگھ چالک بھی زیادہ تر برہمچاری ہی رہے ہیں۔ اس نے راشٹر یہ سیویکا سمتی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بتایا تھا کہ ایسا کہا جاتا ہے کہ سنگھ کی اہم رکن لکشمی بائی کیلکر جی ۱۹۲۶ء کے آس پاس ایک بار ریل گاڑی میں سفر کر رہی تھیں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے کچھ غنڈوں نے جو مسلمان نہیں تھے، ایک ہندو جوان عورت کو اس کے شوہر کے سامنے ریپ کیا اور اس عورت کا شوہر صرف بے بسی کے ساتھ دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر پایا۔ اس حادثے کو دیکھ کر کیلکر جی کو خیال آیا کہ ہندو خواتین کی ایک ایسی تنظیم قائم ہونی چاہیے جو عورت کو خود اپنے دفاع کے لیے تیار کر سکے۔ اس لیے سمیتی دو خاص باتوں کو اہمیت دیتی ہے۔ پہلی، ہندو عورت میں مزاحمت کرنے کی طاقت کے لیے جسمانی تربیت، اور دوسری اس کو آدرش ہندو ناری بنانے اور ہندو تہذیبی قدروں پر اس کی گرفت مضبوط کرانے کی نظریاتی تربیت تاکہ ہندو عورت ہندوستانی سماج کی اہم ترین خاندانی اکائی کے طور پر مضبوط رہے اور بدیسی عناصر کا لایا ہوا انتشار اسے منتشر نہ کر سکے۔

...... آسماں زیرِ زمیں......

(منتخب کلام)

اُردو دان طبقہ میں نسیم سحرؔ ایک خوش گو ار شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی یہ پہچان زیادہ تر غزل اور پھر نعت کے حوالے سے ہے لیکن اس نے حمد، سلام، منقبت، نظم، قطعہ، ہائیکو، ماہیا یعنی ہر مروجہ صنف میں دادِ سخن دی ہے حتیٰ کہ مزاحیہ شاعری سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ اس کے علاوہ نثری محاذ پر انگریزی سے اُردو تراجم کی ایک لمبی فہرست ہے، مختلف موضوعات پر کالم نگاری کا فریضہ بھی انجام دیا ہے، کتابوں کے دیباچے اور فلیپ بھی تحریر کیے ہیں، راولپنڈی/اسلام آباد میں ہونے والی تقریباً ہر تقریب کو رونق بخشی ہے نیز شہر اور ملک سے باہر بھی بسلسلہ ''ادب گردی'' بہت سے مقامات پر دھاکے کیے ہیں۔ ادبی شخصیات سے ملاقاتوں کے لیے طویل و مختصر سفر کیے ہیں، خاندانی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان سب مصروفیات کے درمیان اپنے خالقِ حقیقی سے بھی صاحب سلامت رکھی ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس کے باوجود اُس کی داڑھی ترشی ہوئی ہوتی ہے، سر کے رہے سہے بال خوبی سے جمے ہوتے ہیں، لباس بے شکن اور جوتا پالش ہوتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس نے اپنی زنبیل میں وقت کا کوئی بڑا ٹکڑا چھپا رکھا ہے۔ یہ تمام لفاظی کا مقصد نسیم سحر کے منتخبہ کلام کے تازہ مجموعے ''آسماں زیرِ زمیں'' کے تعارف کے حوالے سے کی گئی ہے۔ اگر آپ اسے کارنامہ گردانتے تو یہ خاکسار کے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔ ......خاور اعجاز

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، دستیابی: دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

افسانہ

زہرپاش طیارے

اقبال مجید

کل جو کچھ اُس نے لکھا وہ بس چند سطریں تھیں۔ان سطروں کو وہ بس یونہی دیکھتا رہا پھر بے دلی سے انہیں پڑھنے لگا۔لکھا تھا۔

''سیریا ایک ملک ہے جیسے ہندوستان ایک ملک ہے۔وہاں بچے بھی ہیں اور عورتیں بھی، جیسے کہ ہندوستان میں ہیں۔اگر ہندوستان میں ہیلی کا پٹر کے ذریعے کلورین گیس فضا میں چھڑکیں تو ہندوستان میں بھی قصور وار اور بے قصور، بوڑھے اور بچے چوہے بلی کی طرح ویسے ہی مریں گے جیسے سیریا میں مرے تھے۔تڑپ تڑپ کر،اُن سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں جتنے جلیانوالے باغ میں جنرل ڈائر نے مارے تھے۔''

آ گے عبارت خاصی کٹی پٹی تھی لیکن نیچے کی سطروں میں پھر صاف صاف لکھا تھا۔آنکھیں چاہے سیریا کی ہوں یا ہندوستان کی قدرت نے آنکھوں کو بنایا ہی اس لیے ہے کہ وقت ضرورت اُن میں آنسو آ جائیں۔آنکھیں بھگونے کی ضرورت سے کسی ملک کے باشندوں کو اور کسی زمانے کے افراد مفر نہیں ہے۔

آ گے کی عبارت پھر کچھ کٹی پٹی تھی۔

اسے پڑھنے کے لیے وہ ابھی آنکھوں پر زور دے ہی رہا تھا کہ گھر والوں سے اُسے خبر ملی کہ ہوا میں آنے والی کالی کالی آندھی کی بُو کو بڑے بوڑھوں نے محسوس کر لیا ہے، باہر پھیلے کپڑے الگنیوں سے اتار لیے گئے ہیں اور کھڑکیاں دروازے بند کر لئے گئے ہیں لیکن آندھیوں کو لاکھ روکا گیا مگر وہ گھس کر توڑ پھوڑ کرنے سے باز کہاں آتی تھیں۔

یکا یک کالی آندھیوں کو بھول کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا!

حالات آنکھیں بھگو دیتے ہیں۔

ثبوت اقوام متحدہ کے ممبران کی وہ آنکھیں ہیں جو کلورین گیس کے چھڑکاؤ سے سیریا میں بچوں اور عورتوں کا تڑپ کر مرنے کا تماشہ ویڈیو میں دیکھ کر بھیگ گئی تھیں۔بس ایک اچھی بات یہ ہے کہ آنکھیں ہمیشہ ہی بھیگی نہیں رہا کرتیں،تھوڑی دیر بعد خشک بھی ہو جاتی ہیں۔

وہ ایک کالج میں پروفیسر تھا۔سگار پیتا تھا۔بیس سال تک پیتا رہا۔ایک دن ڈاکٹر نے بڑے تیوروں کے ساتھ اس پر جملہ کسا!

''مرنا ہے تو سیدھے سیدھے مر جاؤ۔یہ ایڑی رگڑ رگڑ کر مرنے کا شوق کیا چرایا ہے۔''

بس اس کے بعد سے اُس نے سگار چھوڑ دیا۔ان دنوں بار بار اس کے دماغ میں مولوی بشیر الدین کا خیال آتا تھا۔اسے لگتا کہ مولوی قرآن شریف اور دینیات پڑھاتے پڑھاتے اس کی بیوی اور بیٹے سے جونک کی طرح چپک گیا ہے اور ان لوگوں کو سگار کی طرح مولوی بشیر الدین کی لت پڑ رہی ہے۔وہ بڑبڑایا۔

''جس طرح میں نے سگار پینا چھوڑ دیا، ہمت کر کے مولوی بشیر الدین سے بھی چھٹکارا حاصل کر لوں''اسی وقت ان کے گھر کی چھت کے اوپر کافی نیچی اُڑان کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر اڑان بھرتے ہوئے گزرا۔اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ مولوی بشیر الدین اور ہیلی کاپٹر کے بیچ کیا رشتہ ہے۔جب بھی مولوی بشیر الدین یاد آتے ہیں تب ہی اسے ہیلی کاپٹر کا خیال کیوں آتا ہے، شاید اسی لئے یکا یک اسے وہ ہیلی کاپٹر یاد آ گئے جنہوں نے سیریا کی عورتوں اور بچوں پر کلورین گیس چھڑک کر پوری آبادی کو چوہوں کی موت مارا تھا۔

اسے بتایا گیا تھا کہ کلورین گیس گرانے والے ہیلی کاپٹر عام ہیلی کاپٹروں سے بناوٹ میں قدرے مختلف ہوا کرتے ہیں اور ریاست (State) کے علاوہ کوئی عام ایجنسی نہ تو انہیں اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور نہ ان کا استعمال کر سکتی ہے۔

وہ ابھی انہیں خیالات میں گم تھا کہ کال بیل بجنے کی آواز آئی۔

وہ کچھ متفکر انداز میں گردن گھما کر ادھر دیکھنے لگا۔اس کو حیرت تھی کہ اس کی بیوی نے گھنٹی کی آواز سے ہی آنے والے کو پہچان لیا تھا۔وہ بڑبڑائی مولوی صاحب آ گئے اور لپک کر دروازہ کھولا۔وہ غلط نہ تھی دروازے پر ان کے بیٹے سلو کو دینیات پڑھانے والے مولوی بشیر الدین کھڑے تھے۔سلّو کی ماں حیرت سے بولی۔

''کیا ضرورت تھی آندھی میں آنے کی''سلو کی ماں کو جواب ملا۔

''کل بھی نہیں آ سکا تھا۔آج بھی ناغہ ہوتا تو دل ملامت کرتا''مولوی کو پڑھانے کی لت سی پڑ گئی تھی اور یہ لت وہ اپنے شاگردوں میں بھی ڈالنا چاہتا تھا۔اس نے آہٹوں کی طرف کان لگائے۔ان آہٹوں سے سلّو کے باپ کو پتہ چلتا رہا کہ اب مولوی بشیر الدین کو عزت سے بٹھایا گیا ہے، اب بارہ برس کا ان کا بیٹا سلو جلدی جلدی وضو کر کے اور جالی دار ٹوپی پہن کر اور معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر بھیگی بلّی بنا بشیر الدین کے سامنے بیٹھ رہا ہے۔یہ کام شروع شروع میں وہ ماں کے خوف سے کرتا تھا پھر اس کو مولوی صاحب سے پڑھنے میں مزہ آنے لگا۔پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی نے مولوی بشیر الدین کو اپنے باورچی خانے سے ناشتہ بھی دینا شروع کر دیا، کہتی وہ حافظ قرآن ہیں ان کی خاطر داری سے رحمت بڑھے گی۔مولوی صاحب بھی پھر سب کچھ چھوڑ کر اور دونوں گال بھر بھر کر پراٹھوں کا ناشتہ کرتے۔ایک دن اس نے بیوی سے پوچھ لیا کہ سوکھا سوکھا تاڑ کی طرح لمبا اور بکرے جیسی داڑھی والا مولوی کیا چیز ہے۔بیوی نے اپنی معلومات کا خزانہ کھول

دیا۔

''یہ آدمی کیسے بھی موسم میں تعلیم کے لیے اپنے گھر سے مدرسہ تک پہنچنے کے لیے ایک دریا اور تین گندے نالے مسلسل پار کرتا رہا ہے۔ ان نالوں سے اسے جلد کی بیماریاں ہوگئیں، غریب ابھی بھی داد کھاج کا شکار ہے۔

جب اس نے بیوی سے یہ معلوم کیا کہ وہ اکثر مولوی کو ناشتے میں بڑے جانور کے گوشت کے کباب بھی کھلاتی ہے تو اس نے بتایا کہ گوشت کے بغیر مولوی کا نوالہ نہیں اُٹھتا۔ تین روپے قصائی کے یہاں سے چھچھڑے لا کر ان کا سوپ بنا کر اس میں روٹی بھگو کر کھاتا ہے۔ کہتا ہے میں نے طمع کو مار دیا ہے، کوئی نماز نہیں قضا ہوتی۔ کیسی بھی سردیاں ہوں کسی نے ان کے بدن پر کوئی گرم کپڑا نہیں دیکھا۔ کہتا ہے ایمان مضبوط ہے تو سب کچھ مضبوط ہے۔ ایک بار سلّو کی والدہ کے کان میں درد اُٹھا تو اس نے ان کے کان میں چاروں قل چپکے چپکے پڑھ کر سلّو کی ماں سے یہ ہدایت کی کہ وہ شریعت پر چلے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنا قریب منہ لانے پر سلّو کی والدہ کو یہ احساس ہو گیا کہ شاید بشیر الدین کو پائیریا کا مرض ہے کیونکہ اس کے منہ سے بُو آ رہی تھی۔

ایک دن اُس نے سلّو کی ماں کے سامنے ہی سلّو سے پوچھ لیا۔

''بتاؤ آج مولوی صاحب نے کیا پڑھایا؟''

''وہ بہت اچھے سے سمجھاتے ہیں'' سلّو نے جواب دیا اور سمجھانے کی تفصیل یہ بتائی کہ مان لیجیے مولوی صاحب آسمان پر ہیلی کاپٹر میں اُڑ رہے ہیں اور سلّو میاں ایک جلتے ہوئے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر اپنے بچاؤ کے لیے مدد کے طالب ہیں تو مولوی کا یہ فرض ہے کہ ہیلی کاپڑ سے جلتے مکان کی چھت پر ایک رسی گرا کر سلّو کو پکڑا دے اور سلّو اسے پکڑ کر ہیلی کاپٹر میں محفوظ چلا آئے۔

تفصیل بتا کر سلّو تو چپت ہو گیا لیکن اس کا باپ، ہیلی کاپٹر، رسّی اور جلتے ہوئے مکان کے رشتوں کو سوچتا ہی رہ گیا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ ان کے ایک پڑوسی عبد الکریم ٹھیکیدار گپ شپ کرنے ان کے پاس آ گئے۔ عبد الکریم ٹھیکیدار مخلص اور محنتی انسان تھے۔ پریشانی کے دنوں میں انہوں نے سلّو کی بہن افشاں کو گود لیا تھا۔ ایک دن سلّو کے باپ نے عبد الکریم ٹھیکیدار سے پوچھا۔

''آپ نے ہی مولوی بشیر الدین کو سلّو کو پڑھانے کے لیے رکھوایا ہے۔ ذرا آپ ہی اس کہانی کا مطلب بتایئے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے وہ کہانی بیان کی جو مولوی صاحب نے ان کے بیٹے سلّو کو سنائی تھی۔ مولوی صاحب کا ہیلی کاپٹر میں اُڑنا، سلّو کا ایک جلتے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر مدد کے لیے پکارنا، مولوی صاحب کا رسّی پکڑانا، سلّو کا رسّی پکڑ کر ہیلی کاپٹر پر محفوظ پہنچ جانا وغیرہ۔

عبد الکریم ٹھیکیدار کا جواب تھا کہ یہ کہانی تو مولوی صاحب ان کے بچوں کو بھی سنا چکے ہیں۔ اس کا مطلب بالکل سیدھا ہے، ہیلی کاپٹر میں بیٹھے مولوی صاحب اللہ پاک کی جانب سے ملنے والی غیبی امداد کے مانند ہیں۔ رسّی سے مراد اللہ کی رسّی ہے یعنی اللہ کی نیک ہدایت سے جلتے ہوئے مکان کی چھت سے مراد دوزخ کی آگ ہے جس سے اللہ کی رسّی پکڑا کر بندے کو دوزخ سے محفوظ رکھنا مولوی صاحب کا کام ہے۔

یہ باتیں کر کے عبد الکریم ٹھیکیدار نے انگوچھے سے اپنا منہ پونچھا۔ غلّہ جیسی دو بڑی بڑی آنکھیں قدرے طیش میں باہر نکالیں اور گلا دبا کر بولے۔

''میں پڑھا لکھا تو آپ کی طرح نہیں ہوں لیکن اس کمینی اور کُتّا دنیا کو ہر دم دیکھ رہا ہوں سوتے میں بھی آنکھیں پھاڑے اس پر نظر رکھتا ہوں۔ بیہڑ جنگلوں میں سانپ بچھوؤں اور بے وفا اندھیروں سے دوستی کر کے رہزنوں اور شیر چیتوں کی جان لیوا گھاتوں سے بچنے بچانے کی کوشش میں بھی دنیا پر سے نظر نہیں ہٹاتا۔ میں نے کیا محسوس کیا ہے بتاؤں آپ کو؟''

یہ کہہ کر عبد الکریم چپ ہو گئے۔ فرط جذبات سے ان کی سانس پھولنے لگی تھی اور آواز بند ہو چکی تھی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر سلّو کا باپ سٹپٹا گیا، دوڑ کر گلاس میں پانی لایا اور ٹھیکیدار کو ڈھارس دینے کے کلمات ادا کرنے لگا۔

ٹھیکیدار صاحب کچھ دیر اپنے کو سنبھالنے کے بعد اپنے پیچھے ایک بوجھل سناٹا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئے تو وہ بھی کچھ شرمندہ سا ہو کر گردن جھکا کر بیٹھ گیا مگر دو پل بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ پھر دھیرے سے کھلا، ٹھیکیدار کی سرخ ڈورے پڑی بڑی بڑی آنکھوں نے کمرے کے اندر جھانکا اور یہ کہتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے۔

اس مخلوق کے لیے ہم سب نے تھوڑی تھوڑی دیر کے واسطے اپنے اپنے کام بانٹ لئے ہیں جو آج قتل کرنے کا کام کرتا ہے۔ وہی قتل ہو جانے کے کام میں لگ جاتا ہے۔ جو آج اُجاڑنے کا کام کرتا ہے، وہی کل بسانے کے کام میں لگ جاتا ہے۔

اس دنیا کی تو سالی ماں کی۔۔۔ ٹھیکیدار کے منہ سے موٹی سی گالی نکلی۔ پھر گالی بھرے تھوک کو کمرے کی زمین پر تھوکا اور انگوچھے سے ہونٹوں پر گالی ملے لعاب کو پونچھتے ہوئے فوراً واپس لوٹ گئے۔ وہ دروازے کو تکتا ہی رہ گیا۔

اگلی صبح جب سلّو کا پروفیسر باپ ٹھیکیدار کے دنیا کے علم کے نیچے دبا کچلا ہاتھ پیروں میں درد کے ساتھ اُٹھا تو اس سے اُٹھا نہ گیا۔ بیوی چائے لیکر آئی تو منع کر دیا اور تھوڑی دیر بعد افشاں کے ہاتھ بھیجنے کی ہدایت کی۔ افشاں اس کی بڑی بیٹی تھی اور اوبیرائے (OBI RAE) کے ہوٹلوں سے ہوٹل مینجمنٹ (Hotel Management) کا کورس کیا تھا۔ وہ ان دنوں چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد افشاں چائے لے کر آئی۔ وہ بیٹی کو آنکھ بھر کر کچھ دیر دیکھتا رہا۔ چتونوں میں اعتماد کی لپلپاتی ہوئی ایک برقی قوت تھی۔ آواز میں جوانی کی کھنک تھی۔ اس نے افشاں کو بڑی آرزوؤں کے ساتھ پالا تھا، اس کا کیریئر بنانے میں اپنی کھال تک اُدھڑ وا دینے میں بھی دریغ نہ کیا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر باپ کو ایک بار پھر اس کی رہائش کا مسئلہ یاد آ گیا۔ ٹریننگ کے دوران افشاں ہوٹل کے

اسٹاف ہاسٹل میں رہتی تھی۔لیکن تربیت مکمل ہونے کے بعد جہاں اس کو جاب (Job) ملی وہاں رہائش کی سہولت نہ تھی جب افشاں نے شہر میں مکان تلاش کرنا شروع کیا تو اس سے پوچھا گیا۔

''آپ ماتھے پر بندی نہیں لگاتی ہیں؟''

''میں بندی نہیں لگاتی'' افشاں جواب دیتی۔

''آپ کے گلے میں منگل سوتر بھی نہیں ہے۔''

''ہمارے یہاں منگل سوتر بھی نہیں پہنا جاتا۔ ویسے میں کنواری ہوں۔''

یہ سن کر افشاں سے کھرے کھرے لفظوں میں کہا گیا۔

''اب مکان ڈھونڈنے والیاں مکان ڈھونڈنے کے لیے بندی لگا کر اور منگل سوتر پہن کر نکلتی ہیں۔مگر جب نام پوچھو تو مسلم نام بتاتی ہیں۔آپ کا نام کیا ہے؟''

''افشاں'' افشاں اسے گھورتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

''افشاں'' پوچھنے والا مشکوک انداز میں دہراتا ہے پھر سوال کرتا ہے۔

''ہندو افشاں یا مسلمان افشاں''

''مسلمان'' افشاں جواب دیتی ہے۔

''سوری (Sorry) ہم مسلمان کو مکان نہیں دیتے۔ان کو بھی نہیں دیا جو ایک بار اپنی ساڑھی میں چھاتی کے اوپر پیتل کا کمل کا پھول لگا کر آئی تھیں۔''

یکا یک وہ اپنے خیالوں سے باہر نکلا، بیٹی کے ہاتھ سے چائے لی اور اس سے کرائے کے مکان کے مسئلے پر بات کرنے لگا۔ بیٹی نے بتایا کہ اچھی لوکیلیٹی میں نہیں مل رہا ہے، وہاں پہلے کے رہنے والے مسلمان بھی کروٹیں بدل رہے ہیں اس لیے اب افشاں کا ارادہ اردو اخبار پڑھنے والوں کے گندے محلوں میں مکان تلاش کرنے کا ہے۔

وقت گزر رہا تھا

نہ تو وہ

نہ اس کی بیٹی

نہ بیوی

نہ اس کے رہبر، بزرگ اور دوست وقت کو گزرنے سے روک سکتے تھے۔حالانکہ وہ سب جانتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ مشکل سے ایک فیصدی مسلمان ہی انگریزی کا اخبار پڑھ رہا ہے، اس لیے وہ نہیں جانتا تھا کہ دنیا کہاں پہنچ گئی ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا ہر دن صبح ہوتی ہے۔ جب صبح ہوتی ہے تو گھر کی کنڈی کھڑکھڑائے جانے کی آواز آتی ہے، اخبار والا اخبار ڈالنے آیا ہے پھر کال بیل بجتی ہے، اس بار دودھ والا ہے۔ پھر دروازے پر پکار ہوتی ہے۔ کڑکڑاتی ہوئی میں قرأت کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔

''سلّو میاں''

پکار پر دروازہ کھولا جاتا ہے تو ایک گاڑھا اور ثقیل سا ''سلام علیکم'' فضا میں گونجتا ہے، آدھے سوتے آدھے جاگتے گھر میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ سلّو جلدی جلدی وضو کرتا ہے پھر گھر کے کونے کھدرے میں مڑی تڑی رنگ شکستہ ٹوپی تلاش کی جاتی ہے جس کو سر پر منڈھنے کے بعد منڈھنے والے کا چہرہ ہی بدل جاتا ہے۔ آدھی پیشانی ٹوپی کے نیچے چھپ جاتی ہے وہ ہونق سا مولوی کے سامنے بیٹھا ہے، سیپارہ کھول کر اور سر کو آگے پیچھے جھٹکا دے کر اور سیپارے کی سطروں پر انگلی دوڑا کر جھوم جھوم کر اسے پڑھتا ہے لیکن اتنی محنت کے بعد بھی اس کے معنی نہیں سمجھ پاتا اور وقت ہے کہ گزرتا رہتا ہے۔ پڑھنے والے کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں، منہ کھلا رہتا ہے، حلق آوازیں نکالنے کا کام کرتا رہتا ہے۔ ہدایتیں سننے کے لیے کان کھلے رہتے ہیں اور وقت ہے کہ رینگتا رہتا ہے اور سلّو کے کھلے کانوں میں مولوی اپنے دیرینہ خوف انڈیلتا رہتا ہے۔

''یاد رکھو مسلمان کے گھروں میں دیوالی کے چراغ جلیں تو ان کے دھوئیں کی بُو سے رحمت کے فرشتے گھر میں نہیں آتے۔''

اگر سلّو کے دل میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ وہ معلوم کرے کہ رحمت کے فرشتے کیسے ہوتے ہیں، گورے ہوتے ہیں یا کالے تو بھی وہی مولوی صاحب کی ہیبت میں ان سے پوچھ نہیں پاتا پھر ہولی کا دن آتا ہے۔ ماں سلّو سے سر درد دور کرنے کی گولی محلّہ کے کیمسٹ کی دوکان سے منگاتی ہے تو سلّو گھر سے باہر نکلنے کو منع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے میرے بدن پر ہولی کا رنگ پڑ گیا تو بدن کا اتنا حصّہ دوزخ میں جلایا جائے گا۔ انٹرنیشنل ہوٹل میں منیجر کی پوسٹ پر ملازم بہن کو جب اپنے بھائی کے دل میں بھرے خطروں کی خبر ہوتی ہے تو وہ آبدیدہ ہو جاتی ہے باپ کو STD کرتی ہے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد باپ سے پوچھ بیٹھتی ہے۔

''ابو کیا ہم دوسروں سے خوفزدہ رہتے رہتے اب خود سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتی ہے کہ کیا رحمت کے وہ فرشتے ابھی تک زندہ ہیں جن کا دیوالی کے چراغوں کے دھوئیں میں دم گھٹتا ہے۔ وہ بیٹی کی باتیں خاموشی سے سنتا ہے اور اس کو یہ بھی نہیں بتاتا کہ وہ روز ہی اپنے لکھنے کی میز پر بیٹھ کر صبح صبح کچھ لکھتا تھا لیکن وہ حیران ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے وہ کچھ سوچ نہیں پا رہا۔ اسے بار بار ایسا لگنے لگتا ہے جیسے کمرے کے کسی کونے سے کلورین کی زہریلی گیس رِس رِس کر نکل رہی ہے جوان کے بیٹے اور بیوی کو سیریا کے مظلوموں کی طرح مار دے گی۔ اس کو عبدالکریم ٹھیکیدار یاد آرہے تھے ان کی سرخ آنکھیں اور اندر کا ابلتا ہوا وہ بے نام غصہ یاد آرہا تھا جس نے ان سے سارے الفاظ چھین کر ان کی جگہ ایک موٹی سی اور گندی سی گالی رکھ دی تھی۔ وہ بیٹی سے نہیں بتا پا رہے تھے کہ ابھی کل ہی عبدالکریم ٹھیکیدار آئے تھے۔ غصے میں آنکھیں لال کر کے کہہ رہے تھے۔

''کوئی حرامی قرآن شریف کی وہ آیت یادنہیں دلاتا جس میں اللہ پاک اپنے بندوں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ یہ ہمارے لیے بہت آسان تھا کہ ہم تم سب کوانسانوں کے ایک ہی گروہ میں پیدا کرتے مگر ہم نے مختلف گروہوں میں یہ دیکھنے کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم میں سے کون نیکی کرنے میں سبقت لے جاتا ہے۔ٹھیکیدار پھر تلملا کر بولے''لیکن پروفیسر صاحب ہماری نیکی تو یہ ہے کہ اگر تم جنگل کے ٹھیکیدار ہوتو خوب لکڑیاں چراؤ۔میں خوب لکڑیا چراتا ہوں۔ساگوان اور صندل پر ہاتھ مارتا ہوں۔خوب رشوتیں دیتا ہوں۔لڑکی کو جو جہیز دوں گا اسے دیکھ کرلوگوں کی پوں پوں پھٹ جائے گی۔ یہ ہے دنیا۔اس دنیا کی تو سالی ماں کا بھو۔۔۔اس بار عبدالکریم نے دنیا کو پہلے سے زیادہ موٹی گالی دی۔پھر زمین پر تھوکا اور انگوچھے سے منہ پونچھ کر چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد بیٹی نے جب فون پر باپ کی خیریت پوچھی تو اس کے دل میں آیا کہ وہ افشاں سے معلوم کرے کہ کیا کلورین گیس کئی طرح کی ہوتی ہیں؟اور کیا ریاست(State)ہی نہیں بلکہ اب تو بڑی بڑی نجی تنظیموں کے پاس کلورین کی زہر پاشی کے لیے مخصوص ہیلی کاپٹر ہوا کرتے ہیں۔لیکن یہ باتیں پوچھنے کا اسے موقعہ نہ ملا۔اس دن اسے ڈاک سے ایک البم ملا تھا جو پولش ایمبیسی میں کام کرنے والے ایک دوست نے اس کو بھیجا تھا۔اس البم میں دوسری جنگ عظیم کے درمیان یہودیوں پر کیے گئے جرمنیوں کے وحشت ناک مظالم کی تصویریں تھیں۔ان سینکڑوں لوگوں کی تصویریں جن کو ایک ہی وقت میں برہنہ کر کے گیس چیمبروں میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔بیٹی کے فون سے فراغت پا کر وہ البم کے موٹے اور چکنے صفحات کی ورق گردانی کرتے کرتے بوجھل سانسوں کے ساتھ سو گیا۔

صبح ہوئی تو اس کے کانوں میں مولوی بشیر الدین کی کرخت آواز سنائی دی اس کی آنکھ کھل گئی۔مولوی صاحب سلّو کو تخت پر اپنے سامنے بٹھائے ہوئے تھے۔گرمی بہت تھی پاس ہی سلّو کی والدہ مولوی صاحب کو پنکھا جھل رہی تھی۔بشیر الدین سلّو کو سمجھا رہے تھے''مسلمان شریعت کو بھول گئے اسی لیے مسلمانوں کے پاس نہ عزت ہے اور نہ مال۔یہ سامان تو انہیں جنت میں ہی ملے گا بشرطیکہ مسلمان شہادت کا راستہ اختیار کریں۔

سلّو بشیر الدین کو اپنے بدن کے ہر روئیں کی آنکھ سے گھور رہا تھا، سماعت کی آخری حدوں تک سن رہا تھا اور پورے انہماک سے استاد کی ذات کو اپنے اندر قطرہ قطرہ پی رہا تھا۔سلّو کا باپ اُسے اپنے بستر سے ٹکٹکی باندھے دیکھ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو'' وہ فون پر مخاطب ہوا۔دوسری جانب سے اس کی بیٹی افشاں کی آواز سنائی دی۔

''ڈیڈی۔مجھے اردو اخبار پڑھنے والوں کے گندے محلے میں کرائے پر ایک فلیٹ مل گیا ہے مگر وہاں کل جوئے خانے کی گلی میں ایک قتل ہوگیا ہے۔ابھی تھوڑی دیر پہلے کرفیو بھی لگ گیا ہے۔

''کیوں؟'' باپ نے تشویش کے ساتھ پوچھا''کیا مقتول ہندو تھا؟''

''نہیں'' افشاں نے جواب دیا''قاتل اور مقتول دونوں ہی مسلمان ہیں مگر ایک شیعہ ہے اور ایک سنی۔جلدی میں ہوں پھر بات کرونگی۔''اس کے بعد فون کٹ گیا۔

افشاں کے فون نے اسے پریشان کر دیا۔وہ اپنی بیٹی کو بہت چاہتا تھا، بڑی احتیاط سے اُس نے افشاں کو پالا تھا۔بیٹی کی ذراسی لغزش پر پہروں تاسف میں ڈوبا رہتا۔اسے یاد آیا کہ افشاں بارھویں درجے میں پڑھ رہی تھی۔ایک بار گوالیار کا ایک مندر دیکھنے کے لیے افشاں اس کے ساتھ تھی۔اس موقع پر افشاں کے مرحوم دادا بھی ہم سفر تھے۔مندر میں ایک مورتی کو دیکھ کر افشاں نے کچھ برا سا منہ بنایا۔اُس کے دادا نے اُسے ایسا کرتے دیکھ لیا اور کچھ فکرمند سے ہو گئے۔پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے اپنے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''میرا خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے قدیم ہندوستانی تہذیب اور علم الاصنام کو نظرانداز کر کے اچھا نہیں کیا۔انڈونیشیا اور ایران کو دیکھو۔وہاں کے مسلمان اسلام سے پہلے کی اپنی تہذیبی روایتوں پر بڑا فخر کرتے ہیں۔اچھا ہوگا اگر تم اپنی لڑکی کو اس منحوسیت سے بچا کر رکھو۔''

شاید اس کے باپ کی ناک بہت زود حس تھی وہ کسی بھی خطرناک بُو کو بہت جلد محسوس کر لیتی تھی۔اس کے بعد سے وہ اپنے باپ کی نصیحت کو کبھی نہیں بھولا۔

افشاں کے فون نے اس کے باپ کے دل میں زبردست ہلچل پیدا کر دی تھی۔شاید اس کا وہم ہی تھا کہ اسی وقت فضا میں دور کہیں کسی ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سی محسوس ہوئی اور اس کے نتھنے کسی خطرناک بُو کے احساس سے پھڑ پھڑانے لگے۔وہ ہتھیلیوں سے دونوں آنکھوں کو رگڑ کر آسمان میں اس ہیلی کاپٹر کو تلاش کرنے لگا، یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ ہیلی کاپٹر اپنی بناوٹ میں اُن جیسا تو نہیں جو کلورین گیس کی زہر پاشی کرتے ہیں اور چوہوں کی طرح ننھے ننھے بچوں کو مار دیتے ہیں۔اس کی نظر میں افشاں ابھی بھی ننھی سی بچی ہی تھی۔پھر یہ ہوا کہ رات آئی۔رات آئی تو اپنے ساتھ ایک نیا درد لے کر آئی۔کہیں ایک پھوڑا تھا جو اندر ہی اندر ٹپک رہا تھا۔سلّو کے باپ کی بے چینی اب بہت بڑھ چکی تھی، بار بار دانتوں سے ہونٹوں کو چبا رہے تھے، سامنے عبدالکریم ٹھیکیدار بیٹھے تھے۔کمرے میں منحوس اور مردار خاموشی چھائی تھی۔کوئی بڑا طوفان آنے کو تھا۔

''ایک بار پھر سوچ لو''ٹھیکیدار نے خاموشی توڑی۔سلّو کے باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔''وہ کہے گی تم لڑکی کو تو خراب کر ہی چکے ہو، اب لڑکے کو تو اللہ رسول سے محروم نہ کرو پھر تم کیا جواب دو گے۔''اُس نے دو پل عبدالکریم کو گھورا پھر بولا۔

باقی صفحہ۲۳پر ملاحظہ کیجیے

''گنجِ معنیٰ''

لا الٰہ الاّ اللّٰہ

زباں سے اپنی کہو لا الٰہ الا اللہ
خلوصِ دل سے پڑھو لا الٰہ الا اللہ

چلو مدینہ چلو لا الٰہ الا اللہ
یہ گنگناتے چلو لا الٰہ الا اللہ

یہ بار بار لِکھو لا الٰہ الا اللہ
یہ بار بار پڑھو لا الٰہ الا اللہ

اِسے تو کان ہی کیا جسم سارا سُنتا ہے
سُنائی دیگا سُنو لا الٰہ الا اللہ

زباں پہ لے کے ترانہ یہ گنجِ معنیٰ کا
ہمارے ساتھ چلو لا الٰہ الا اللہ

سفر طویل ہے جانا سفر پہ ہے سب کو!
قدم بڑھاؤ بڑھو لا الٰہ الا اللہ

بلاوا آنے سے پہلے تمہیں بھی مولا کا
اِسی سے خوب سجو لا الٰہ الا اللہ

یہ ساری رونقیں رعنائیو کا مخزن ہے
یہ راز جان بھی لو لا الٰہ الا اللہ

اِسی کی گونج ہے عالم تمام میں انجم
نظر سے اپنی لِکھو لا الٰہ الا اللہ

حفیظ انجم کریم نگری
(بھارت)

نعت

اک نظر آپ ﷺ کی سرکار اگر ہو جائے
شاخ جو خشک ہے بڑھ کر وہ شجر ہو جائے

ذاتِ اقدس ﷺ پہ بڑا خاص کرم ہے رب کا
بارِشِ نور ہو جس سمت نظر ہو جائے

دشمنوں کا تو کوئی وار نہیں چل سکتا
آپ ﷺ کا نام اگر میری سپر ہو جائے

ان ﷺ کو بھیجوں گی دُرودوں کے ہزاروں گجرے
''رخ جو طیبہ کی ہواؤں کا اِدھر ہو جائے

ہر قدم پر جو مجھے آپ ﷺ کا ہی ساتھ ملے
کتنی پُر نور مری راہ گزر ہو جائے

خواب میں ہی میں جمالِ رُخِ زیبا دیکھوں
کاش نعتوں میں مری اتنا اثر ہو جائے

ہو مدینے میں سبیلہؔ جو میسر رہنا
میری ہر شام کا عنوان سَحر ہو جائے

سبیلہ انعام صدیقی
(کراچی)

چھجو بھگت

نند کشور وکرم

(دہلی، بھارت)

چھجو بھگت کی ایثار و خدمت اور بھگتی بھاؤنا کی کہانی پنجاب میں شاید ہی کوئی شخص ہو جس نے نہ سُنی ہو۔ یہ کہانی مدتوں سے پنجاب کے گھر گھر میں سنی اور سنائی جاتی رہی ہے جس سے اس نے ایک لوک کتھا کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور سارے شہر میں وہ ایک شریف، ایماندار اور مثالی انسان کے طور پر مشہور ہو گیا تھا اور اپنی عبادت گزار زندگی، ایمانداری اور جذبۂ خدمت کی بدولت اس کا ہر جگہ چرچا رہتا تھا۔ شہر میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو اُس کے نام اور کام سے واقف نہ ہو۔ اُس نے شہر کے بڑے چوک میں ایک سبیل لگا رکھی تھی جہاں سے گزرنے والے افراد کو پانی پلا کر وہ ان کی تشنگی بجھاتا اور ثواب کماتا تھا۔ شہر کے بیچوں بیچ اس کی سبیل لق و دق صحرا میں ایک چشمے کی حیثیت رکھتی تھی جہاں سے گزرنے والے تھکے ماندے اور پیاسے راہگیر ٹھنڈا پانی پی کر اُس کی بےلوث خدمت پر اُسے دعائیں دیتے ہوئے اپنی راہ لیتے تھے۔

چھجو بھگت خدا ترس، ایماندار، ایشور کی عبادت میں مست انسان تھا اور اس کی ایک اور خاصیت یہ بھی تھی کہ شہر میں جب بھی کوئی شخص راہی ملک عدم ہوتا تو وہ اُس کے میت میں صرف شامل ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ کھڑتالیں ہاتھ میں لئے انہیں بجاتا اور ناچتا گاتا آگے آگے چلتا تھا اور وہ سوگواروں کو بھی ڈھارس بندھاتے ہوئے تلقین کرتا تھا کہ ارے تم روتے کیوں ہو۔ یہ انسان تو اس دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں سے نجات پا کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا ہے۔ روؤ نہیں اور اس کے سورگ سدھارنے پر اسے خوشی خوشی وداع کرو۔

چھجو لڑکپن میں ہی کوٹ دوار کے کسی پہاڑی گاؤں سے یہاں شہر میں آکر ایک دیالو سیٹھ رام پرشاد کپور کے ہاں ملازم ہو گیا تھا۔ وہ منہ اندھیرے اُٹھ کر سیٹھ جی کے گھر کے کام کاج میں لگ جاتا۔ پہلے وہ گھر کی صاف ستھرائی اور جھاڑو پونچھے کا کام سرانجام دیتا۔ پھر نہا دھو کر قریب ہی ڈیری سے بھینس کا دودھ لاتا۔ پھر وہ رسوئی میں جا کر گھر والوں کے لئے کھانا تیار کرتا اور پھر انہیں کھلا پلا کر سیٹھ جی کے پاؤں دبانے پر جُٹ جاتا۔ اور یہی دستور شام کا بھی تھا۔ وہ شام پانچ بجے کے قریب چائے تیار کرتا اور گھر کے سبھی افراد کو چائے پلا کر سیٹھ جی کو چائے پلانے کے بعد پھر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتا۔ اسے اس طرح کام کاج میں مصروف دیکھ کر سب گھر والو ں کو اس پر ترس آنے لگتا کہ بیچارہ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح کام میں جٹا رہتا ہے اور ایک لمحہ بھی آرام سے نہیں بیٹھتا۔ کبھی سیٹھ جی یا سیٹھانی جی اسے دم بھر آرام کے لئے کہتے تو جواب دیتا ''بابو جی ساری رات پڑی ہے سونے کے لئے۔ بس آپ کو کھانا کھلا کر سو جاؤں گا۔ اور ہوتا بھی یہی تھا، وہ رات نو بجے تک گھر والوں کو کھانا کھلا کر پھر سیٹھ جی کے پاؤں دباتا اور جب وہ گہری نیند میں خراٹے بھرنے لگتے تو وہ چپکے سے اُٹھتا اور اپنی کوٹھری میں جا کر سو جاتا اور اپھر اگلے دن صبح سویرے اُٹھ کر اپنے روزمرہ کے کاموں میں جُٹ جاتا۔

......اور اسی طرح وقت کی چکی چلتی رہی۔ صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتے ہوتے بیس سال بیت گئے۔ اور آخر ایک دن سیٹھ جی اتنے بیمار پڑ گئے کہ اُن کے بچنے کی امید نہ رہی اور جب انہیں احساس ہو گیا کہ اب وہ چند دن کے ہی مہمان ہیں تو انہوں نے چھجو رام کو بُلایا۔ وہ اُس کی ایمانداری اور خدمت گزاری سے بے حد متاثر تھے لہٰذا انہوں نے اس سے پوچھا۔ ''چھجو بیٹا! مَیں تیرے کام سے بہت خوش ہوں اور چاہتا ہوں کہ مرنے سے پیشتر تیرے لئے کچھ کر جاؤں تا کہ میرے بعد تو اِدھر اُدھر در در کی ٹھوکریں نہ کھائے اور آرام سے زندگی گزار سکے...... بتا تیری کیا خواہش ہے۔؟''

سیٹھ جی کی بات سُن کر چھجو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولا بس بابو جی مجھے آشیرواد دیجیے۔ اتنا ہی کافی ہے۔''

مگر جب سیٹھ جی نے بار بار اصرار کیا تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر بڑی عاجزی و انکساری سے کہا۔ ''مالک! میری خواہش ہے کہ میں اس شہر کے بڑے چوک میں سبیل لگا کر لوگوں کو پانی پلایا کروں۔ اگر آپ سے ہو سکے تو اس کا انتظام کر دیں۔ سیٹھ نے اُسے صرف سبیل ہی نہیں کھول دی بلکہ اپنی جائداد میں سے ایک چھوٹا سا مکان بھی اُس کی بود و باش کے لئے اُس کے نام کر دیا۔

بس پھر کیا تھا اُس کے من کی مراد پوری ہو گئی۔ جب شہر میں رہنے کا ٹھکانہ مل گیا تو وہ گاؤں سے اپنی بیوی اور اور پانچ سال کے بچے کو بھی گاؤں سے لے آیا جو زیادہ تر اپنے گاؤں میں ہی رہتے تھے اور صرف چند بار ہی دس پندرہ دنوں کے لئے اُس کے پاس شہر آئے تھے ورنہ وہ زیادہ تر اکیلا ہی سیٹھ جی کے ہاں رہا کرتا اور گھر کے کام کاج میں مصروف رہتا تھا۔ اب جب سیٹھ نے چھوٹا سا مکان رہنے کو دے دیا اور سیٹھ جی بھی نہ رہے تو وہ اپنے بیوی اور بچے کو لے آیا اور وہ تینوں سکون و شانتی سے اس چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے اور اسی طرح وقت کا پرندہ اُڑتے اُڑتے بہت دُور نکل گیا۔

مگر برسوں گزر جانے پر بھی اُس کا پانی پلانے کا معمول جاری رہا۔ وہ صبح آٹھ بجے اپنی سبیل پر آکر بیٹھ جاتا اور شام آٹھ بجے تک بیٹھا پیاسوں کی تشنگی بجھاتا رہتا۔ ہاں جب بھی شہر میں اُسے کسی کی وفات کی خبر ملتی تو وہ دو چار گھنٹوں کے لئے سبیل پر کسی کو بٹھا کر یا سبیل کو کھلا چھوڑ کر کہ لوگ خود بخود پانی پی کر پیاس بجھا لیں، موت والے گھر پہنچ جاتا اور جب ارتھی کو شمشان

گھاٹ لے جایا جاتا تو وہ آگے آگے کھڑتالیں بجاتا اور پربھو کے بھجن گاتا اور لوگوں کو بھی سوگ کرنے کے بجائے اُس کی آتما کی شانتی کے لئے بھجن کیرتن کرنے کی تلقین کرتا۔

وہ ہمیشہ اس موقعے پر لوگوں کو نصیحت کرتا۔''موت روؤ۔موت بر حق ہے۔آخر کار سب کو ایشور کے پاس جانا ہے۔اور ایشور سے ملن کے اس موقع پر تم اُداس کیوں ہوتے ہو۔تمہیں چاہیے کہ مرنے والے کی روح کی شانتی کے لئے پرارتھنا کرو اور اُسے خوشی خوشی وداع کرو۔''

لوگ اُس کی اس بے لوث خدمت اور لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہونے اور اچھے اپدیش کرنے پر دل ہی دل میں اُس کی تعریف و توصیف کرتے کہ دیکھو کیسا نیک انسان ہے کہ جب لوگوں پر سوگ اور ماتم کے سائے منڈلاتے ہیں تو وہ اُن کے غم میں شریک ہو کر اُنہیں تسکین اور دلاسہ دینے کے لئے فوراً پہنچ جاتا ہے۔مگر پھر ایک دن اچانک ایک ایسا حاشہ ہوا کہ اُس کا پچیس سال کا جوان بیٹا' آنند' جس کی ابھی حال ہی میں شادی ہوئی تھی ،ایک بس حادثے میں راہی ملک ہو گیا۔

یہ دلدوز خبر چھجو کے لئے نا قابلِ برداشت تھی۔

اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس پر کوہِ گراں گرا کر پاش پاش پاش کر دیا ہو۔

بیٹے کی موت نے اس کے سینے میں ایسا تیر مارا تھا جس نے اس کے دل کو چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔

وہ چھجو جو لوگوں کو اُن کے کسی عزیز کی موت پر تشفی و تسلی دیتا تھا آج اندر سے ٹوٹ سا گیا تھا۔

مگر پھر بھی وہ گیانی دھیانی شخص تھا وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔اُس نے صبر و برداشت کے لبالب بھرے پیالے کو چھلکنے نہ دیا حالانکہ یہ بہت ہی مشکل کام تھا۔آناً فاناً یہ دردناک خبر جنگل کے آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔

لوگ یہ افسوسناک اور دلدوز خبر سن کر جوق در جوق اُس کے گھر کے باہر جمع ہونے لگے۔سب کے چہروں سے دکھ اور مایوسی جھلک رہی تھی اور بعض کی آنکھوں سے آنسو گنگا جمنا کی طرح بہہ رہے تھے۔

ہر ایک کی زبان پر اس کے بوڑھاپے کی عمر میں ٹوٹی قیامت کا ہی ذکر تھا۔اور وہ اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے۔''بیچارہ بھگت چھجو کتنا نیک دل، خدا ترس اور لوگوں کی سیوا کرنے والا انسان تھا۔مگر افسوس کہ بوڑھاپے میں اُسے یہ دن دیکھنا پڑا۔''

''آہ قدرت کے کھیل بھی کیا نیارے ہیں۔ بیچارے کے بوڑھاپے کی لاٹھی ٹوٹ گئی۔ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی نہ رہا۔''

''گھر میں جوان بہو ہے ،اُس کی بھی زندگی برباد ہو گئی۔کیسے بیوگی کی اتنی طویل عمر کاٹے گی۔''

''اور اُس کی بوڑھی ماں یہ صدمہٗ جانکاہ کیسے برداشت کرے گی۔وہ تو اُس کے بوڑھاپے کا آخری سہارا تھا۔وہ صدمہ کیسے برداشت کرے گی۔؟''

لوگوں کا خیال تھا کہ اپنے بیٹے کی اس سانحہ ارتحال پر وہ میت کے آگے کھڑتالیں لے کر نہیں چل پائے گا۔مگر چھجو بھگت اندر سے شکستہ شکستہ ہو جانے کے باوجود بڑے صبر و تحمل سے بیٹھا آنے والوں کو شانت رہنے اور صبر سے کام لینے کی نصیحت کر رہا تھا۔جو کوئی تعزیت کے لئے آتا تو وہ اُسے بڑے شانت سبھاؤ سے کہتا۔''ارے بھائی روتے کیوں ہو۔اُس کی اتنی ہی عمر لکھی تھی۔وہ بھگوان کے پاس سے آیا تھا۔بھگوان کے پاس چلا گیا۔روؤ نہیں۔اُس کی چیز تھی اُس نے لے لی۔رونے سے کچھ حاصل نہیں۔بس بھگوان کو یاد کرو یہ سب اُس کی لیلا ہے۔''

لوگ اُس کے صبر و استقلال پر عش عش کر اُٹھتے۔کتنا مہان شخص ہے کہ جوان بیٹا چھن گیا ہے مگر وہ پھر بھی بڑے صبر و تحمل سے بیٹھا ہے اور رونے کے بجائے لوگوں کو شانت رہنے کی تلقین کر رہا تھا کہ جو چیز ہماری نہیں تھی اُس پر رونا کیسا؟

مگر گھر کے اندر کہرام مچا ہوا تھا۔چھجو بھگت کی بیوی اور بہو نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔اُن کے رونے اور بین کرنے سے باہر کھڑے دکھ میں ڈوبے افراد کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں مگر بھگت چھجو اب بھی لوگوں کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہا تھا۔

میت میں شریک ہونے آئے لوگوں کو یقین تھا کہ آج شاید وہ کھڑتالیں نہ بجا پائے اور بھجن کی امید کرنا تو نادانی ہی ہے۔مگر ایسا نہ ہوا۔جب میت تیار ہو گئی تو اُس نے اندر سے اپنی کھڑتالیں منگوائیں اور حسبِ معمول ارتھی کے آگے آگے چل کر انہیں بجانے کے ساتھ ساتھ بھجن کیرتن بھی کر رہا تھا۔لیکن تب لوگوں نے محسوس کیا کہ آج چھجو بھگت کے کھڑتالوں میں وہ شدت نہیں تھی......وہ زور نہیں تھا اور نہ اس کے بھجنوں میں وہ سرور و مستی تھی اور نہ وہ جوش و ولولہ جو وہ اپنی کھڑتالوں اور بھجنوں سے پیدا کیا کرتا تھا۔آج نہ اُس میں مستی تھی نہ وجد و سرور کی کیفیت۔اُس کی آواز میں سازِ شکستہ کی آواز سنائی دے رہی تھی جس میں غم تھا، درد تھا سوز تھا اور وہ آواز کبھی کبھی بیچ میں رُک جاتی تھی اور اُس کا دل انتہائی کوشش کے باوجود بھر آتا۔جیسے وہ وہ بڑی کوشش سے اپنے اندر کے غم و درد کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجبوراً ایک رسم پوری کر رہا تھا اور کچھ نہیں۔شاید وہ اپنے اندر کے بحرِ غم کو اندر ہی اندر رو کے ہوئے تھا اور حسبِ معمول کھڑتالیں بجائے جا رہا تھا تبھی پیچھے سے کسی نے سرگوشی کی۔

''آج بھگت چھجو کی کھڑتالوں اور بھجنوں میں وہ جوش و جذبہ نہیں جو ہم برسوں سے سُن رہے تھے۔''

پہچان

وقار بن الٰہی
(اسلام آباد)

آج وہ پہلی بار تو واک کرنے نہیں نکلا تھا' جب سے وہ ریٹائر ہوا تھا' اُس کا یہ معمول تھا لیکن پرانے اور طے شدہ راستے پر چلتے ہوئے اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ جب بھی وہ کسی گھنے اور سایہ دار درخت کے نیچے سے گزرتا ہے تو ٹہنیوں میں چھپے ہوئے کوے بہت شور مچاتے ہیں۔ایک درخت کے سائے میں رُک کر اُس نے سوچا' یہ شور کیا اُس کے گزرنے پر ہی مچایا جاتا ہے یا پھر جو کوئی بھی گزرے اُس کا استقبال اِسی طرح کیا جاتا ہے۔قدرے اِنتظار پر اُسے خاصی مایوسی ہوئی کہ اُس راستے پر کوئی گذرا ہی نہیں' بھلا کووں کا اِمتحان کیسے لیا جاتا ۔پھر اِس ذہنی اُبال کا کھوج لگانے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہ تھی' آخر کو ملازمت سے سبک دوشی کا یہ دور ایسی ہی اُلٹی سیدھی باتوں سے اُلجھنے کا ہی تو دور ہوتا ہے۔

واک پر وہ چل تو پڑا لیکن سوچوں پر جیسے کوے قابض ہو بیٹھے۔اُسے یاد آیا کچھ ہی عرصہ پہلے بیگم سے خاصی ڈانٹ سہنی پڑی تھی کہ وہ واک کے دوران یہ احتیاط کیوں نہیں کرتا کہ محفوظ راستے پر چلے۔اب وہ یہ تکرار تو نہیں کر سکا کہ اول تو اُسے ایسے کووں کی پہچان بالکل نہیں ہے' جو اُس کا لحاظ کریں اور اپنے پیٹ کے بوجھ کو کسی دوسرے وقت پر ہلکا کرنے کا پروگرام بنائیں۔اور پھر کوے تو کوے ہی ہیں بھلا اُسے کیوں گھاس ڈالیں گے۔گھاس تو اُسے اپنے دفتر میں بھی بڑے بڑے جغادری نہیں ڈالتے تھے' بھلا کوے کیا سنیں گے۔اور دفتر کا ساتھ چھوٹے بھی تو ایک مُدت ہو گئی تھی۔دوسرے اُسے یہ پہچان بالکل نہیں ہے کہ کون سا راستہ محفوظ ہے اور کون سا غیر محفوظ۔راستہ تو راستہ ہی ہوتا ہے' یہ ہم ہی ہیں جو راستوں کو محفوظ یا غیر محفوظ بناتے ہیں۔پھر کوے بھی خوب ہیں' حرام ہے جو کسی کی ہیئت میں تبدیلی آ جائے۔کالے ہیں تو سارے کے سارے ہی کالے ہوں گے۔یہ تو حضرتِ انسان کو ہی شرف حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے مطابق رنگ بھی بدل لیتے ہیں اور حُلیہ بھی۔پتہ ہی نہیں چلتا' دِل کا کالا کون ہے اور سفید کون۔؟ یا دِل والے کے پاس دِل ہے بھی کہ نہیں۔

اُسے یاد آیا' ایک بار وہ کسی درخت کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ ایک نشانے کے پکے کوے نے تاک کر اس صفائی سے اپنا پیٹ ہلکا کیا کہ سارا گند عین اُس کے سر کے گنے چُنے بالوں میں آ کر لیٹ گیا' اِدھر اُدھر اُچھلا کودا نہیں۔اُس نے سر اُٹھا کر غصے بھری نظروں سے کوے کی طرف دیکھا جو اُس کے سر اُٹھا کر دیکھتے ہی اُڑ گیا۔وہ دیر تک اِس گند کو سر پر اُٹھائے گھومتا رہا' خشک ہو جائے تو وہ صفائی کے بارے میں سوچے۔

اُس نے غور کیا تو اُس کی سوچیں جیسے ایک ہی نکتے پر آ کر رُک گئیں کہ پہلے بھی تو کوے اِن درختوں کو آباد کئے ہوئے تھے لیکن اُسے یہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُن کی تعداد اِتنی ہی تھی اور وہ اِتنی ہی یک جہتی سے شور مچایا کرتے تھے۔اُسے تو یہ یاد تھا کہ کوے تھے تو' پر کم تھے اور شور بھی مچاتے تھے لیکن اُن کے شور میں اِتنی یک جہتی نہیں تھی لیکن اب۔۔۔کوے بھی سیانے ہو گئے تھے اور شہر شہر اُن کے شور اور ڈاکے ڈالنے کی مصروفیات میں کمی یا زیادتی آ چکی تھی۔اُسے اپنے شہر کے کوے یاد آ گئے' پتہ نہیں بھوک یا کسی اور وجہ سے قدرے دُبلے پتلے دِکھائی دیتے تھے لیکن ایک بات ضرور تھی کہ بلا وجہ منہ نہیں مارتے تھے۔اِسی طرح بلا ضرورت شور بھی نہیں مچاتے تھے اور تھے بھی تو دُبلے پتلے' جیسے پیدا ہی بھوکے ہوئے ہوں لیکن بلا کے اکڑ باز' بلا کے اسمارٹ۔بھوک تو تھی ہی لیکن دیدوں میں ابھی پانی تھا۔اُسے آج تک یہ فلسفہ سمجھ نہیں آیا تھا کہ بھوکے کے ہاں اِتنی اَکڑ کیوں ہوتی ہے۔۔ایک اِس اتنے بڑے اور مشہور شہر کے کوے تھے جن کا جسم بھاری تھا اور گردن سے اوپر بالوں کی ایک جھاڑی یوں لٹکتی تھی جیسے اُن کی شناخت کے لئے یہ گُتھی اُنہیں علیحدہ سے عطا کی گئی ہو۔جب وہ ساتھیوں کو پکارنا چاہتے' اِس کی ضرورت اکثر رہتی تھی کہ معمولی سے لے کر بڑی سے بڑی گُتھی کو سلجھانے کے لئے اِکٹھے ہونے کو وہ اچھی طرح سمجھتے تھے' تو ایک درخت کی اونچی ٹہنی پر بیٹھ کر اِتنا شور مچایا جاتا کہ علاقے کے مکین بھی اپنے اپنے ڈربوں سے نکل کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے کہ چیل نے حملہ کر دیا ہے یا کسی دوسری آفت نے آن گھیرا ہے۔دیکھتے ہی دیکھتے جانے کہاں سے بیسیوں آ جاتے اور آتے ہی اِتنا شور مچاتے جیسے شہرِ اقتدار کے وہی والی وارث ہیں اور اُن کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے' اُسے وہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔خاص طور پر اگر ایک کے پنجوں کے درمیان کچھ پھنسا ہوتا تو پہلے تو وہ سارے ہی چھینا جھپٹی کی کوشش ضرور کرتے لیکن اگر مال اُس کے مظبوط پنجوں کی گرفت میں ہوتا تو دوسرے کسی نہ کسی شاخ پر بیٹھ کر اِنتظار کرتے جیسے دینے والا مہربان ہوا تو اُنہیں بھی جلد ہی کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔اِسی دوران اگر کوئی دو ٹانگوں والا انسان اُدھر آ نکلتا تو سب مل کر اِتنا شور مچاتے کہ ستانے والے کو بھاگنے میں ہی عافیت دکھائی دیتی۔مال پنجوں میں پھنسا ہو یا کسی بینک کی محفوظ تجوری میں' اُس کی حفاظت کی خواہش تو ہر کسی کو ہوتی ہے۔

بھوک کے معاملے میں اُن کی قدریں مختلف نہ تھیں بلکہ حضرت انسان کی طرح جیسے وہ بھی جنم جنم کے بھوکے تھے اور اب جو کھانے کے لئے ملا ہے تو اگلی پچھلی بھوک مٹا لینا چاہتے تھے۔کہیں اناج کا کوئی ٹکڑا دِکھائی دے جاتا تو ایک ہجوم اُس کی طرف لپکتا' کامیاب ایک آدھ ہی ہوتا اور وہ بھی پھرتی سے اپنا شکار لے کر درخت کی کسی اونچی ٹہنی پر بیٹھ کے اِطمینان سے مالِ غنیمت کو اپنے پنجے کے نیچے دباتا اور لمبی اور کالی چونچ سے ٹکڑا کاٹتا اُس کا مزا لیتا' اگر لوٹا ہوا مال تازہ ہوتا اور پنجے کی گرفت سے آزاد ہو کر نیچے کی طرف لپکتا تو وہ اُسے ہوا میں ہی کیچ کر لیتا' جیسے وہ بھی لنچ نہیں کر رہا' کرکٹ میچ کھیل رہا ہے۔اور اگر ٹکڑا باسی اور بدمزہ

ہوتا تو وہ اُسے جانے دیتا۔ جیسے باونڈری کی طرف جاتی ہوئی گیند کے پیچھے اندھا دھُند بھاگنے سے پہلے کھلاڑی ضرور سوچتا ہے' اُسے جو بھتہ ملتا ہے' وہ اِس بھاگ دوڑ سے کوئی مطابقت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اِسی لئے اکثر گیندیں باونڈری ہی کی خبر لاتی تھیں۔

اِس اہم شہر کے کووں میں ایک اور خوبی بھی تھی کہ ہر گھر کے آنگن میں اُگے ایک آدھ بڑے یا چھوٹے لیکن گھنے درخت کی کسی ٹہنی پر ایک دو ہر وقت موجود رہتے اور وہ ضرورت یا بلا ضرورت بس چلاّئے چلے جاتے جیسے اُن کے ذمے اِتنی ڈیوٹی ہی لگائی گئی ہے' بس چلاتے رہیں۔ اُن کی چیخ و پُکار اُن لوگوں کے ضرور کام آتی جنہیں دیر تک سونے کی عادت ہو۔ وہ دن چڑھے تک بستر پر اینٹھنے پر بھی جھنجھلا کر اُٹھتے اور اُٹھتے ہی کوشش کرتے' شور کو یا شور مچانے والے کو گولی مار دیں۔

کبھی کبھار کوئی چیل اکیلی یا اپنے میاں کے ساتھ اِس طرف آنکلتی تو وہ سب کے سب اپنا پُرانا ہتھیار آزماتے کہ سبھی مل کر شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے اور اُس وقت تک شور مچاتے اور چکر کاٹتے رہتے جب تک وہ گھُس بیٹھئے نو دو گیارہ نہ ہو جاتے۔ ایک دو بار اُن کے بڑے بوڑھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی' کیوں نہ اُن کے گھونسلوں میں گھُس کر اُن کے انڈوں کو ہی پار کر دیا جائے لیکن پھر بڑے بوڑھوں نے ہی اُنہیں آڑے ہاتھوں لیا' ہماری لڑائی بڑوں کے ساتھ ہے' بڑوں سے ہی دو دو ہاتھ ہوں گے۔۔۔ دوسرے' جس کام کو آپ اِتنا آسان سمجھ رہے ہیں' حقیقت میں ہے اُتنا ہی مشکل۔ ذرا اُن کے کسی ٹھکانے کو پہلے تلاش تو کر کے دِکھا دیجئے اور مل بھی جائے تو یہ سب مل کر اُس کے نزدیک پھٹکنا ہی ناممکن بنا دیتے ہیں۔ لگتا ہے' اُنہیں اِس قسم کی بستیاں یا گھر بار بسانے سے کوئی سروکار نہیں' روزگار کی تلاش میں جب دن رات ایک کرنے ہوں تو گھونسلے ہونے یا نہ ہونے سے فرق تھوڑی پڑتا ہے۔

اُسے یاد آیا' چند ہی دن پہلے جب وہ سیر کے لئے نکلا تھا تو اُسے کائیں کائیں کے شور میں قدرے اونچی اور پھٹی ہوئی کائیں کائیں نے چونکایا تھا۔ اُس نے دیکھا' قد قامت اور ڈیل ڈول میں قدرے بڑا اور پھولا ہوا کوا شریک ہو گیا تھا۔ اُس کے آبائی علاقے میں ایسے کووں کو' ڈوڈر کاں' کہا جاتا تھا۔ اِس پھولے ہوئے کوے کی آواز خاصی پھٹی ہوئی تھی۔۔۔ لگتا تھا' جب وہ کائیں کائیں کرتا تو دوسرے خاموش نہیں ہوتے تھے البتہ دوسروں کی چیخ و پُکار میں اُس کی آواز خاصی نمایاں ہو جاتی تھی۔ وہ اُن کا سردار وردار تو تھا نہیں نہ ہی دوسرے اُسے کوئی حیثیت دینے کو تیار بھی تھے۔ لیکن چند ایک کا یہ خیال ضرور تھا کہ اُسے آگے لگا دینے میں حرج بھی کوئی نہ تھا۔

دو چار دن پہلے اچانک ہی کوئی جیسے اُس کے خیالوں پر نشتر چلانے لگا' خاص طور سے یہ سوچ خاصا پریشان کر رہی تھی کہ سارے پرندے کیسے اپنے اپنے ساتھیوں کا خیال کرتے' ساتھ دیتے اور دُکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں' اور چڑیوں کا تو کہنا ہی کیا کہ چڑیا اور چڑے پہروں راز و نیاز میں مصروف رہیں گے لیکن کوے۔۔۔ اِس معاملے میں بھی مختلف ہی نہیں دشمن ثابت ہوئے ہیں۔ ایک تو دو شاید ہی کبھی ایک ساتھ بیٹھے دِکھائی دے جائیں اور اگر ایک ٹہنی پر بیٹھ بھی جائیں گے تو روٹھے روٹھے جیسے اُن کے درمیان جاری جنگ کبھی ختم نہیں ہو گی اور جونہی ایک کو موقع ملے گا وہ اُڑ کر کسی دوسری ٹہنی یا دوسرے درخت پر جا بیٹھے گا۔ جیسے مادہ اور نر کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا' ایسے ہی بچوں کو بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو بہ' کوے نہ ہوئے کوئی حل نہ ہونے والا سوال ہو گیا۔۔

کووں کا تماشا کرتے اور اُن کے غول منڈلاتے ہوئے دیکھتے دیکھتے اُسے آسٹریلیا کے کوے یاد آ گئے۔ عجیب بات تھی' اُسے پرتھ کے بازاروں میں گھومتے ہوئے دو روز گذرنے والے تھے لیکن حرام ہے جو کوئی پرندہ پر مارتا ہوا بھی دِکھائی دیا ہو۔ ہمارے ہاں تو یار لوگ پنجروں میں قید رکھنے کے اِتنے شیدائی ہیں کہ باقاعدہ دکانوں کی دکانیں قیدی پرندوں سے بھری ہوئی دِکھائی دیتی ہیں۔ اگلے روز ناشتہ کر چکنے کے بعد وہ گاڑی کے اِنتظار میں باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے درخت پر بیٹھا ہوا ایک پلا پلا یا پرندہ دِکھائی دے گیا۔ پروں کا رنگ زیادہ تر گُلابی ہی تھا' کہیں کہیں کالے اور سلیٹی رنگ کے پر بھی بیحد خوصورت لگ رہے تھے۔ ایک دو بار بولا بھی لیکن اُسکی آواز کوے جیسی تھی پر پھٹی ہوئی۔ اُس نے گاڑی کے آجانے پر ڈرائیور سے پوچھا۔

''یار' یہ کونسا پرندہ ہے۔'' ڈرائیور نے اپنی ٹھیٹھ انگریزی میں زبان کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی۔

''یہ آسٹریلیا کا کوا ہے'۔ اُسے حیرت ہوئی کہ کوا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ اڑوس پڑوس کے دوسرے چھوٹے بڑے شہروں میں اُسے جہاں کہیں بھی جانے کا اِتفاق ہوا' یہی گُلابی رنگ کے کوے ہی دِکھائی دئے۔ پتہ نہیں' اُن ملکوں اور شہروں کے باسیوں نے کووں کی عادات کے مطابق کون سے محاورے ایجاد کر رکھے ہوں گے۔۔ پھر اُسے خیال آیا' کوا کالا ہی ہو تو خوبصورت لگتا ہے' رنگ ڈھنگ بدل لے تو کون اُس پر توجہ دے گا۔ شاید اِسی لئے ہمارے بڑے بڑے نیتا ایک ہی ڈگر پر بس چلے جا رہے ہیں۔

اُسے واک کرتے اور کووں کے بارے میں سوچتے بلکہ کووں سے باتیں کرتے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ اِن سوچوں کا پٹارہ بند کرتے ہوئے وہ گھر کی سمت مُڑ گیا۔ ابھی وہ گھر سے چند قدم پیچھے ہی تھا کہ اچانک کووں کا ایک جم غفیر چیخ وُ پکار کرتا ہوا ایک بڑے اور چھتناور درخت کے اِرد گرد منڈلانے لگا۔ اُس کے علاوہ دوسرے راہ گیر بھی اپنی اپنی راہ جیسے بھول گئے اور رُک کر تماشا کرنے لگے۔ کوے مسلسل چیخ و پکار میں مصروف تھے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آخر کون سی اُفتاد آن پڑی ہے جو اُنہوں نے یوں آسمان سر پر اُٹھا لیا ہے۔ تعداد اور کائیں کائیں کے شور میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ لگتا تھا' دنیا بھر کے کالے کوے اپنے اپنے کام چھوڑ کر اِسی سمت چلے آ رہے ہیں۔

اچانک دوکوے آپس میں لڑتے ہوئے ایک درخت کی گھنی شاخوں میں سے نیچے سڑک کی طرف لپکے اور گرتے ہی نئے سرے سے جیسے اِس دنگل میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کے پر تو نوچ ہی رہے تھے لیکن دیر سے جاری اِس چھینا جھپٹی اور نوچا کھسوٹی میں اب جیسے وہ جان نہیں رہی تھی۔ اُن کے زمین پر گرتے ہی ایک تو پھرتی سے اُٹھا' سنبھلا اور پھر سے اونچی شاخ پر جا بیٹھا۔ دوسرے کے پاؤں جم نہیں رہے تھے' لڑکھڑاتے ہوئے اگر وہ دائیں گرنے والا ہوتا تو وہ اپنے بایاں پر پھیلا کر توازن ٹھیک کرنے کی کوشش میں گر گر جاتا۔ دیکھنے والے سوچ ہی رہے ہوتے کہ بس اب وہ گرا کہ گرا لیکن وہ گرتے گرتے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی طاقت اور ہمت جواب دے گئی وہ ایک طرف سر گرا کر جیسے قسمت کا لکھا قبول کرنے کو تیار ہو بیٹھا۔۔۔ اُسے وہ حاکم یاد آ گئے جو اپنی بادشاہت قائم رکھنے کے لئے سینکڑوں مروا دیتے ہیں لیکن جب اپنی باری آتی ہے تو ایک معمولی اور گندے بنکر میں چھپ کر سمجھتے ہیں' اُن کی جان بچ گئی۔۔۔ دوسرے تماشا اور ہلا شیری کرنے والے کووں کا چیخ چیخ کر حال بُرا ہوا تو وہ آہستہ آہستہ درخت کی گھنی ٹہنیوں کا سہارا لینے لگے لیکن چیخ وپکار میں کوئی کمی نہ آئی۔ تماشا کرنے میں بھلا کیا قباحت تھی' کوے تو رہے ایک طرف حضرتِ انسان بھی اِس شغل سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے تماشا کرنے والوں کا صبر جواب دے گیا اور ایک ہجوم اُس نیم مردہ کوے پر ٹوٹ پڑا۔ اب چیخ وپکار کی نوعیت بدل گئی تھی۔ پہلے اگر اُس کی حوصلہ افزائی کے لئے شور مچایا جا رہا تھا تو اب اِس کی ایک آدھ بوٹی پانے کے لئے آسمان سر پر اُٹھایا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں گرنے والے کوے کا صفایا ہو چکا تھا اور کووں کا ہجوم پل بھر میں جیسا اِکٹھا ہوا تھا' اُتنی ہی تیزی سے غائب بھی ہو گیا۔ پیچھے دو نہیں تو چار ایک کوے ہی رہ گئے اور اُن کی چیخ وپکار میں کوئی گِلہ یا کوئی فریاد تو تھی نہیں' ہاں کچھ حاصل نہ کر سکنے کا افسوس اور گِلہ ضرور تھا۔

اُس نے بھی یہ سارا تماشا وہاں کھڑے کھڑے دیکھا اور سوچا' ہم سے تو یہ پرندے اچھے جنہیں بُرے بھلے کی پہچان تو ہے۔

بقیہ: فریب سودوزیاں

''بے بی'' اسی سرد لہجے میں کہا گیا۔ یہاں انٹرس ہے' Exit نہیں۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔''

وہ واپس پلٹ کر آئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے بولی۔ ''مہربانی کر کے مجھ کو جانے دیجئے۔ میں آپ لوگوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ آپ لوگوں کا ایک ایک روپیہ میں ادا کر دوں گی۔''

''ایسے معاملے میں سودوزیاں کی کون پروا کرتا ہے۔'' جواب ملا۔ ''ہاں اس بات کا ملال رہے گا کہ ہمارا انتخاب غلط تھا۔''

اس نے وہیں کھڑے کھڑے فرار کی کوئی راہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ لیکن فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں۔ دفعتاً اُس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''میں ایک بار تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں....الوداعی دیدار......''

وہ آہستہ آہستہ اُس کے قریب جانے لگی جس کے بارے میں اُس کا گمان تھا کہ وہ اکرم ہے۔ لیکن اُس کی نظریں اندھیرے میں بیٹھے ہوئے اکرم پر نہیں میز کے قریب رکھے ہوئے ریموٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ قریب پہنچ کر بڑی تیزی سے اس نے ریموٹ اٹھا لیا اور پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اُس کے جسم کے چیتھڑے تو فضاء میں اُڑے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ تمام دہشت گردوں کی چیخیں بھی فضاء میں گونجنے لگی تھیں۔

بقیہ: وی آئی پی کارڈ

لمبی آہ بھرنے اور اس ساری صورتحال پر افسوس کرنے کے سوا میں اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

دنوں بعد ایک شام میں نے مسرت کی بھاوج کو بازار میں دیکھا۔ میں نے اسے روک لیا اور پوچھا کہ مسز ربانی کے سلسلے میں ایسا کیوں ہوا؟

اس کی بھاوج کے ہونٹوں پر بڑی زہر خند ہنسی ابھری۔ میرے چہرے پر چند لمحے اپنی نگاہیں جمانے کے بعد اس نے کہا۔

''دراصل اس کی ویران، بے رنگ، یکسانیت کی شکار زندگی لڑکیاں دیکھنے دکھانے اور خاطر مدارت کروانے میں ایک ایسے گلیمر سے آشنا ہوئی ہے۔ جس نے اس کی شاموں کو رنگین بنا دیا ہے۔ جمی کی شادی ہو جانے سے تو یہ مشغلہ ختم ہو جائے گا اور اللہ میاں کی گائے جمی اس کی جیب میں وہ وی آئی پی کارڈ ہے جس سے وہ کسی اونچے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا ہی نہیں سکتی بلکہ بے دھڑک اس کے اندر بھی جا سکتی ہے۔

''پروردگار'' میں نے کراہتے ہوئے خود سے کہا۔

تیری دنیا کے بندے انسانیت کی اعلیٰ اقدار محض اپنی تسکین طبع کے لیے کن کن زہریلے ہتھکنڈوں سے ذبح کرتے ہیں۔

فریب سودوزیاں

یسٰین احمد
(حیدرآباد،دکن)

کرم ہویاستم جب حد سے تجاوز کر جائے تو آدمی بوکھلا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ بھی ایسی ہی ہورہا تھا۔کسی نامعلوم بندے نے اُس پر مہربانیوں کی ایسی بارش کردی تھی کہ وہ پریشان ہوگئی۔وہ کون ہے' کیا نام ہے' اُس پر اتنا مہربان کیوں ہوگیا ہے؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔اُس کو تو دیکھا بھی نہیں تھا۔صرف فون پر دوتین بار گفتگو ہوئی تھی ایک دفعہ فون پر وہ پوچھ بیٹھی۔''آپ کون ہیں؟ کیا چاہتے ہیں۔؟مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں....؟''

''آپ کا ایک ہمدرد!اور کیا چاہتا ہوں؟اس کا جواب وقت آنے پر آپ کومعلوم ہوجائے گا۔''نرم آواز میں جواب ملا تھا۔مگر لہجہ اتنا سرد تھا کہ اُس کی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑگئی۔وہ کانپ سی گئی۔اگر آواز کی کوئی مادی ہیئت وشکل ہوتی تو یقیناً کہا جاسکتا کہ مدت گلیشیر میں دبے رہنے کے بعد باہر نکلی ہوگی۔

کچھ ہفتوں پہلے کی بات ہے۔چار بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔اُس کا آخری پیریڈ چل رہا تھا' طالب علموں کو لانگ جمپ کے بارے میں سمجھا رہی تھی۔اتنے میں اُس کا موبائیل بجا۔اُس نے کال ریسور کرنے سے پہلے نمبر پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔نیا نمبر تھا۔دوسری طرف سے کوئی کہہ رہا تھا۔''آج سے آپ کا ذہنی بوجھ دور ہوجائے گا۔آپ کے شوہر کو دواخانے میں شریک کرادیا گیا ہے۔''

''آپ کون بول رہے ہیں؟''اُس نے پوچھا لیکن دواخانے کا نام بتا کر فون کٹ کردیا گیا۔وہ ہلو ہلو کہتی رہ گئی۔دوبارا اسی نمبر پر فون کیا۔مگر فون نہیں اٹھایا گیا۔دوتین دفعہ فون کے نمبر ڈائل کئے تو کمپنی سے جواب ملا کہ جس سے آپ بات کرنا چارہی ہیں وہ اس وقت بند ہے۔

وہ حیران تھی کہ کس نے اس کے علم میں لائے بغیر شوہر کو دواخانے میں شریک کرادیا تھا۔جس اسکول میں پڑھاتی تھی اُسی اسکول میں اس کی اکلوتی بیٹی پڑھتی تھی۔چار بجنے کے بعد وہ بیٹی کو لے کر دواخانے پہنچ گئی۔سوپر اسپیشلٹی ہسپتال تھا۔جس روم میں اُس کے شوہر کو رکھا گیا تھا وہاں عموماً وی آئی پیز کو رکھا جاتا تھا۔

شوہر سے ملنے سے پہلے وہ ڈیوٹی ڈاکٹر سے ملی۔ڈیوٹی ڈاکٹر نے اس کو بتایا کہ چار پانچ دن اس کے شوہر کو ابزرویشن میں رکھا جائے گا۔پھر ٹسٹ کئے جائیں گے اس کے بعد آپریشن کی تاریخ دی جائے گی۔وہ ڈیوٹی ڈاکٹر سے مل کر بلنگ سیکشن میں چلی آئی۔متعلقہ کلرک نے اس سے کہا کہ روم کا کرایہ' دواؤں کی قیمت اور آپریشن کی فیس ادا کردی گئی ہے۔کلرک نے جب بل اس کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔پانچ لاکھ روپے دواخانے میں جمع کرائے گئے تھے۔کلرک بولا۔''یہ رقم ایڈوانس لی گئی ہے۔میرا خیال ہے کہ اتنا خرچہ نہیں آئے گا۔آپریشن روم کا کرایہ' اور دواؤں کی قیمت منہا کردینے کے بعد جو بھی رقم بچے گی آپ کو واپس کردی جائے گی۔''

وہ کشمش و پنچ میں مبتلا ہوگئی۔حقیقت شوہر کو بتائے یا نہ بتائے۔شوہر کے مزاج سے واقف تھی۔شوہر خوددار تھا۔اَنا پرست تھا۔ممکن تھا کہ وہ کسی کی مدد قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔اُس نے سوچا شوہر کو حقیقت بتادے گی۔لیکن جب شوہر کو دیکھا تو ارادہ بدل دیا۔دواخانے میں شریک ہونے کے بعد تین چار گھنٹوں میں کی اس حالت بدل گئی تھی۔چہرے سے وہ مایوسی' افسردگی جو کئی ہفتوں سے چھائی ہوئی تھی یکدم دُور ہوگئی تھی۔

اس کو دیکھ کر شوہر بولا۔''تم نے بتایا نہیں کہ آج مجھ کو دواخانے میں شریک ہونا ہے۔تمہارے اسکول کے مالک کا بہت بڑا احسان ہے۔اس نے کتنی خاموشی سے ہماری مدد کی ہے۔''

شوہر کو غلط فہمی تھی کہ اسکول کے پرنسپل نے ان کی مدد کی ہے۔اسکول کا پرنسپل جو اُس اسکول کا مالک بھی تھا۔انتہائی مہذب' تعلیم یافتہ اور رحم دل آدمی تھا۔پرنسپل کی مہربانی ہی تھی کہ اُس کو اسکول میں ملازمت ملی تھی۔حالانکہ وہ کوالیفائید نہیں تھی۔اسی اسکول سے تعلیم حاصل کی تھی۔اسپورٹس میں مہارت تھی۔اس لئے اس کو پی ٹی کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔تنخواہ بھی وہی تھی جو دوسرے ٹیچرس کو ملا کرتی تھی۔پہلے اُس نے اس ملازمت کو شوق کے طور پر قبول کیا تھا لیکن اب یہ اس کی ضرورت تھی۔شوہر فالج کا شکار ہونے کے بعد بستر پر پڑ گیا تھا۔ملازمت جاتی رہی تھی۔شوہر کو علم تھا کہ اس نے علاج کے لئے پرنسپل سے قرض مانگا ہے۔درخواست ابھی زیر غور تھی۔لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ پرنسپل نے خاموشی سے اُن کی مدد کردی ہے۔اس نے شوہر کی غلط فہمی کو دور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

بہت دیر تک شوہر کے پاس بیٹھی رہی۔بیٹی باپ سے لپٹ کر کھیلتی رہی۔لارڈ و پیار کرتی رہی۔مدتوں بعد شوہر کو اس عالم میں دیکھ کر اُس کو خوشی ہوئی۔جاتے وقت وہ بولا۔''اپنا اور بچی کا خیال رکھنا۔میں بہت جلد اچھا ہوکر گھر آجاؤں گا۔''

ایک نامعلوم بندے کی اس غیر معمولی مدد نے اس کو بے چین کردیا تھا۔مسلسل سوچتی رہی کہ وہ کون ہوسکتا ہے؟ بھرا پرا خاندان تھا۔سب کے سب غیر معمولی تو نگر نہیں تھے لیکن کھاپی کر اپنے گھر گرہستی میں مست تھے۔دو سگے بھائیوں کی معاشی حالت اچھی تھی لیکن ان سے بھی اس قسم کی مدد کی توقع نہیں تھی۔رشتوں کی اس بھیڑ میں اچانک ایک چہرہ ابھر کر دماغ میں آیا اور وہ چہرہ تھا اکرم کا......

اکرم اُس کے کالج کے دنوں کا ساتھی تھا۔دولت مند باپ کا بیٹا انتہائی خوش باش' دوستوں پر بے دریغ روپیہ صرف کرنے کا عادی۔اُس پر دل و جان سے فریفتہ تھا لیکن اُس کے بھائیوں کو پسند نہ تھا۔اس لئے دُور ہوگیا۔اس کا

اتہ پتہ کچھ معلوم نہ تھا۔یہ بارہ تیرہ سال پہلے کی بات تھی۔اس کی کسی پرانی ڈائری میں اکرم کا فون نمبر ہوسکتا تھا۔بہت دیر بعد ایک پرانی ڈائری ملی جس میں اکرم کا فون نمبر درج تھا۔لیکن وہ موبائیل نمبر نہیں تھا لین لینڈ نمبر تھا۔اُمید وبیم کے عالم میں اُس نے وہ نمبر ڈائل کیا۔متعلقہ محکمہ سے جواب آیا کہ اس نمبر کا کوئی فون کام نہیں کررہا ہے۔دیر تک بستر پر لیٹی سوچتی رہی کہ کس طرح اکرم سے ربط پیدا کرے۔

تین چار دن گزر گئے۔اس کو ہنوز ابزرویشن میں رکھا گیا تھا۔شاید ڈاکٹرس دیکھنا چاہتے تھے کہ فالج کے اثر سے اس کے دل و دماغ متاثر تو نہیں ہوئے ہیں۔حالانکہ علاج باضابطہ طور پر شروع نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔یہ بات اُس کے لئے اطمینان بخش تھی۔ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد بچی کے ساتھ دواخانہ چلی آتی۔دیر تک شوہر سے بات چیت کرتی۔ڈیوٹی ڈاکٹر سے شوہر کی کیفیت دریافت کرتی اور پھر شام کے وقت گھر آجاتی۔

اس دن بھی وہ دواخانے سے گھر پہنچی تھی کہ اتنے میں کال بیل بجی۔دروازہ کھول کر دیکھا تو باہر کوریئر والا کھڑا ہوا تھا۔ایک چھوٹا سا بکس کوریئر والے سے لے کر اندر آئی۔بکس کھولا تو حیران رہ گئی۔اندر چابیاں کا ایک گچھا تھا اور کچھ کاغذات....جیسے جیسے وہ ان کاغذات کو پڑھتی گئی ویسے ویسے اُس کی حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔وہ معمولی غذات کا پلندہ نہیں تھا۔دستاویزات تھے کسی نے اُس کے شوہر کے نام پر دو بیڈروم کا ایک فلیٹ رجسٹرڈ کرادیا تھا۔فلیٹ شہر کے ایک پاش علاقہ میں واقع ہوا تھا۔

سکتے کے عالم میں بیٹھی سوچتی رہی کہ ان مہربانیوں کے پس پردہ کون ہوسکتا ہے۔اگر اکرم نہیں ہے تو پھر کون ہوسکتا ہے؟ وہ اسی ادھیڑ بُن میں بیٹھی تھی کہ اتنے میں فون بجا۔موبائیل پر اس نے وہی یخ بستہ آواز سنی۔"فلیٹ پسند آیا؟ کل شفٹ ہوجانا..."

وہ بلند آواز میں بولی۔"اکرم! آخر تم کیا چاہتے ہو؟ ان مہربانیوں کی وجہ کیا ہے؟ میرے سامنے آؤ کھل کر بات کرو۔"

"میں اکرم نہیں ہوں۔" اسی سرد لہجے میں جواب دیا گیا۔

وہ زور سے چلائی۔"تم آواز بدل کر مجھ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔تم اکرم ہو، اکرم ہو..."

وہ چیختی رہی مگر فون کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔اُس کی چیخیں سن کر اس کی معصوم بچی اس کے قریب آگئی۔"ممی کیا ہوا؟ یہ اکرم کون..."

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔بچی کو گود میں بٹھالیا۔مگر اب اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ شوہر کو سب کچھ بتادے گی۔فلیٹ میں منتقل بھی نہیں ہوگی۔کہیں اکرم کی یہ مہربانیوں اس پر ستم بن کر نہ ٹوٹے۔دوسرے دن شوہر کا سامنا ہوا تو اس کے لب کھل نہ سکے۔کیونکہ ایک دن بعد اس کا آپریشن ہونے والا تھا۔ایسی صورت میں کوئی بھی تشویشناک خبر ذہنی طور پر پریشان کرسکتی تھی۔

دوسرے دن اس کا آپریشن ہوا اور کامیاب رہا۔شوہر جب تک آپریشن تھیٹر میں رہا اُس کی پریشانی اور بے تابی عروج پر رہی۔شوہر کے تھیٹر سے باہر آنے کے بعد اس کی حالت دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا۔وہ دو دن تک بیٹی کے ساتھ دواخانے میں رہی۔اسکول سے چھٹی لے رکھی تھی۔ہر طرف سے قدرے بے فکر ہوکر شوہر کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔

دو دن بعد شام کے وقت وہ گھر آئی تو سناٹے میں آگئی۔گھر کے دروازہ پر کوئی دوسرا تالا اُس کا منہ چڑارہا تھا۔اس سے پہلے کہ وہ معاملہ کی نوعیت سمجھتی فون پر میسیج آگیا،لکھا تھا۔"آپ کا ضروری سامان نئے فلیٹ میں منتقل کردیا گیا۔وہاں چلے جایئے۔واچ مین سے فلیٹ کی چابیاں مل جائیں گی۔"

شوہر کی طرف سے نجات ملی تو ایک نئی مصیبت اُس کے گلے پڑگئی۔وہ نہیں جانتی تھی کہ ان حرکتوں کے پیچھے کون ہے؟ اکرم یا کوئی اور....؟ لیکن جو بھی ہو اس کی راہ میں کانٹے بچھاتا جارہا تھا۔اس کا وقار، اس کی عفت خاک میں ملانے پر تلا ہوا تھا۔رات بے گھر گزارنا ممکن نہیں تھا۔لہٰذا ٹیکسی لی اور نئے فلیٹ پر پہنچ گئی۔بہت بڑا کامپلکس تھا جہاں کے رہنے والے ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے ہیں۔واچ مین اس سے یوں ملا جیسے پرانی شناسائی ہو۔فلیٹ کی چابیاں اس کے حوالے کیں اور فلیٹ تک رہنمائی بھی کی۔

فلیٹ کا دروازہ کھولا تو ششدر رہ گئی۔دو بیڈروم کے اس فلیٹ میں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔کچن سے اٹاچ اسٹور روم میں کھانے پینے کا سامان تک رکھا ہوا۔فریج، ٹی وی، واشنگ مشین یہ سب دیکھ کر وہ بے بسی کے عالم میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی لیکن بیٹی دوڑ دوڑ کر ہر کمرہ ہر چیز کا جائزہ لیتی رہی اور خوش ہوتی رہی اور پھر قریب آکر اُس نے پوچھا۔"یہ گھر ہمارا ہے۔آج سے ہم یہاں رہیں گے۔؟"

وہ بے بسی کے عالم میں سر ہلا کر رہ گئی۔معصوم بیٹی کو کچھ بھی بول بتا کر مطمئن کرسکتی تھی لیکن شوہر کو کیا بتائے؟ کیا کہے...؟ یہ سوال ذہن میں دھیمی دھیمی چنگاری کی طرح سلگ رہا تھا۔وہ ان ہی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ موبائل پر ایک اور میسیج آگیا۔میسیج اُس کے بینک والوں کی طرف سے آیا تھا۔بینک سے اس نے کریڈٹ کارڈ پر جو رقم اٹھائی تھی وہ آج یکمشت ادا کردی گئی تھی۔

پانچ دن بعد جب شوہر کی حالت مکمل طور پر بہتر دکھائی دی تو اُسے ڈسچارج کردیا گیا اور ایک چیک جو ساٹھ ہزار روپیہ پر مشتمل تھا اس کے حوالے کردیا گیا۔دواخانہ میں جمع شدہ رقم سے اخراجات منہا کرنے کے بعد جو رقم بچی تھی واپس کردی گئی تھی۔چیک دیکھ کر شوہر خوش ہوگیا اور بولا۔"میں تمہارے پرنسپل سے ملوں گا۔جلد سے جلد اُن کا قرض چکادیں گے۔"

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔وہ ٹیکسی کی ڈکی میں سامان رکھوا رہی تھی کہ اگر ٹکسی سابقہ گھر کے بجائے نئے فلیٹ کی سمت جاتا ہوا دیکھ کر شوہر کوئی سوال کرے تو کیا جواب دے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ٹیکسی فلیٹ کی سمت سڑک پر

دوڑنے لگی تو پوچھ ہی لیا۔''ہم کہاں جارہے ہیں۔؟''

وہ شوہر کی طرف دیکھے بغیر بولی۔''سابقہ مکان میں آپ کی صحت مسلسل خراب رہی ہے میں نے ایک فلیٹ کرایہ پر لیا ہے۔اب وہاں رہیں گے۔بڑی پُر فضا اور سکون کی جگہ ہے۔''

بیوی کی بات پر اس کو اعتبار آ گیا۔ ہمیشہ اس نے بیوی کی بات پر اعتماد کیا تھا یہ بھی احساس تھا کہ بیوی نے اس کی خاطر بہت سی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔فلیٹ کا پُرسکون ماحول اس کو پسند آ گیا۔

غسلِ صحت کے بعد دونوں بیٹی کو لے کر باہر نکلے۔ضرورت کی کچھ چیزیں خریدنے میں کافی وقت گزارا۔ایک اچھی ہوٹل میں کھانا کھایا اور گھر لوٹے تو شام ہو چکی تھی۔ وہ بہت دیر تک کچن کی صفائی میں مصروف رہی۔ جب بیٹی اونگھنے لگی تو اس کو کمرے میں سلا کر منہ ہاتھ دھویا اور اپنے بیڈروم میں آئی تو دیکھا شوہر نے بانہیں پھیلا رکھی ہیں۔ وہ لپک کر شوہر کی بانہوں میں سما گئی۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ اُس بے آب زمیں کی طرح تھی جو آسودگی کی ایک ایک بوند کو ترستی ہے۔آج کی رات اس کی زندگی کی جیسے دوسری سہاگ رات تھی۔

اگلی صبح وہ جاگی تو کافی ہشاش بشاش تھی جیسے دل و دماغ سے ساری پریشانیاں اوجھل ہو گئی ہوں۔فریش ہو کر ناشتہ تیار کیا۔شوہر اور بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ سے فارغ ہوئی۔آج اسکول میں سالانہ جلسہ تھا۔جلسہ کی کارروائی لنچ کے بعد شروع ہونے والی تھی۔لیکن اس کے ذمے سونپی ہوئی ذمہ داریوں سے نمٹنا تھا۔ ہر سال کی طرح اس دفعہ بھی جلسہ عالیشان پیمانے پر منایا جانے والا تھا جس میں شہر کی معزز ہستیاں، وزیر اور طالب علموں کے والدین کو مدعو کیا گیا تھا۔

بیٹی اور شوہر تو شام کو آنے والے تھے لیکن وہ گیارہ بارہ کے قریب گھر سے نکل گئی تھی۔گھر سے آٹو کی تلاش میں کچھ دور چلی تھی کہ اتنے میں ایک کار ریگنتی اُس کے قریب آ کر رُکی۔کار کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کسی نے اندر سے کہا۔''آ جائیے۔ہم آپ کو اسکول تک چھوڑ دیں گے۔''

آواز کچھ جانی پہچانی لگی۔وہ غیر ارادی طور پر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔اندر دو بندے موجود تھے ایک ڈرائیورنگ سیٹ پر دوسرا اُس کی برابر والی سیٹ پر۔دونوں اس کے لئے اجنبی تھے۔اب اس کا ماتھا ٹھنکا۔دلیر تھی، کراٹے کی ماہر تھی اس لئے کسی قسم کی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ہمت کر کے بیٹھی رہی۔لیکن جب کار اس کے اسکول کی بجائے کسی دوسری سمت دوڑنے لگی تو اس نے پوچھا۔''آپ لوگ مجھ کو کہاں لے جارہے ہیں۔؟''

ہم آپ کو اسکول لے جائیں گے۔'' سامنے بیٹھے ہوئے بندے نے جواب دیا۔لیکن ابھی نہیں کچھ دیر بعد۔''

آدھے گھنٹے تک کار سڑک پر دوڑتی رہی اور پھر ایک وسیع عمارت کے سیلر میں رو کی گئی۔ وہ دونوں بڑی پھرتی سے کار سے اُترے۔اُس کی دائیں بائیں جانب چلتے ہوئے لفٹ کی طرف اشارہ کیا۔وہ خاموشی سے ان کے ساتھ لفٹ میں داخل ہو گئی۔لفٹ پانچویں فلور پر رکی۔لفٹ سے باہر نکلے تو سامنے ایک طویل راہداری نظر آئی۔راہداری کے دونوں جانب کے دروازے بند تھے اور وہاں سناٹے کی حکمرانی تھی۔

راہداری کے آخری دروازے پر پہنچے تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی ایک بندہ نے اس کا پرس چھین لیا اور پرس میں سے موبائل نکال لیا اور سم نکال کر موبائل اس کے حوالے کر دیا۔وہ غصے سے ان دونوں کو گھورتی رہ گئی۔اس نیم تاریک ہال میں پہلے سے ہی دو بندے بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ان کے چہرے نمایاں نہیں تھے۔جسم کے ڈیل ڈول سے بھی وہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ اکرم ہے یا کوئی.....

''آپ لوگ کون ہیں؟ یہاں مجھ کو کیوں لائے ہیں؟'' نڈر ہو کر اُس نے پوچھا۔

''آپ کے ہمدرد....!'' وہی سرد آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی جو پچھلے کئی دنوں سے اس کو پریشان کر رہی تھی۔جس کی مہربانیوں نے اس کا جینا محال کر دیا تھا اور آج شاید...؟''

وہ ملتجی ہو کر بولی۔''آج میرے اسکول کا سالانہ جلسہ ہے مجھ کو جلد جانا ضروری ہے۔میرے ذمے بھی کئی کام سپرد کئے گئے ہیں۔مہربانی کر کے مجھے جانے دیجئے۔''

''جلسے کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے آپ کو وہاں پہنچا دیا جائے گا۔''اسی نرم آواز مگر سرد لہجے میں جواب دیا گیا۔''لیکن اس جلسے میں نہیں 'آپ کو اپنے لباس میں تھوڑی سی تبدیل کرنی ہوگی۔وہاں ایک کوٹ ہے وہ پہن لیجئے۔''

قبل اس کے وہ کچھ کہتی ایک کوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔کوٹ کے اندر کے حصے پر نظر پڑتے ہی وہ کانپ کر رہ گئی۔کوٹ کے اندرونی حصے میں برقی تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ان تاروں سے شل نما کوئی چیز جڑی ہوئی تھی۔اس کو فوراً احساس ہوا کہ وہ کن لوگوں کے جال میں پھنس گئی ہے۔اس نے فوراً کوٹ زمین پر پھینک دیا۔

''کیوں بی بی۔''وہی آواز اس کی ساعت سے ٹکرائی۔''سلمیٰ ستارے پسند نہیں آئے؟ ذرا سوچئے تو یہ جب چمکیں گے تو آپ کہاں ہوں گی۔بہشت میں' جہاں ٹھنڈے پانی کے چشمے بہہ رہے ہوں گے۔زیتون، انجیر، انار جیسے شیریں پھل....''

''میں نے اسی اسکول میں تعلیم پائی ہے۔آج میری بیٹی اُسی اسکول میں پڑھتی ہے۔مجھ کو دوسرے بچے بھی اتنے ہی عزیز ہیں جتنی میری بیٹی۔میں آپ لوگوں کے اشاروں پر نہیں ناچ سکتی۔'' پہلی بار وہ غصے سے بولی۔اور پھر اُس دروازے کی طرف بڑھ گئی جدھر سے آئی تھی۔لیکن وہاں پہنچ کر اس کو احساس ہوا کہ دروازہ کھولنا ناممکن ہے۔دروازے کا میکانزم اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ کیجیے

وی آئی پی کارڈ

سلمیٰ اعوان

(لاہور)

کوئی اتنی زیادہ راہ رسم نہیں تھی۔بس ہیلو ہیلو اور سب ٹھیک ہے والی بات تھی۔ بازار کی کسی کشادہ سڑک یا گلی کوچے میں اچانک ٹکراؤ ہو جاتا تو مسکراہٹوں کا تبادلہ اور ہاتھوں کا فضا میں خیرسگالی انداز میں لہرانا ایک عام سی بات تھی۔ ایک دن جب میں سودا سلف والی بھاری ٹوکری اٹھائے اپنے راستے پر تیزی سے بڑھ رہی تھی میرا اس سے ٹکراؤ ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے اور خواہش مند ہے کہ میں رک کر اس کی بات سنوں۔

''پلیز میرا گھر جانتی ہونا آنا۔ بیٹھیں گے اور بات ہو گی۔''

اور ایک دن وہ میرے گھر آ گئی۔ چولہا جلاتے اور اس پر کیتلی چڑھاتے ہوئے میں نے بے اختیار سوچا۔

''اسے بھلا مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے؟'' اور جب میں ٹرے میں دو مگ رکھے اندر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے گراموفون مشین کے ریکارڈ پر سوئی رکھ دی گئی ہو۔

جمی ایسا وجیہہ اور مدبّر ہے کہ سیزر آگسٹس بھی اس کے آگے پانی بھرے۔ وہ ایسا نیک سیرت ہے کہ اسے آج کے دور کا عمر بن عبدالعزیز کہا جا سکتا ہے۔اس کی قابلیت اور لیاقت ڈاکٹر قدیر خان کو مات کرتی ہے۔

مجھے اچھو لگ گیا تھا۔ چائے میری سانس کی نالی میں چلی گئی تھی۔ جب شعلہ بیانی کا یہ عالم ہو۔تشبیہوں اور استعاروں کی یوں فراوانی ہو تو اچھو لگنا فطری امر ہے۔ یوں میں نے اس کی ذہانت اور لیاقت کی داد دی تھی کہ کس خوبصورتی سے اس نے ماضی بعید، ماضی اور حال کی شخصیتوں کے ساتھ جمی کو منسلک کیا تھا۔

جمی کون ہے؟ اس کا بھائی، بھانجا، بھتیجا، خلیرا، چچیرا یا میرا بھائی میں نہیں جانتی تھی وہ تھی کہ باتوں کی شاہراہ پر پیجارو کی طرح سرپٹ بھاگے چلی جا رہی تھی۔

''جمی کے لئے لڑکی چاہئے۔لڑکی خوبصورت کونونٹ یا کسی بھی اونچے سٹینڈرڈ کے ادارے کی تعلیم یافتہ ہونی چاہیے۔ انگریزی روانی سے بول سکتی ہو۔ گھر گھرانہ پڑھا لکھا اور مہذب ہو۔لڑکی کی ماں کا پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے۔ جمی اونچی سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والا لڑکا ہے۔ یار دوست سبھی ہائی جینٹری سے ہیں۔''

''پہلے جمی کی ذات شریف کا تعارف تو کراؤ''۔

''جمی میرا چھوٹا بھائی ہے۔'' اس نے گردن فخریہ انداز میں بلند کی۔

مجھے یوں دیکھا جیسے وہ ماشہ بروم کی چوٹی پر بیٹھی ہو اور میں کسی زمین گڑھے میں دھنسی پڑی ہوں۔ سب بہن بھائیوں میں چھوٹا ہے۔ ڈاکٹر ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا گولڈ میڈلسٹ امریکہ سے فل برائٹ سکالر شپ پر ہارٹ سرجری میں سپیشلائزیشن کر کے آیا ہے۔ وہ بولے چلی جا رہی تھی۔

سچی بات ہے اب میرے مرعوب ہونے کی باری تھی اور میں ہوئی بھی۔ میں نے سوچا ایسا نوجوان اگر زندگی کی ساتھی کے لیے ایسی شرائط پیش کرتا ہے تو اسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں اچھے لڑکوں کا قحط پڑا ہوا ہے۔ ایک انار اور سو بیمار والی بات ہے۔ بہتیری ملنے جلنے والیوں نے اپنی بیٹیوں اور بہنوں کیلئے کہہ رکھا ہے۔ چلو کسی کا بھلا ہو جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

میں اس کے پھیلے ہوئے دامن میں فی الفور کچھ ڈالنے سے معذور تھی۔ لیکن میں نے وعدہ کیا کہ اس کارخیر میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گی۔

حالات جس نہج پر جا رہے ہیں ان کے پیش نظر ایسی لڑکی کا ملنا کوئی مسئلہ نہیں۔ والدین کو تو آج کل صرف ہیرا سے لڑکوں کی تلاش رہتی ہے۔ اگلے دن میں نے مسز شمیم احسان سے بات کی۔ پانچ بیٹیوں کی ماں جوان کی شادیوں کے لیے بہت پریشان رہتی تھی۔ جب ملو پہلا سوال یہی ہوتا۔''خدا کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ بتاؤ نا'' ان سے بات چیت کے بعد میں نے مسرت سے رابطہ قائم کیا۔ دن اور وقت بتایا۔ جس دن لڑکی کو دیکھنے جانا تھا۔ میں ان ماں بیٹی کی سج دھج دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ مسرت کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی ماں مہارانی جے پور کو مات کرتی تھی۔ خود مسرت ایسی بنی سنوری کہ بے اختیار میڈورا کے اشتہار کا گمان گزرے۔

مسز شمیم احسان بچھی جاتی تھیں۔ کھانے کی میز چیزوں سے بھر دی تھی۔ تینوں بیٹیاں سامنے آ گئی تھیں۔ اچھی بھلی خوش شکل لڑکیاں جنھیں مسرت نے بے اعتنائی سے دیکھا۔ واپسی پر مسرت میرے اس استفسار کے جواب میں کہ کہو کیسی لگیں''۔ بولی۔

''میں نے آپ سے کہا تھا کہ لڑکی بہت خوبصورت ہونی چاہیے۔''

''ارے آسمان سے اتری ہوئی حوریں تو میں تمہیں دکھانے سے رہی''۔

''پلیز آپ میرے ساتھ گھر چلیے۔ جمی اسلام آباد سے آیا ہوا ہے۔ اسے ایک نظر تو دیکھیں''۔

واپسی پر وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے گئی۔ جمی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ گدڑی میں لعل ہے۔ مہذب اور برخوردار قسم کا وجیہہ لڑکا، جسے واقعی ایک اچھی لڑکی ملنی چاہیے تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مسز شمیم احسان کے سلسلے میں مسرت نے جو رویہ اختیار کیا اسے میں نے بھلا ڈالا۔ چاروں کھونٹ ایک بار پھر میری نظروں کی زد میں تھے۔ اس بار جو گھر تاکا وہ سو فیصد اس معیار پر پورا اترتا تھا جو مسرت چاہتی تھی۔ مسز ربانی میری ایک دوست کی عزیز تھیں۔ کاروباری اور

زمیندار گھرانہ تھا۔ وضعداری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ گھر عالیشان تھا۔ ان کی نوعمر بیٹی زوبیہ جو بی اے فائنل میں تھی، چندے آفتاب اور چندے ماہتاب۔ ایسی نازک جیسے گلاب کی لچکیلی شاخ، ایسی تروتازہ جیسے چنبیلی کی کلی صبح دم کھلی ہو۔ مسرت نے اسے دیکھا اور مجھ سے کہا۔

''میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ ہمیں یہاں لائیں۔ یہ لڑکی ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہے''۔

یہ گھر اور لڑکی ماں بیٹی دونوں کو بہت پسند آئے۔ دو دن بعد مسرت کا پورا خاندان دو گاڑیوں میں لد لدا کر پھر مسز ربانی کے ہاں جا پہنچا۔ مسرت چاہتی تھی بھاوجیں بھی وہ انمول ہیرا دیکھ لیں جس پر اس کی نگاہ ٹکی ہے۔ بردکھوا کا مرحلہ آیا۔ لڑکا تو خیر لاکھوں میں ایک تھا۔ گھر دیکھ کر مسز ربانی پریشان ہوگئیں۔ شوہر سے کہا۔

''ایسے پر آسائش ماحول کی پروردہ وہ لڑکی اس ماحول میں پنپ نہیں سکتی۔ زمین آسمان کا فرق ہے۔

ربانی صاحب نے بیگم کو سمجھایا۔ ''احمق مت بنو۔ مجھے لڑکا بہت پسند آیا ہے۔ ذہن وفطین بچہ ہے۔ ایک شاندار مستقبل اس کے سامنے ہے۔ اعلیٰ تعلیمی قابلیت کا اثاثہ اس کی پشت پر ہے۔ اسے کلینک بنا دیں گے۔ نیا گھر خرید دیں گے۔ ہمارے لیے اسے سیٹ کرنا کونسا مسئلہ ہے۔ بات ٹھیک تھی۔ بیوی کے خانے میں بیٹھ گئی۔

اب دونوں گھروں میں آمدورفت شروع ہوگئی۔ مسرت جاتی۔ خوب خوب آؤ بھگت کرواتی۔ ہونیوالی بھاوج کے واری صدقے ہوتی۔

ایک دن جب میں بازار میں لہسن اور پیاز خرید رہی تھی۔ مجھے اپنی ایک پرانی دوست نظر آئی۔ وہیں سڑک کنارے ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئیں۔ باتوں باتوں میں دفعتاً اس نے کہا۔

''دو تین دن ہوئے مسرت سے ملاقات ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کیسی طرح دار شخصیت نکالی ہے اس نے۔ اسکول کے زمانے میں تو اینویں سی تھی۔

''تم سے کہاں ملیں؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

''میرے مالک مکان کی بیٹی اپنے بھائی کے لیے دیکھنے آئی تھی۔ میں اتفاقاً نیچے آئی تو اسے بیٹھے دیکھا۔ اس کی سج دھج اور بناؤ سنگار تو لیڈی ہملٹن کو شرمارہا تھا۔ میں تو سچی، بہت متاثر ہوئی''

''ارے دیکھو اس بدذات کو۔'' میں آگ بگولا ہو اٹھی۔

میرے ملنے والوں کے ہاں بات تک پکی کر بیٹھی تھی اور اب انہیں چھوڑ کر اور طرف چل نکلی ہے۔''

اس وقت بارہ بج رہے تھے اور بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ بچوں کو کھانا وغیرہ کھلا کر اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر میں اس کے گھر گئی۔ خوش قسمتی سے وہ اندر کسی کمرے میں نہ جانے کس ادھیڑ بن میں گم بیٹھی تھی۔ میرے پکارنے پر آنگن میں آئی۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا کہ وہ کیا کرتی پھر رہی ہے؟''

جواباً اپنی اس حرکت پر وہ شرمندگی یا تاسف کا اظہار کرنے کی بجائے ڈھٹائی سے بولی۔

''عجب لوگوں سے آپ نے ہمارا ملاپ کروایا۔ وہ تو لڑکا پھانسنے کے چکر میں تھے۔ بس ہم نے انکار کر دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نکاح وغیرہ نہیں کیا تھا۔''

اس کے الفاظ، اس کے اطوار، اس درجے کٹیلے تھے کہ مزید کچھ کہنا ایسا ہی تھا جیسا بھینس کے آگے بین بجانا۔

اس شام مسز ربانی آ گئیں۔ خشک ہونٹوں اور اڑے ہوئے رنگ و روپ کے ساتھ بڑی دلگیر سی دکھتی تھیں جب بولیں۔ '' کیسے لوگوں سے تم نے ہمارا سامنا کروایا۔ زوبیہ کو دیکھا۔ پسند کیا۔ سارا خاندان گاڑیاں بھر بھر کر آتا رہا۔ خاطر تواضع کرواتا رہا۔ منگنی پر اصرار ہوا۔ میں صرف لڑکے کی خاطر رضامند ہوئی کہ نیک اور شریف بچہ ہے۔ پندرہ لوگ منگنی پر آئے۔ سب کو کپڑے دیئے۔ لڑکے کو ہیرے کی انگوٹھی پہنائی۔ ماں کی کلائیوں میں کنگن ڈالے۔ اس حرافہ مسرت کو چوڑیاں دیں۔ اب سنو کل کی بات۔ زوبیہ اپنی ایک دوست کے گھر گئی۔ گھر میں شام کی چائے پر کچھ مہمان آ رہے تھے۔ خصوصی انتظامات کی بو محسوس کرتے ہوئے زوبیہ کے اصرار پر اس نے جی کے متعلق بتایا کہ لڑکے کی بہن تو پسند کر گئی ہے۔ آج اس کی ماں آ رہی ہے۔

زوبیہ کا اوپر کا سانس اوپر اور تلے کا تلے رہ گیا۔ فوراً گھر بھاگی۔ مجھے بتایا۔ میں اسی وقت اس کی دوست کے گھر گئی اور ساری بات انہیں بتائی۔ پروگرام یہ طے ہوا کہ جونہی یہ لوگ آئیں میں سامنے آ کر ان کی تواضع کروں۔ لیکن یہ لوگ آئے نہیں۔

ربانی صاحب نے فوراً جی سے رابطہ کیا۔ اُس نے صورتحال پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں''۔

''میاں خالی خولی شرمندگی سے فائدہ۔ کچھ عملی کام کرو''۔ ربانی صاحب نے کہا۔

مگر یہ مسئلہ ایسا تھا کہ وہ یکسر انکاری ہوگیا۔ اُس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی بہن کی رائے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے اس کی بزدلی کہہ لیجیئے۔ اس کی کم ظرفی کا نام دے لیجیے۔

دراصل مسرت نے بھائی کو باپ کے مرنے کے بعد بہت محنت و مشقت سے پڑھایا تھا۔ اب صورتحال یہ ہے کہ اگر وہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو بڑھاپے کی دہلیز میں داخل ہوتی کنواری بہن پل بھر میں اس کا تیاپانچہ کر دیتی اور طعنے دے دے کر اس کا جینا حرام کر ڈالتی ہے۔ وہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں۔

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ کیجیے

''دشتِ اُلفت''

محمود الحسن

(راولپنڈی)

قیسِ آشفتہ سر و آبلہ پا ہوں میں بھی
کُو بکُو قریہ وصحرا میں پھرا ہُوں میں بھی

تُو تو ہر وقت ہی مائل بہ کرم ہے یارب
آج پھیلائے ہوئے دستِ دُعا ہوں میں بھی

کیسے ممکن ہے نہ ہوں میری دُعا سے بیدار
خُفتہ طبعوں کے لیے بانگِ درا ہوں میں بھی

اپنے اعمال پہ جب غور کیا ہے میں نے
اپنے ہی آپ سے شرمندہ ہُوا ہُوں میں بھی

آؤ بتلاؤں تمھیں تیرگیِ دل کا علاج
واقفِ روشنیِ غارِ حرا ہُوں میں بھی

مجھ کو خورشیدِ قیامت سے ڈراتے کیوں ہو
دوستو شافعِ محشرؐ کا گدا ہُوں میں بھی

میرا یہ زعم کہ پوشیدہ ہیں میرے اعمال
اُن کا کہنا کہ تجھے دیکھ رہا ہُوں میں بھی

دشتِ اُلفت میں سرِ رہگذر اے محمودؔ
جھلملاتا ہُوا مٹّی کا دیا ہُوں میں بھی

○

غالب عرفان

(کراچی)

ہو جو ناممکن تو امکاں میں اُبھرنا چاہیے
اب سمندر کو بھی صحرا میں اترنا چاہیے

لہر میں پانی کی جیسے چاندنی رقصاں رہے
ریگِ ساحل کو بھی موجوں میں بکھرنا چاہیے

اپنی ہی نظروں میں گر جانے کا ہو امکان تو
آئینے کے سامنے بھی کم ٹھہرنا چاہیے

کیسے اندازہ ہو گہرائی کا سطحِ آب سے
سوچ کر ہی پانیوں میں پاؤں دھرنا چاہیے

صحن میں اب شام کے سائے بھی رخصت ہو چلے
چاندنی یادوں کی آنگن میں اترنا چاہیے

گھر میں جب تک ربطِ باہم کا دیا جلتا رہے
روشنی کے شہر سے بچ کر گزرنا چاہیے

ماہِ تاباں کی طلب میں ہے جبینِ فکر وفن
تجربے سے زندگی کی مانگ بھرنا چاہیے

زندگی کا آخری ورقہ الٹنے کے لیے
وقت سے پہلے کسی کو بھی نہ مرنا چاہیے

مطلعِ عرفاںؔ سے روشن جہل کی ظلمت ہوئی
فکر کی رعنائیوں سے اب سنورنا چاہیے

○

مظفرحنفی

(دہلی، بھارت)

سزا بلبل کو ملنی چاہیے تھی
کہ ہر غنچے کو تتلی چاہیے تھی

وہاں اک زخم پیدا ہو گیا ہے
جہاں کونپل نکلنی چاہیے تھی

نمو کا شوق کر لیتے ذرا سا
ہمیں تھوڑی سی مٹی چاہیے تھی

مِلن کا استخارہ کیسے آیا
سیاست کو تو دوری چاہیے تھی

بہر صورت ہمارے رہنما کو
قلم دان اور کُرسی چاہیے تھی

نکلتے ہم مسائل کے بھنور سے
مگر اُوپر کی مرضی چاہیے تھی

جڑی تھیں تختیاں سب کھڑکیوں پر
مظفؔر کو ہوا بھی چاہیے تھی

○

شاہین

(کینیڈا)

دیتے ہی رہو گھاؤ مرا کچھ نہیں جاتا
پچھتاؤ ، نہ پچھتاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

یہ پیچ کا پردہ تو ہے اک کھیل تمہارا
سرکاؤ ، نہ سرکاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

مشکل جو ہے جینا تو یہ جینے کی ہوس کیوں؟
مرتے ہو تو مرجاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

گرتے ہوئے پتھر ہیں مرے سچ کی گواہی
کرتے رہو پتھراؤ مرا کچھ نہیں جاتا

آ کر بھی تو جیسے کوئی احسان کیا تھا
جاتے ہو چلے جاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

یہ دُردِ تہِ جام کا نشّہ بھی ہے کیا کم
چھلکاؤ ، نہ چھلکاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

میں نے تو ضرورت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا
بے مول ہی بِک جاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

میں کوئی نمائش کا تماشا تو نہیں ہوں
میں خوش ہوں زلیخاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

غم ہوگا جو رسوا بھی تو یہ سوچ لو کس کا؟
جس طرح بھی کتراؤ مرا کچھ نہیں جاتا

ساحل پہ مرا ہاتھ نہ پکڑا تھا کسی نے
ڈوبی ہے جو اب ناؤ مرا کچھ نہیں جاتا

ہر قیس کی پگڑی ہے سرِ شاخِ مغیلاں
واقف ہوں میں صحراؤ مرا کچھ نہیں جاتا

شاہیؔن مجھے دے کے بھی دیکھا ہے جہاں نے
سَو طرح کے الجھاؤ مرا کچھ نہیں جاتا

رؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

بڑی کریہہ سہی چھپکلی سے کیا لینا
موحدوں کو بھلا بدعتی سے کیا لینا

تجھے خبر بھی ہے دنیا ہے میری مٹھی میں
تو بھاگ جا تری تتلی گلی سے کیا لینا

بہت دنوں سے مجھے پیاس ہی نہیں لگتی
اسی لیے تری دریا دلی سے کیا لینا

تری ترازو میں پاسنگ ہے ہمارے لیے
تجھے ضمیر کی آواز ہی سے کیا لینا

ابھی تو اور ترا رنگ دیکھنا ہے مجھے
ہے انتقام بھی لینا ،ابھی سے کیا لینا

بس اتنا ہے کہ ترا ساتھ چھوٹ جائے گا
تری ترقیِ معکوس ہی سے کیا لینا

کہیں بھی وقت کسی دن ٹھہر بھی سکتا ہے
گھڑی گھڑی کسی نازک گھڑی سے کیا لینا

قلندروں کی طرح مست اپنے حال میں ہیں
رؤف خیر ہمیں اب کسی سے کیا لینا

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

(غزل نما)

سُنا ہے، دوستوں سے ایسی نادانی بھی ہوتی ہے
کہ دے کہ دُکھ مجھے، ان کو پشیمانی بھی ہوتی ہے

بہت مشکل ہے راہِ شوق میں ثابت قدم رہنا،
مگر اس طور سے جینے میں آسانی بھی ہوتی ہے

یہ جب چاہیں دیارِ نفس کو زیر و زبر کر دیں،
فقیروں کی ادا میں خوئے سلطانی بھی ہوتی ہے

سفینے میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لیجے گا،
فقط پانی نہیں، دریا میں طغیانی بھی ہوتی ہے

نہیں معلوم ان دانشورانِ عصر حاضر کو،
کہ اس دانائی میں اِک چیز نادانی بھی ہوتی ہے

اجل تو بعد میں آئے گی، پہلے زندگانی میں،
سکوں بھی کھونا پڑتا ہے پریشانی بھی ہوتی ہے

عجب طُرفہ تماشا ہے کہ دینوں کی میّت پر
پڑھے جاتے ہیں نوحے فاتحہ خوانی بھی ہوتی ہے

خیاؔل احباب تو جو ہیں مگر تُم کیا ہو یہ سوچو
گلے سے بھی نہیں رُکتے، پشیمانی بھی ہوتی ہے

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

شاید نصیب میں ہو رسائی بھی نُور تک
چلتے ہیں آج ہم بھی ذرا کوہِ طُور تک

تھوڑے سے فاصلے پہ ہی تھی منزلِ غیاب
ہم رہ گئے ہیں راہ گزارِ ظہور تک

جاری رکھے وہ اپنا سفر کس امید پر
منزل دکھائی دے نہ جسے دور دور تک

حائل تھی جو خلیج، وہ پاٹی نہ جا سکی
میرے وفورِ عجز سے اس کے غرور تک

بینائی ہی نہ اپنا گنوا بیٹھے تُو کہیں !
یوں اس کے انتظار میں مت دور دور تک

اس کو عبور کرنے میں اِک عمر لگ گئی
جو فاصلہ شعور سے تھا لاشعور تک

تھوڑی سی زندگی تھی، مگر کام تھے بہت
نمٹائے جا سکے نہ ضروری امور تک

ابلاغ اُن کا ہوتا ہے توفیق سے نسیم
مفہوم ہیں سطور سے بین السطور تک

○

عرش صہبائی
(جموں، کشمیر)

ہو گئے خود بھی سر بہ سر تنہا
جو گئے مجھ کو چھوڑ کر تنہا

غم میں آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں
دل پہ ہوتا نہیں اثر تنہا

کسی آوارہ رُوح کی صُورت
پھر رہا ہُوں میں در بہ در تنہا

ساتھ اُس کا خیال ہوتا ہے
جب بھی کرتا ہُوں میں سفر تنہا

کیسے کرتا ہے زندگی یہ بسر
جو بھی رہتا ہے ٹُوٹ کر تنہا

آتی ہے یادِ رفتگاں جب بھی
خون روتی ہے چشمِ تر تنہا

کیا کہُوں اُن کے دل پہ کیا گزری
رو پڑے مجھ کو دیکھ کر تنہا

وہم ہے یہ انا پرستوں کو
وہ ہیں دُنیا میں معتبر تنہا

اک نہ اک خیر خواہ ہوتا ہے
عرش ملتے کہاں ہیں گھر تنہا

○

قیصر نجفی
(کراچی)

گریہ کے منظر دیکھے
ہر کوچے ہر گھر دیکھے

آوازوں کے جنگل میں
بے آواز شجر دیکھے

آبادی میں ویرانے
ویرانوں میں گھر دیکھے

منظر ہم کو دیکھتے تھے
ہم نے کب منظر دیکھے

شیشے سے تھے نازک تر
ایسے بھی پتھر دیکھے

پوچھ نہ وقت کے نیزے پر
ہم نے کیا کیا سر دیکھے

چارہ گروں کی کھوج میں اب
قیصر چارہ گر دیکھے

○

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
(بہار، بھارت)

زندگی بن گئی اب بارِ گراں کی صورت
ناتواں دوش پہ ہے لاش جواں کی صورت

دل کے صحرا ہی میں ڈھونڈیں بھی کوئی جائے پنہہ
اب تو گلشن میں نہیں کوئی اماں کی صورت

بچ کے جائیں گے کہاں شہر سے عیاروں کے
جس طرف دیکھیں وہ ہے دامِ نہاں کی صورت

رہبر و راہِ محبت ہی کو کام آئیں گے
نقش کچھ میں نے وہ چھوڑے ہیں نشاں کی صورت

زندگی ہوتی ہے دشوار کسی کی اُس دم
دل کا ہر ایک یقیں جب ہو گماں کی صورت

کھاتے آئے ہیں سبھی اہل محبت یہ فریب
جانِ جاں بھی ہے لگے دشمنِ جاں کی صورت

دل میں کچھ ایسی بھی باتیں ہیں مناظرؔ اپنے
جن کو حاصل بھی نہیں کوئی بیاں کی صورت

○

پرتپال سنگھ بیتاب

(ممبئی، بھارت)

ہے جو ظاہر میں جو گیانہ لباس
اِس کے پیچھے چھپے ہیں بھوگ وِلاس

ابن الوقت ہیں حقیقت میں
یہ جو مشہور ہم ہیں وقت شناس

بے شک اُونچے ہم اُڑتے پھرتے ہیں
اندر اندر بھئی ہے آس ہراس

ہر کوئی ہر کسی سے ڈرتا ہے
چہرہ چہرہ ہے اِک بلا کا ہراس

جانے ہم کیسے پار آن لگے
اڑ گئے تھے بھنور میں ہوش و حواس

پانچ دریا تھے ایک تھا پنجاب
اور پانی میں تھی غضب کی مٹھاس

راستہ ہی غلط چُنا ہم نے
تھا سفر ختم جب ہُوا احساس

کوئی پانی جسے بُجھا نہ سکا
میرے اندر ہے اِک عجیب سی پیاس

ہیں تو مٹّی کی مُورتیں بیتابؔ
عام پتھر ہو کوئی ہو الماس

○

اشرف جاوید

(لاہور)

دبی ہی رہنے دو، چھیڑو نہ آتشیں کوئی بات
بھڑک اُٹھے نہ مری راکھ میں کہیں کوئی بات

اِسی لیے بھی تمھیں کچھ نہیں دلاتا یاد
جکڑ نہ لے ترے پاؤں ابھی یہیں کوئی بات

کبھی کلام تو کر میرے رو بہ رو آ کر!
کبھی بتا تو سہی دل کے اے مکیں! کوئی بات

جو زخم تم نے دیا تھا، وہ بھر نہیں پاتا
وہی، جو تم نے کہی اور تو نہیں کوئی بات

میں خاک چھانتا رہتا ہوں رات دن بیٹھا
گرہ کھلی، تو گری تھی یہیں کہیں کوئی بات

زمانے بھر میں کوئی بھی ملا نہ اُس جیسا
کسی کسی میں جھلک تھی، کہیں کہیں کوئی بات

بھلا کے گزرے زمانے مزے میں ہے وہ بھی
اُسے بھی میری طرح یاد ہی نہیں کوئی بات

کبھی کبھی سرِ ساحل بھی کچھ نہیں ملتا
کبھی کبھی نظر آتی ہے تہ نشیں کوئی بات

کبھی کبھی اُسے بے بس بناتی ہے کوئی یاد
کبھی کبھی اُسے کرتی ہے چیں بہ چیں کوئی بات

○

طاہرہ۔۔۔سنو۔۔۔!

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

''سنو ، میری بات سنو،لمس تو بس اک احساس کا نام ہے۔ احساس کروتو ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔لمس اپنی ذات میں خوداک زبان ہے۔اک بھاشا ہے۔ یہ بھاشا سمجھ میں آنے لگے، دل کے تراوں کو چھو لے تو یہ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔اس زبان کے اپنے قاعدے ہیں،اپنے اصول وضوابط،کوئی گورا، کالا،مرد،عورت،مشرقی،مغربی اس سے انکارنہیں کرسکتا۔اس بولی کو جان لو،سمجھ لو، زندگی آسان ہو جائے گی۔لمس تو صرف اک احساس کا نام ہے۔ احساس زندہ، احساس موجودتو ''ہے'' کے زمرے میں ورنہ کچھ بھی نہیں۔ کرخت سے کرخت لمس بھی احساس نہ ہوتو کچھ بھی تو نہیں۔تم میری بات سمجھ رہی ہو؟ دیکھو میری بات کی گہرائی کو سمجھو، میں تمہیں کیا بتانا چاہ رہی ہوں؟''

رِداعلی نے اُس روتی بلکتی لڑکی کو دیکھا مگر وہ کہاں کچھ سمجھنے والی تھی، بس روئے چلی جا رہی تھی۔اس کے بلکنے میں ایک ہی فریاد تھی۔خود پہ ہونے والے ظلم کی فریاد،المیہ بیان کرتی تھی اوراپنے مجروح اور کھلے ہوئے احساس پر ماتم کناں تھی۔وہ اپنی روح پہ لگے زخموں کوٹٹول رہی تھی۔اپنا کتھارس،اپنی کتھا، اپنا مجروح احساس یا پھرخود کواحساس سے ماورا کرنے کی داستان تھی!

''دیکھو!لمس ایک برقی ننگے تار کی مانند ہے۔ بہتا کرنٹ۔۔۔اس کے سوئچ کو آن آف کرنے کا ہنر ہرعورت کو آنا چاہیے ورنہ زندگی ہرلحہ مجروح ہو گی، بے حرمت ہوگی۔۔۔تم سن رہی ہو نا، سمجھ رہی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں تم سے؟''

مگر طاہرہ کب سنتی تھی، کب کچھ سمجھتی تھی ، وہ تو بس زارزار روتی تھی۔ایک فریادوآہ وفغاں تھی اُس کے لبوں پر،اس کی آنکھوں میں۔رِداعلی کچھ دیر کو خاموش ہوگئی اور بس آہستہ آہستہ اس کے ہاتھوں کو اپنے ملائم ہاتھوں میں لے کرتھپتھپانے لگی۔اُس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھرنے لگی۔ طاہرہ کے آنسوتھمنے لگے۔

رِدادھیرے سے بولی۔

''دیکھامحسوس کیالمس کی زبان کو،کتنی پرتاثیر ہوتی ہے یہ۔۔۔!''

طاہرہ جو کچھ پرسکون ہوگئی تھی،اک دم تڑپ کر بولی۔

ہاں محسوس ہوتی ہے،محسوس ہوئی لمس کے جبر کو سہا تازیانے کی طرح،زخم زخم ہوں میں اسی لیےتو روتی ہوں۔اگر نہ سمجھتی، جانتی، نہ محسوس کرتی تو کیوں آتی آپ کے پاس۔۔۔؟''

رِداعلی کچھ دیر کو لا جواب سی ہوگئی۔کچھ دیر خود کو مجتمع کرتی رہی۔ہمت جٹاتی رہی بولنے کو۔پھر گویا ہوئی۔

''ہاں!میں سمجھتی ہوں اور یہی تو تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں کہ عورت کو یہ زبان اس طرح جاننا چاہیے کہ اس کا کنٹرول سوئچ اپنے ہاتھوں میں رکھے۔۔۔بالکل ویسے جیسے کوئی آواز نہ سننے کو جی چاہےتو کانوں میں روئی ٹھونس لی جاتی ہے۔مجھےلگتا ہے کہ تمہیں اپنے زخم کھول کر دِکھانے پڑیں گے تبھی سمجھوگی۔ یوں بھلا کیسے جانوگی؟''

یہ کہہ کر رِدا نے یوں سر جھکالیا جیسے سینے کے داغ خود گویا ہوں۔

''پہلی بار یہ سوئچ میرے ہاتھ تب لگا جب۔۔۔جب بہت چھوٹی تھی۔میرا بڑا بھائی ایک وحشی جانور تھا۔ہاں وہ مجھ پر جانوروں کی طرح ہی تشدد کرتا تھا۔جانے مجھے جانور سمجھتا تھا۔میں روز اُس سے مار کھاتی تھی اور روزجسم سے زیادہ روح زخمی ہوتی تھی۔زارزار گھنٹوں روتی رہتی۔ایک وقت آیا کہ وہ مجھے مارنے کو بڑھتااور میں خوف سے پہلے رونا شروع کردیتی۔حالانکہ چوٹ کی بدن کو عادت ہوگئی تھی مگر روح کو عادت نہیں ہو پا رہی تھی۔ایک دن میں اپنی اس حالت پہ رو پڑی۔اُس سے اگلے روز جب وہ مجھے مارنے کو بڑھا تو میں نے خود کو حالات وواقعات سے بے نیاز کرلیا جیسے یوگی خود کو کر لیتے ہیں۔کسی خیال کسی سوچ کسی مراقبے میں چلے جاتے ہیں۔یہ عجب مشق تھی۔عجیب یوگا تھی۔ایک مشقِ ستم تھا، اور ایک ستمگر۔وہ کچھ دیر مجھے مارتا رہا مگر جب مار کو بے اثر دیکھا تو جیسے ہار سا گیا۔ کچھ دن کے بعد اُس نے مجھے مارنا چھوڑ دیا۔تب پہلی بار یہ سوئچ میرے ہاتھ لگا۔ ایک جبر کو،لمسِ کرخت کو میں نے پہلی بار اس سوئچ کی مدد سے شکست دی۔''

طاہرہ تڑپ کر بولی۔

''نہیں نہیں غلط مماثلت ہے۔میرے بدن کے زخم میری روح کے زخموں سے گہرے نہیں ہیں۔میری روح مجروح ہے، جوظلم جو جبر میرے ساتھ ہوا وہ تو بدترین ہے۔اس سے زیادہ کسی کی ہتک اور کیا ہوگی!''

بس اس سے آگے اُس سے کچھ بولا نہ گیا۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندہ لگ گیا۔وہ پھر سے رونے لگی۔روتی چلی گئی۔کسی طرح اُس کی تشفی نہ ہوتی تھی اور بس وہ جب سے آئی تھی روئے چلے جا رہی تھی۔اک ہی فریاد کئے جاتی تھی۔

''کیا کروں میں! بڑا ظلم ہوا میرے ساتھ۔انصاف ملنے کے بعد بھی مجھے نہیں لگتا کہ میرے ساتھ انصاف ہوگیا،میری روح داغدار ہوگئی ہے، میلی ہوگئی ہے،اس کثافت کو کیسے دھوؤں؟''

رِداعلی اُسے پھرتھپکنے لگی۔اُس کے ہاتھوں اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے اُس کے آنسوؤں کو پوروں پہ چنتے وہ پھر بولی۔

''یہی نکتہ تو سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں،تم کیوں نہیں سمجھ رہی۔تم

نے اس سوچ کو کیوں نہیں کھوجا؟ اس کو ہاتھ میں لے لیتی تو زندگی آسان ہو جاتی۔''

طاہرہ پھر بلکنے لگی۔

''رِدابی بی! یہ سب کہنا آسان ہے۔ جو مجھ پر بیتی وہ میں ہی جانتی ہوں۔ کس جہنم میں جلی ہوں، اُس آگ میں سب سوچ پگھل جاتے ہیں۔ آپ بھی نہیں جانتیں، نہیں سمجھ سکتیں۔''

رِدا اُس کی بات کی تلخی کو سمجھ بھی سکتی تھی اور اُس کی تشفی بھی کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی تو بہت سے دوزخ جھیل چکی تھی، آخر عورت تھی! وہ پھر بولی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں، ایسے مت کہو، میں جانتی ہوں، میں سمجھ سکتی ہوں، ایک عورت، ایک حساس عورت کیسے ممکن ہے کہ لمس کے جبر کو نہ سمجھ سکے۔ ساری زندگی ان دوزخوں ہی میں تو گزار دیتی ہے وہ!''

رِدا طاہرہ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''میری بات سنو، جان لو، میں نے اس سوچ کو اِک بار کھوج کر بار بار تب آن آف کیا جب مجھے اس کی ضرورت پڑی۔ تبھی زندگی کو آسان کر پائی ہوں خود پہ!''

اور طاہرہ جیسے استفسار کرتی تھی کہ کب، کیسے؟ رِدا پھر جیسے خود کو مجتمع کرنے لگی۔

''بہت دفعہ تب تب جب۔۔۔ ایک بار ایک دوکان پر اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی۔۔۔ اک نوعمر لڑکی تھی، نوخیز سی۔۔۔ دوکان دار نے تھان کھول کر ہمارے زانوں پر کپڑا پھیلا دیا۔ کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ اُس نے تھان پھیلاتے اپنے ہاتھ میرے زانو پہ رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا کہ پورے بدن میں ایک کرنٹ پھیل گیا ہو۔ ناگواری اور کراہیت سمٹ کر میرے چہرے کو لہو رنگ کر گئی۔ میں نے ہمت مجتمع کر کے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہاں بے حیائی اور معنی خیز غلیظ اشارے تھے۔ میں نے ماں کی طرف اور دکان میں اِدھر اُدھر لوگوں کے رش کو دیکھا اور جانے کیسے انجانے میں میرا ہاتھ اسی سوچ پہ جا پڑا۔ میں نے اپنے بدن کو سخت اور بے جان و بے حس کر لیا۔ اتنا سخت کہ اُس کی لذت کا بحر خشک ہو گیا اور کھسیانا سا ہو کر اُس نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ سنا تم نے طاہرہ!''

طاہرہ پھر رو دی۔

''آپ یہ کہہ سکتی ہیں رِدابی بی! کیونکہ آپ نے اُس جبر کو شکست دے دی۔ میں نہیں دے پائی۔ میرا بدن بھی تار تار ہوا اور وہ گھن میری روح کا داغ بن گئی۔ اب کیا کروں میں، گھن رچی ہے مجھ میں؟ کیسے خود کو پاک کروں، آپ کے پاس انصاف کے لیے آئی تھی۔ سوچا تھا، آپ سے مل کر میرے زخم مندمل ہو جائیں گے، مرہم مل جائے گا، تشفی ہو جائے گی۔ مگر ہوا کیا؟ آپ کے پاس جو کچھ آپ کے بارے میں آپ کی نیک خصلت کے بارے میں سن کر آئی تھی وہ سب پورا ہوا۔ آپ کی مدد سے ظالموں کو سزا ہو گئی۔ مجھے انصاف بھی مل گیا۔۔۔ مگر پھر مرے دل کی آگ کیوں سرد نہیں ہوتی؟ مجھے کیوں لگتا ہے کہ مجھ پر لگی غلاظت اب کبھی نہیں دُھل سکتی؟؟ یہ غلاظت روح کا حصہ بن گئی ہے۔ اس کی تشفی، اس کی صفائی کیسے ہوگی؟ یہ سمجھ نہیں آتا، اس روح کے داغ کو کیسے دھوؤں؟''

رِدا پھر تحمل سے بولی۔

''یہی تو کتنی دیر سے سمجھا رہی ہوں کہ لمس کا جبر بدن کو تار تار تو کر سکتا ہے مگر روح کو نہیں۔ بس اس سوچ کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا مگر اس مردانہ غلیظ معاشرے میں جانے کہاں کہاں تمہیں ہر طرح کے جبر کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔ کوئی گندے غلیظ رینگتے ہاتھ۔۔۔ کسی کی کہنی۔۔۔ کوئی غلیظ نظریں۔۔۔ کسی کی مکروہ انگلیاں۔۔۔'' وہ بولتے بولتے بھی جیسے ہانپ گئی۔۔۔

''تو، تو تم لمس کے کس کس جبر کو روح کا داغ بناؤ گی۔''

طاہرہ نے کرب کی شدت سے ایسے آنکھیں بند کر لیں جیسے ذبح کرنے کو کسی نے چھری گلے پہ رکھ دی ہو۔

''نہیں ردابی بی! آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ آپ جو مثالیں دے رہی ہیں ان میں کوئی مماثلت نہیں۔ بہت فرق ہے، بہت فرق۔ بالکل ویسے ہی جیسے اک چھالے اور پوری طرح جل کر کوئلہ ہو جانے والے میں ہو۔ ویسا فرق جیسا اک چھوٹا سا زخم آ جانے اور کسی کو ذبح کر دینے میں ہو۔ ویسا فرق جیسا ایک گندگی کے چھینٹے اور کسی کے غلاظت بھرے گٹر میں گر جانے میں ہے۔ ویسا فرق جیسا حلال و حرام میں ہو۔ ویسا فرق جیسا نمکین و نمک کی کان میں نمک ہو جانے میں ہو۔ رِدابی بی! میں آپ کو اور۔۔۔''

یہ کہہ کر طاہرہ سے مزید بولا نہ گیا اور وہ پھر روتی چلی گئی۔ عجب لڑکی تھی۔۔۔ بس روئے چلے جا رہی تھی۔ اب کے رِدا دُکھ، صدمے، رنجیدگی بھری خفگی سے بولی۔

''اور تم بھی نہیں سمجھ سکتی، جو زندگی میں نے گزاری تم بھی اُس کا تصور نہیں کر سکتی، تم تو ایک بار لمس کے اس جبر کے ہاتھوں مجروح ہوئی ہو، میں تو ہر روز۔۔۔ تمام عمر۔۔۔ تم کیا جانو۔۔۔!''

یہ کہہ کر رِدا کی آنکھوں سے دو آنسو ایسے ٹپکے جیسے پورا سمندر اِن دو اَشکوں میں درد سمیت سمٹ آیا ہو۔ طاہرہ اپنا رونا بھول کر حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

''کیا مطلب آپ کا رِدابی بی! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''ہاں سچ کہہ رہی ہوں میں۔'' رِدا شکست خوردہ لہجے میں بولی۔

''بالکل سچ کہہ رہی ہوں میں، تم کیا جانو، میں نے زندگی کس دوزخ میں گزار دی۔ میں سوختہ جاں تھی تو تم جیسے لوگوں کا درد سمجھ سکی، سمجھ کر کچھ کر سکی، کوئلے سے ہیرا بننا بھی بہت دشوار گزار عمل ہے۔ مگر پہلے کوئلہ ہونا بھی آسان

نہیں، تم سے بہتر کون جان سکتا ہے!''

طاہرہ کے سارے آنسو حیرت سے منجمد ہو گئے۔

''تو کیا آپ بھی! کیا آپ کے ساتھ بھی! کچھ ایسا۔۔۔''

لفظ جیسے ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے اُس کے لبوں پہ۔۔۔

''نہیں، وہ تو نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ مگر کیا بدن تار تار صرف اک صورت میں ہوتا ہے۔ کیا لمس کے جبر کی صرف اک وہی صورت ہے جو تم نے سہہ لی اپنی جان پہ؟ نہیں طاہرہ! یہ جبر تو احساس کا نام ہے، یہی تو سمجھانا چاہ رہی ہوں میں تمہیں۔۔۔!''

ایک خاموشی آن ٹھہری تھی بیچ میں۔۔۔

''دیکھو میں نے تمام عمر اُس شخص کے ساتھ گزار دی جس کے ساتھ میرا روح کا رشتہ نہیں بنا، اور اُس کے بستر میں سو کر بھی میری روح کنواری اور پیاسی ہی رہی۔ اس کے وجود میں ضم ہو کر اُس کے وجود کو اپنے جسم کا حصہ بنا کر نئی زندگیوں کو جنم دے کر بھی مجھے ہر روز لگا کہ میں نے اپنے آپ کو کھو دیا، میرے دل میں کبھی آمادگی نے جنم نہیں لیا۔۔۔ لمسِ لطیف میرے لیے لمس کا جبر و جہنم بن گیا۔ زندگی خستہ و سوختہ ہوتی رہی۔ ایسے میں ایک دن اچانک پھر میرا ہاتھ اسی سوئچ پہ جا پڑا۔ میں نے اسے آف کر دیا۔''

رِدا یہ کہہ کر ہانپنے لگی۔

''اور پھر زندگی مجھ پہ آسان ہو گئی۔ اب صرف میرا جسم ہوتا ہے، روح الگ کھڑی نظارہ دیکھتی ہے اور بدن ساری شکنیں جھاڑ کر پھر کھڑا ہو جاتا ہے۔۔۔ بلکہ طاہرہ! ایک بات کہوں، بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ سوئچ اتنی سختی سے بند ہو جاتا ہے کہ میری کنواری روح بدن کو بھی ساتھ لے جاتی ہے اور اُس کے نیچے صرف خاک کا ڈھیر پڑا ہوتا ہے۔''

- بقیہ -

پُورے آسماں کے برابر کہکشاں

روتے دلوں اور ہنستے چہرے والے لوگوں کو دیکھ کر خود پہ بھروسہ کرنے لگتا ہوں تو سارہ شگفتہ دل کو پھاڑ دیتی ہے۔ محبت کے جس موسم میں پیار کرنے والے ایک ہونے کا سوچتے ہیں، میں نے تمہیں زندگی کے تپتے صحرا میں جھلستی ریت پر ننگے پاؤں چلنے پر مجبور کیا مگر یاد رکھنا کہ میرے اشکوں کی برساتیں اور میرے دل کے تمام موسم تمہارے لئے ہیں، یاد رہے اس بار شاہی فرمان لکھ کر اس پر دستخط کرنا نہ بھولنا، اس جنم کی قید نہیں کیونکہ سچی کتابوں میں دوسری زندگی کا ذکر ہے۔

اس نے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا اور اپنی گڑیا کو کونے میں پڑے کباڑ میں چھپایا اور خود لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔ اس کی شادی کی پہلی شام تھی، ماں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ حجلۂ عروسی میں بیٹھی گڑیا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا، اس کی شبیہہ بالکل اس کے جیسی تھی۔ ویسے بھی دوسری گڑیا کو اصل اور نقل سے کچھ غرض نہ تھی۔ رہا اس کا مسئلہ تو اس نے اپنے آدرشوں پر پیشگی اپنی عمر کے سو سال قربان کر دیے تھے اور اسے پورا یقین تھا کہ اس کی عمر جتنی بھی لمبی ہو جائے، سو سال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

- بقیہ -

بے امانت رفاقتیں

ہوا کے ایک تیز جھونکے نے سارا منظر بدل ڈالا۔

گھبرا کر اس نے سامنے نگاہ کی۔ جہاں درخت سر جھکائے کھڑے تھے اور سورج پل پل ڈھل رہا تھا۔

کہیں دُور پیپل کے درخت کی شاخ پر بیٹھی فاختہ دکھائی تو نہ دی مگر یوسف کھوہ۔۔۔ یوسف کھوہ۔۔۔ کی آواز ابھرتی، ڈوبتی رہی۔ اس پاگل کو دیکھو۔۔۔ صدیوں سے اسی طرح پکارے جاتی ہے۔

خاص کر گرمیوں کی دوپہروں میں اس کی آواز اداس کر دیتی ہے۔ کوئی اس سے پوچھتا بھی نہیں۔۔۔ آخر تو یوسف کے لیے کیوں روئے جاتی ہے۔۔۔ کیوں پکارے جاتی ہے۔ کوئی اُسے چُپ کروائے، کوئی اُسے سمجھا دے۔ انسانوں کی سیاست میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔

پُورے آسماں کے برابر کہکشاں

شاہد جمیل
(گوجرانوالہ)

تمہاری محبت میرے دِل میں ڈر کی طرح بیٹھ گئی ہے۔ ماں سمجھتی ہے میں چھت پر پتنگ اُڑانے آتا ہوں۔ اُسے کیا معلوم کہ چھت پر تو میرا دل پڑا ہے۔ اس نے کچرے میں پڑی گُڑیا کو اُٹھایا، قمیص سے صاف کیا اور اسے سامنے رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ ماں کو نہ ہی معلوم ہو تو اچھا ہے، ایک بات تو یہ کہ میری عُمر گُڑیوں سے کھیلنے کی نہیں اور دُوسری بات یہ کہ میری ماں مادی سوچ کی حامل خاتون ہے۔

مجھے پتہ ہے تمہیں میری دونوں باتیں بُری لگی ہیں۔ اپنی پہلی بات کی تشریح کے طور پر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ازخود تمہیں بھی تو سنجیدہ طبع، بلند شعار اور پُر وقار لوگ اچھے لگتے ہیں۔ تم بھی تو یہی چاہتی ہو کہ جو تمہارا ہو وہ تُمہارے جیسا ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تُم ایک عام لڑکی نہیں ہو۔ جب تم اپنی عُمر کے مطابق کوئی بات نہیں کرتیں تو میرے لب کیسے ہِل سکتے ہیں۔ تم عام رویوں کی مخالفت کرتی ہو تو میں معمولی کاموں میں اپنی توانائیاں کیسے ضائع کرسکتا ہوں۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب ہم ایک دوسرے میں رہا کرتے تھے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، ہنسنا بولنا اور لکھنا کس قدر مختلف ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگوں کی شخصیت کتنی جامع اور جاذبِ نظر ہوا کرتی تھی۔ جب تم ہم بن کر اور ہم تم بن کر ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے تو کس درجہ فرحت محسوس ہوتی تھی۔

تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا کہ روحانی طور پر ہی نہیں، جسمانی طور پر بھی ہم دونوں کے بدن پیار کی پہلی بارش میں بھیگ کر صندل کے جنگلوں کی طرح مہکنے لگے تھے۔ پھر ہم نے پت جھڑ کا انتظار کئے بغیر اپنے جسموں کے ہرے پتے جھاڑ دیے۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر صرف ہم مہکے تو زندگی کا بھور بن سُونا پڑ جائے گا۔ اور پھر ہم نے اپنے حصے کا پانی اور نمکیات دوسروں میں بانٹ دیے۔ ہم نے یہ سیکھا تھا کہ انفرادی خوشی کا جشن مجموعی معاشرتی بے بسی پر ہنسنے اور دندنانے کے مترادف ہے۔

تمہاری قسم مجھے اپنی پت جھڑ کا ہمیشہ دُکھ رہے گا۔ تمہیں شاید اس دُکھ کا پتہ نہیں، تمہیں اس دُکھ کا پتہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنی تنہائی کا جشن اماوس کی سنسان راتوں میں منایا، ورنہ تو مجھے ہوا، چاند، ستارے سب پیامبر محسوس ہوتے تھے۔ میں نے جب بھی تمہیں یاد کیا ہمیشہ خود سے نکال کر ہی یاد کیا، بالکل ویسے ہی جیسے تم سونے سے ذرا پہلے اور جاگنے کے بہت دیر بعد تک مجھے اپنے آپ سے نکال دیا کرتی تھیں۔ کیسی عجیب محبت تھی ہماری کہ جس کے زیرِ اثر نہ کبھی تم نے خود کو اپنا سمجھا اور نہ کبھی میں نے اپنے آپ کو اپنا سمجھا۔ کتنے عجیب لوگ تھے ہم بھی، اپنی آنکھوں پر محبت کی پٹی باندہ کر بھی سب کچھ دیکھ سکتے تھے۔ ہم نے اپنے اردگرد گھومتے کیڑے مکوڑوں کو اپنے پاؤں تلے نہیں روندا، یہاں تک کہ دانستہ کسی کیڑے کی جان بھی نہیں لی۔

یاد ہے ایک بار تم نے خاموش رہ کر مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے، میں نے کہا اِنفنٹ، یعنی اتنی جو کائنات میں نہ سما سکے۔ تم نے سب کچھ جانتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا کہ یہ تو بڑا عام سا جواب ہے۔ تمہیں میرے اس عام جواب کی توضیح بھی یاد ہوگی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب میں تمہاری محبت دل میں بھر کر آسماں کی طرف دیکھتا ہوں تو پورے آسماں کے برابر کہکشاں پھیل جاتی ہے۔ نظر تھوڑی نیچے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رُوئے زمیں پر کوئی درخت سُوکھا نہیں رہا، تمام پیڑ اپنی زمرد پوشاک پر لعل و یاقُوت سجائے کھڑے ہیں۔ سانس لیتا ہوں تو ہوا کے اجزائے ترکیبی تبدیل ہوتے محسوس ہوتے ہیں اور پھیپھڑوں میں صرف ٹھنڈی میٹھی خوشبو داخل ہوتی ہے۔ چلتا ہوں تو زمیں کے پاؤں کی جھانجھن بجنے لگتی ہے اور رکتا ہوں تو وقت رک جاتا ہے، بیٹھتا ہوں تو پوری کائنات کا گرد و غبار بیٹھنے لگتا ہے، سوچتا ہوں تو سوچوں سے نجات مل جاتی ہے، سوتا ہوں تو نیند آجاتی ہے اور جاگتا ہوں تو خواب کی تعبیر ساتھ ہوتی ہے۔

ہماری محبت کے دیس میں بارود کی گھن گرج کی بجائے فضاؤں میں میٹھے سُر اور الہڑ تانیں بکھرتی ہیں۔ محبت کے دیس میں گولیوں کی جگہ رنگ برستے ہیں اور بارہ مہینے دیوالی کا سمے رہتا ہے۔ میں نے بولتے بولتے آنکھ بھر کر تمہاری طرف دیکھا تو تم جامن کے گھنے سائے میں بیٹھی اس برس آموں کے بُور نہ جھڑنے کا شاہی فرمان لکھ رہی تھیں۔ شاہی فرمان پر دستخط کرنے کی باری آئی تو تم نے قلم توڑ دیا۔ تم اب تک کئی بار شاہی فرمان لکھ کر دستخط کرنے سے پہلے قلم توڑ چکی تھیں، یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی کہ دنیا میں کوئی ایسا قلم نہیں جو تمہارے دستخط کے لائق ہو۔

ہم دونوں کی سوچ میں اتنا فرق ضرور تھا کہ تم محبت کا دیس بسا کر شاہی فرمان پر دستخط کرنا چاہتی تھیں جبکہ میں دستخط کرنے کے بعد محبت کا دیس بسانا چاہتا تھا۔ اب تم کہو گی کہ میں نے کب تم سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اظہار کیسے کرتا کہ ہم دونوں خود سے بے نیاز محبت کے دیس کی آبادکاری کا سوچ رہے تھے۔ ہم دونوں محبت کے معبد میں آشتی کی اذان کے منتظر تھے۔ ہم دونوں پیار کے کلیسا میں گیتا کی حلاوت رچا رہے تھے۔ ہم لوگ گاؤں در گاؤں، بستی در بستی موسم کے سرخ گلاب بانٹ رہے تھے۔ کائنات کا توازن ہمیں اس قدر عزیز تھا کہ ہم دو متوازی خطوط کی طرح کائنات کا چکر کاٹ کر بھی کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں عام لوگوں کی طرح نہ تو ملنے کی جلدی تھی اور نہ خواہش۔ یہ بات تو نہیں کہ ہمیں دوری کا علم نہ تھا مگر کیا کرتے کہ ہمارے کلبد میں

انسانی محبت کی روح حلُول کرگئی تھی۔ ہمیں اپنے مرتبے تک پہنچنے کے لئے اپنی نہیں بلکہ ہماری ضرورت تھی۔

مجھے تم پر فخر ہے کہ تم کبھی نہیں بھٹکیں، میں کبھی کبھی بھٹک جاتا تھا، تبھی تو تمہیں اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں ڈھونڈنے لگتا مگر تم باتوں باتوں میں، میرا دل دکھائے بغیر، مجھے اجتماعی انسانی محبت اور فلاح کے آئینے میں اتار لیتیں۔

پتہ ہے! ہم لوگ محبت کی کہانیاں پڑھ کر جھومنے کی بجائے سوچ میں پڑ جاتے۔ کیٹس سے قدسیہ تک محبت کے بیان نے ہمارے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ براؤننگ سے پریتم تک انفرادی محبت ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ جب ہم ان چھولداریوں سے اپنے سر باہر نکالتے تو ننگے بھوکے انسانوں کو تا حدِ نظر ماتم کناں دیکھ کر اپنے خیموں کی طنابیں کاٹ دیتے۔ پھر وہی جسموں کو جھلساتی دھوپ ہوتی اور ہمارے ننگے سر۔

ہم بڑے عجیب لوگ تھے، ہم نے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، ہم نے کہیں اکتفا نہیں کیا، ہم نے چھاؤں کو تقسیم نہیں کیا۔ ہم نے دنیا کی کسی عدالت کو اس قابل نہیں سمجھا کہ وہ اس جہاں میں ہمارے حصے کا تعین کر سکے۔ ہم نے کبھی انصاف نہیں چاہا بلکہ سدا معاشرے میں انصاف ہوتا ہوا دیکھنا چاہا۔ ہمارے ہاتھ میں قلم تھا اور دل میں درِ لامکاں کی طلب۔ سوچنے کی حد تک میں کبھی کبھی ڈنڈی مار جاتا تھا مگر جونہی میرے پیپر ختم ہوتے، تم فکر مندی سے میری گود میں جاگ کر اپنی ہتھیلی میرے آگے پھیلا دیتیں۔ میں شرارت میں تمہاری ہتھیلی پر اپنا نام لکھ دیتا تو تم گھبرا کر سارے کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھتیں مبادا آج کے لکھے میں کہیں میں یا ہم تو نہیں آ گئے۔ لیکن، میں یا ہم کیسے آ سکتے تھے کہ لکھنے سے پہلے میرے لئے تمہارے نام کی تسبیح ناگزیر تھی اور تمہارا نام اور تمہارا خیال میرے لئے اتنے معتبر تھے کہ میری ذات کے ذرے خود پسندی کے مدار سے نکل کر پوری کائنات کا احاطہ کرتے ہوئے لفظ محبت کا ورد کرنے لگتے، بس یہی میری عبادت تھی اور یہی میری زندگی کا حاصل۔

پھر میں عام کیسے سوچ سکتا تھا یا عام کیسے لکھ سکتا تھا، مگر یہ بھی تو حقیقت تھی کہ میری آنکھ عام آنکھ تھی، میرا دل عام دل کی طرح اور میرا ذہن عام ذہن جیسا تھا۔ میں کبھی کبھی خود کو روتا تھا، اپنے خانے میں بٹ جاتا تھا، کبھی کبھی اپنے بارے سوچتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم بھی اس عذاب سے گزرتی رہی ہو لیکن ہم نے کبھی ایک دوسرے سے اپنی روئی ہوئی اور بوجھل آنکھوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کے دل پر تسلی کے ریڈی ایٹر نہیں لگائے۔ بس، جلتی آگ میں یونہی خود کو جلنے دیا اور سوچ کے آتش دان میں مزید لکڑیاں ڈالتے رہے۔

کبھی کبھی میں تھوڑا سا خود غرض ہو کر سوچتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں لیکن تم ٹھیک کہا کرتی تھیں کہ ہماری کوشش کسی دکھاوے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے اور اپنے خوابوں کی دنیا کے لئے ہے۔ اپنے سوا ہمارا کسی پہ کوئی احسان نہیں۔ ہمارے آدرش ہماری زندگی ہیں اور ہمارا ہونا ان سے مشروط ہے اور ہم اتنے کم دل نہیں کہ ایک زندگی سے ہار مان جائیں۔ اپنی بقا کسے عزیز نہیں، جیتے جی کون مرنا چاہتا ہے۔ بس یہی وہ بات ہے اور یہی وہ حوصلہ ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونے پر بھی زندہ رکھ سکتا ہے، ورنہ یہ زندگی، یہ زہر پُڑیا کی مار زندگی ہمیں مجبور نہیں کر سکتی۔

ابھی وہ اپنے مکان کی دوسری چھت پر پڑی گڑیا سے باتیں کر رہا تھا کہ ماں نے اسے دوپہر کے کھانے کے لئے آواز دی۔ اس نے جلدی جلدی اپنی گڑیا کو ایک کونے میں پڑے کباڑ میں چھپایا اور کل اپنی دوسری بات کی وضاحت کا وعدہ کر کے لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔ اگلے دن وہ پھر اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود چھت پر آ گیا، ماں چیختی رہی کہ تمہیں دھوپ لگ جائے گی لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ اسے پتہ تھا کہ اس کی ماں موٹاپے کی وجہ سے سیڑھی نہیں چڑھ سکتی اس لئے اس نے اطمینان سے اپنی گڑیا نکالی اور اس سے اپنی دوسری بات شروع کی۔

دوسری بات ماں کی مادہ پرستی سے متعلق تھی، ماں ہی کیا پورا خاندان بلکہ پورا معاشرہ ظاہری چمک دمک کی لپیٹ میں تھا۔ اور ہاں! یہ میری ماں کا ہی نہیں بلکہ تمہاری ماں کا بھی مسئلہ ہے، مسئلہ ہے تو نہیں پر بنا لیا گیا ہے۔ ہم لوگ اسی طرزِ معاشرت کے پروردہ ہیں۔ ہمیں بھی انہی گوشت پوست کی ماؤں نے جنم دیا ہے۔ تم نے دیکھا! ہم پھر بھی ایک دوسرے سے شرمندہ ہیں، شاید یہی ہمارا المیہ ہے اور شاید یہی ہمارا دکھ ہے۔ ہم زندگی میں جب کبھی ملیں گے تو اسی دکھ اور اسی کمی کے ساتھ ملیں گے۔ ہم ایک دوسرے کی نظر میں بہت بلند ہیں لیکن کبھی کبھی ایک دوسرے کو بہت چھوٹے لگیں گے، ایسے میں آرام اور چین کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

ہم نے گویا اپنے ہی ہاتھوں اپنے سر قلم کر دیے ہیں۔ ہم نے خود اپنی ستارہ آنکھیں اپنی ایڑیوں تلے رگڑ دی ہیں۔ ہم لوگوں نے اپنے دل پتھر کے کر لئے، کیا کرتے! ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ آنکھیں اگر دیکھنا چاہتی تھیں تو صرف ایک دوسرے کو، دل دھڑکتے تھے تو صرف ایک دوسرے کے لئے اور ذہن سوچتے تھے تو صرف ایک دوسرے کی خاطر۔ ہم کیسے گزارہ کرتے محدود دل، محدود ذہن اور محدود آنکھوں کے ساتھ۔ ہمیں تو ماں کے سامنے سرخرو ہونا تھا، بہن بھائیوں کے لئے مثال بننا تھا، ہمیں تو دنیا کے ساتھ چلنا تھا۔

ہماری محبت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے مدار کی غلام گردش میں رہنے دیا۔ اگر یہ دنیا ہماری نہیں تھی تو ہمیں کبھی اس سے اپنا حصہ وصول کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ سچی بات ہے کہ میں نے کبھی تمہیں بے مدار کرنے کا نہیں سوچا۔ جس رفتار سے دنیا میں محبتیں نفرتوں میں بدل رہی تھیں اس اعتبار سے شاید یہی اچھا تھا کہ آپس میں دور رہ کر ہی سہی مگر محبت کا بھرم قائم رکھ لیا جائے۔

باقی صفحہ ۷۳ پر ملاحظہ کیجیے

بے امانت رفاقتیں

منیرہ شمیم
(اسلام آباد)

کئی موسم آئے اور گذر گئے، مگر اس کے دل پر تو ایک ہی موسم آ کر ٹھہر گیا تھا۔

''بسنت رُت کا موسم''

سورج کی زرد دھوپ آنگن میں لگے پودوں پر چمک رہی تھی۔ اچانک آسمان پر ایک پتلی سی بدلی نے سورج کی روشنی کو بسنتی دوپٹے کے رنگ میں بدل ڈالا۔

دوپہر کی دھوپ ڈھلنے والی تھی۔ اس دھوپ کو پکڑنے کے لیے وہ باہر صحن میں نکل آئی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنی دُھندلی آنکھوں سے سامنے دیکھا اور سوچنے لگی۔ تب اور بات تھی۔ اب تو سوچنے کے لیے بھی مجھے دوسرا جنم لینا پڑے گا۔ اس جنم میں تو میری سوچیں بھی سولی پر چڑھ چکی ہیں۔ تمام زندگی، سارے عقیدے جو گھٹی میں گھول کر پئے تھے وہ یقین جو زندگی نے دیئے تھے ختم ہو چکے تھے۔

پھر آسمان پر نگاہ کی۔۔۔ وہ سرمئی بدلی اور وہ گیت شاید کسی اور جنم کی بات تھی یا پھر کسی اور دنیا کی۔۔۔ مگر نہیں وہ تو کسی اور دنیا میں گئی ہی نہیں تھی۔ جس میں سرسوں کے پھول کھلتے ہی بسنت رُت آ جائے۔ ہاں یہ اس جنم کی بات ہے۔ سرمئی بدلی اور وہ گیت جو یوسف نے اس کے لیے گایا تھا۔ بسنت کے دن ہی تو اس نے سرمئی دوپٹہ اپنے کندھوں پر ڈالا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے بالوں کو سکھانے کے لیے دھوپ میں نہا رہی تھی۔ جب ہی تو اس نے وہ گیت سنا تھا۔ ''سرمئی دوپٹے میں تیرا روپ سنہری بدلی سا'' اور سچ مچ اس وقت آسمان پر ایک پتلی سی بدلی آنچل کی طرح لہرا رہی تھی۔

یوسف اس وقت آسمان پر اڑنے والی عمر میں داخل ہوا تھا، اس کا سراپا، اس کی سریلی آواز، اور اس کا اندازِ تکلم ایسا تھا کہ کوئی بھی اُسے نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ خود بھی عمر کے اس حصے میں تھی جہاں ہر لڑکی کے دل میں محبت کی ایک ہلکی سی کسک کہیں چھپی ہوتی ہے۔ وہ بھی خدا کی ذات کی طرح اپنے محبوب کا ایک حسین تصور لئے آزاد پنچھی کی طرح رنگین فضاؤں میں اڑتی پھرتی، جس کے نزدیک چاند بے داغ اور زندگی چاندنی رات تھی۔ لیکن ایسا نہ تھا، چاند بے داغ نہ تھا اور زندگی چاندنی رات نہ تھی۔

پھر بڑی تیز دھوپ نکلی اور خوابوں کی بدلی اڑ گئی۔ یوسف ایک دم بڑی بڑی خواہشوں کے خواب دیکھنے لگا۔ خواب بھی تو وہی دیکھتے ہیں جن کے پاس ہوتا کچھ نہیں۔ یا پھر کوئی محرومی۔۔۔!

اس کے والدین نے اس کی شادی ایک امیر گھرانے میں کر دی۔ شادی تو وہ سرمئی دوپٹے والی سے بھی کر سکتا تھا۔ مگر اس کے تو درشن ہی اونچے تھے۔ وہ شہر چلا گیا۔ جہاں اس کے سسر کا ایک شاندار بنگلہ تھا۔ ایک فوجی افسر کا داماد ہونے کے ناطے سسر کو ملی ہوئی مراعات پر عیش کرتا۔

اب اس کی خبریں بھی آنا بند ہو گئیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ خوش تھا بھی یا نہیں۔ وہ جو زندگی کی ساری آسائشوں کے لیے محوِ سفر تھا منزل پر مطمئن تھا یا نہیں۔

مگر اس کے خیالوں کے کھیت پر ابھی تک سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ان خیالوں نے اُسے برباد نہیں ہونے دیا۔ مگر اس گیت نے اُسے کبھی آباد بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ بسنت رُت ہر سال آتی۔ اُسے سب کچھ اچھا لگتا۔ سرسوں کے پھول، سورج مکھی، بدلتی رُت اور سرمئی شام کا جادو!

جب وہ اس سے جُدا ہوا تھا وہ لمحہ کہیں اندر جا کر چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس کی موجودگی کا احساس تب سے اسی طرح تھا۔ ہر دم، ہر لمحہ، ہر آن اس پر خاموش بصارت کی طرح سایہ کئے ہوئے۔۔۔ خاموش بصارت کے اس گنبد میں کبھی موجود، کبھی غیر موجود۔

محبت کے واقع کے بعد وہ بہت اداس اور بیمار رہنے لگی۔ ایک دن وہ کمرے میں چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ جب ایک چڑیا اڑتی ہوئی آئی اور کھڑکی کی سلاخوں پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اڑ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دوبارہ آ کر ان سلاخوں پر پھر بیٹھ گئی۔ یہ دیکھ کر اس نے سوچا کہ اس نے خود کو کیوں ایک کمرے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ اس چڑیا کی طرح آزاد کیوں نہیں ہو سکتی۔ جو کھڑکی کی سلاخوں پر بیٹھ کر بھی جب چاہے اڑ سکتی ہے۔

پھر ایک روز وہ اپنے خیالوں اور یادوں کی گٹھڑی کو دل کے بستے میں باندھ کر شہر چلی آئی۔ مزید پڑھائی کرنے اور ملازمت کرنے کے لیے۔۔۔ یا شاید اپنے خیالوں کی خوراک ڈھونڈنے۔۔۔ بے شک شہر میں یہ خوراک بہت تھی۔ نئی سوچ، نئی کتابیں، نئی دنیا۔۔۔ مگر نیا آدمی تو یہاں بھی نہیں تھا۔ بلکہ پرانا بھی کوئی نہ تھا۔

گاؤں کے راستے کی دھول گاؤں میں ہی رہ گئی۔ اندر کا اندھیرا اندر ہی رہا، باہر روشنی تھی۔ اس نے اندر جانا ہی چھوڑ دیا۔ نئے علم اور ادب کی شناسا۔۔۔ اس نے خود اپنے لیے ایک خوبصورت شخصیت تراش لی۔ مکمل Self Made، بسنت کی دھوپ جیسی!

گریجویٹ ہونے کے بعد اس نے نوکری کے حوالے سے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ ان دنوں جب راہ چلتے چلتے وہ بڑی بڑی کوٹھیاں دیکھتی تو تصور ہی تصور میں اپنے لئے کوئی چھوٹا سا پورشن دیکھتی۔ کوئی گھاس کا ہرا بھرا چھوٹا سا لان بیٹھنے کو ایک پرسکون بالکونی کتاب پڑھنے کو اور ایک برآمدہ برسات کا نظارہ لینے

کو۔۔۔پھر سوچتی یہ کیسے لوگ ہیں جن کے پاس بڑے بڑے لان ہیں مگر کبھی اندر سے باہر نہیں نکلتے۔کبھی حسنِ فطرت کا نظارہ نہیں کرتے۔

جس روز اُسے گھر ملا۔تو اُسے یوں لگا جیسے اس کا وہ چھوٹا سا گھر ایک بڑے ہوٹل سے بھی زیادہ شاندار ہے۔یہ سچ ہے انسانوں کے لیے گھر اور پرندوں کے لیے آشیانے یہ سب کتنی ضروری پناہ گاہیں ہیں،خواہ جیسی بھی ہوں۔

اس کے چھوٹے سے گھر میں ایک کمرہ،ایک باورچی خانہ اور ذرا سا برآمدہ آسمان دیکھنے کے لیے۔۔۔تھوڑا سا آنگن پھولوں کے لیے جہاں ایک آدھ چنبیلی کی بیل اور چند گلاب کے پودے تھے۔بس یہی اس کی جنت تھی۔

خالی گھر،تنہا زندگی اور یوسف کی یادوں کی خوشبو۔

جب بہار میں رنگ برنگ پھول کھلتے تو وہ اپنے بے رنگ اور ویران کمرے کے کارنس پر پھول سجا دیتی تا کہ تسکین دل کا سامان پیدا ہو جائے۔لیکن کہاں دل کے کارنس پر تو وہی گیت سجا ہوا تھا۔سرمئی دوپٹے اور بدلی جیسی لڑکی کا۔۔۔وہ گیت جو اس نے پھر کبھی نہ سنا۔۔۔مگر کوئی اور گیت بھی کہاں سنا۔کئی بار اس نے دوپٹوں کا رنگ بدلا مگر گیت کسی رنگ کا بھی سنائی نہ دیا۔

شہر کے لوگ گیت نہیں گاتے۔۔۔دوپٹہ چھین لینے والی بات ضرور کرتے ہیں اب اس نے دوپٹہ رنگنا ہی چھوڑ دیا تھا۔اور خود یوسف نے کیا کیا۔ اس نے بھی تو گیت گانا چھوڑ دیا تھا۔بلکہ اپنا آپ بھی۔۔۔کتنا موٹا،بھدا سا لگتا تھا۔بس ہر سال گاڑی کا ماڈل بدل لیتا۔وہ سوچتی یہ آدمی اپنا نام کیوں نہیں بدل لیتا۔جس کے ساتھ اس کی شبیہہ اور وہ گیت،سرمئی بدلیوں کا وہ موسم اس کے شعور میں سرسرانے لگتا ہے۔مگر شاید دولت والے گھروں میں جذبۂ عشق ایک سامان تجارت ہے۔کہاں کا عشق،کیسی محبت! اس نے زندگی کے ہر موضوع کی طرح محبت کو بھی ادھورہ چھوڑ دیا تھا۔

ایک دن اُسے خبر ملی کہ یوسف دل کے آپریشن کے لیے امریکہ چلا گیا ہے۔امریکہ تو وہ اکثر جایا ہی کرتا تھا۔مگر علاج کے لیے وہ پہلی دفعہ گیا تھا۔ یوسف کی بیوی نے قرآن خوانی کی۔۔۔اور دعا کے بعد آس پاس بیٹھی عورتوں سے سرگوشی کی۔یوسف کو دل کی بیماری نہیں۔۔۔عشق کی بیماری ہے۔

''عشق؟''۔۔۔ساتھ بیٹھی عورت نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں۔۔۔ہاں تھی کوئی سرمئی دوپٹے والی۔یوسف گہری نیند میں سنہری دوپٹہ اور بدلی جیسی لڑکی کا گیت اکثر گنگناتا ہے۔

کون تھی وہ؟ سہیلیوں نے پوچھا۔

مجھے کبھی ملی نہیں۔۔۔آج بھی اگر کہیں مل جائے تو۔۔۔وہ غصے سے بولی۔

اور وہ سرمئی دوپٹے والی اس کے سامنے بیٹھی بالکل محفوظ تھی۔۔۔ اُسے کون پہچانتا اب نہ وہ سرمئی دوپٹہ تھا اور نہ ہی وہ موسم۔۔۔کالی شال اپنے کندھوں پہ لپیٹے وہ خالی چہرے اور بھرے ذہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔کچھ خواب ٹوٹے ہوئے،کچھ رستہ بھولی ہوئی یادیں۔۔۔چاہت کے دکھ اور محبت کے دھوکے۔۔۔جانے وہ کتنی دیر اُلجھتی رہی۔وہاں سے اٹھ وہ گھر چلی آئی۔

یوسف کی بیوی کو اس کے جانے سے کیا فرق پڑتا۔۔۔مگر اس نے بلاوا کیوں بھیجا تھا۔شاید یونہی رواداری میں۔۔۔

گھر آ کر وہ سوچنے لگی۔اچھا ہی ہوا وہ اتنا عرصہ یوسف سے نہیں ملی۔اور اس نے بھی نہیں دیکھا۔ایک ادھیڑ عمر بن بیاہی ٹیچر کا چہرہ۔جو جوانی میں ہی بوڑھی ہو گئی تھی۔جس کے ہونٹوں پر ازل،ابد کی پیاس چپکی ہوئی ہے۔شباب کی سرمئی بدلی تو بن برسے ہی پار چلی گئی تھی۔

سنا ہے یوسف کی بیوی بانجھ تھی۔مگر خود یوسف کی زندگی زیادہ ہی بانجھ نکلی۔۔۔کچھ بھی تو نہ کیا زندگی میں۔۔۔ایک گیت بھی تو اور نہ لکھ سکا۔

خزاں کے دن تھے،درختوں نے ٹنڈ منڈ ہونا شروع کر دیا تھا۔ درختوں کے پتے اور پھول اپنا حسن اور بہار دکھا کر اپنے آخری سفر پر تھے۔ان دنوں اُسے ایک پارسل ملا۔

پارسل بھیجنے والے کے نام کی جگہ خالی تھی۔۔۔کون ہو سکتا ہے۔اس کے پاس تو کبھی کوئی ایسا پارسل نہیں آیا تھا۔سوائے یونیورسٹی کے پرچوں کے۔ عجیب معما ہے۔اس نے جب پارسل کھولا تو لمحہ بھر کے لیے اس کا سر چکرا گیا۔

گزرا ہوا وقت خزاں کے پتے کی طرح کہیں سے اڑتا ہوا چلا آیا۔

اس کے اندر پندرہ سال پرانی ایک ڈائری تھی۔جس کے پہلے صفحے پر اس کا نام اور نئے سال کے لیے کچھ لفظ۔۔۔اور کئی سرگوشیاں کرتے ہوئے لمحے۔۔۔آگے کئی نظمیں اور گیت۔

پندرہ سرمئی دوپٹے اور اسکارف۔۔۔اسی گیت کے ساتھ،وہی برسات کا موسم،وہی سرمئی بدلیوں کی آنکھ مچولی کے دن اور سبھی بچھڑے ہوئے برس ان دوپٹوں کے آنچل سے بندھے پڑے تھے۔

ایک صفحے پر دھڑکتے ہوئے خوبصورت جذبوں کے ساتھ ایک نظم جس میں جذبہ محبت تازہ خون کی طرح دوڑ رہا تھا۔جس میں ہماری مختلف ملاقاتوں کے اپنے احساسات کچھ یوں بیان کیے تھے۔

مدہوش کر دینے والی وہ سنہری شام۔۔۔جس نے میرے دل کی دنیا میں شیریں اور شہابی رنگ لہرائے۔۔۔جب میری زندگی کی سرحدوں میں تم نے قدم رکھا۔۔میرے پہلو میں تمہارے نقشِ پا۔۔۔ہمیشہ ثبت رہیں گے۔سچائیوں کے امین جہاں بھی ہوں۔۔۔رفاقتوں کی قدر کرتے ہیں۔یاد رکھنا۔۔۔محبت قوتِ حیات ہے۔الوداع۔۔۔اے محبتوں کی امین الوداع۔۔۔!

ڈائری کے آخری صفحے پر لکھا تھا۔میرے پاس بس تمہاری اتنی ہی چیزیں تھیں یہ امانتیں مرنے سے پہلے تمہیں لوٹا رہا ہوں۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔وہ دکھ جو اتنے عرصے سے اس کے اندر تھا۔وہ آنسوؤں کی صورت باہر نکل آیا۔

باقی صفحہ ۷۳ پر ملاحظہ کیجیے

بریکنگ نیوز

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

عمر کا طویل حصہ گولی اور بارود کے سائے میں گزارنے کے باوجود لفظ بریکنگ نیوز خون کی رفتار تیز کر دیتا ہے۔ یہ لفظ تھوڑا کمزور ہے میرے خیال میں خوف کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ بریکنگ نیوز کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہے اکثر آپ ذہنی طور پر ہاتھی درآمد کرنے پر تیار ہوتے ہیں تو چوہا برآمد ہوتا ہے اور کبھی چوہا جان کر بریکنگ نیوز کو اہمیت نہیں دیتے تو وہاں سے ایک کے بجائے کئی ہاتھی برآمد ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہاتھی کی جگہ شیر اور بھیڑیا بھی چیختے دھاڑتے آپ کی روح قبض کرنے لگتے ہیں۔ ہمیں یہ تجربہ پہلی بار 9/11 کے وقت ہوا جب ہم خبروں کے چینل سے بے خبر اپنا من پسند ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھے کہ بڑے بیٹے نے آتے ہیں گھر میں خوف کی فضا پھیلا دی۔ یہ خوف بھی عجیب چیز ہے۔ ایک بار دل، دماغ میں گھر کر جائے تو پھر پکا مکین ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہم میں سے اکثر بار بار یہ مصرع دہراتے ہیں:

موت کا ایک وقت معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

چھوڑیئے! میں بھی کن بھول بھلیوں میں پڑ گیا۔ اس وقت کی بریکنگ نیوز کا تعلق میری اپنی ذات یعنی میرے ایسے قریبی دوست کی نسبت ہے جسے میں اپنی یادوں سے کھرچنا بھی چاہوں تو نہیں کھرچ سکتا۔ اور کھرچوں بھی کیوں اُس نے میرا بگاڑا ہی کیا ہے۔ یہ لفظ بگاڑا بھی غلط ہے اُس نے تو مجھے سر سے پیر تک کچھ اس طرح سنوارا کہ آج اگر مجھے تھوڑی بہت حرف کی پہچان ہے تو اس کا تمام تر سہرا جمیل نقش کے سر جاتا ہے۔

جمیل نقش! جی ہاں میرے اسکول کا ساتھی، میرا دوست، میرا غمگسار۔ ذہین اتنا کہ بسا اوقات استادوں کو مشکل میں ڈال دیتا۔ ایک بار حساب کے استاد ماسٹر حفیظ صاحب سے بولا کہ سر یہ دو اور دو چار کیوں ہوتے ہیں؟ ماسٹر صاحب نے قدرے غصے سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''کیا چیز خراب ہے، پیٹ یا دماغ''، جمیل نے متانت سے کہا ''سر کچھ نہیں''، تو ''پھر اس طرح کے اوٹ پٹانگ سوال کیوں کر رہے ہو'' سر ایک وقت آئے گا میں ثابت کر کے رہوں گا کہ دو اور دو پانچ بھی ہو سکتے ہیں۔ ماسٹر صاحب منہ ہی منہ میں بُڑ بُڑ کرتے ہوئے بلیک بورڈ پر چاک کی مدد سے ادھورے سوال کو پورا کرنے لگے۔

اسی طرح اسلامیات کے استاد مولانا ذاکر سے بحث میں الجھ جاتا سر آپ لوگ دینی تعلیمات پر جس قدر زور دیا کرتے ہیں اگر اُس سے آدھا زور معاملات پر دینے لگیں تو لوگ باگ بہتر مسلمان بن جائیں۔ جواب میں مولانا ذاکر دھیمے لہجے میں بولے ''بقراط میاں! دین پر عمل کرنے سے ہی بہتر انسان بنتے ہیں'' تو سر پھر اذان میں ''حی علی الفلاح'' کہہ کر کیوں پکارا جاتا ہے؟ ''اس لیے کہ اللہ کے دین کی طرف جانا فلاح کا کام ہے''۔ ''سر اس فلاح کا تعلق انسان سے نہیں ہے''۔ مولانا ذاکر صاحب نے اُسی نرم روی سے کہا کہ میاں کسی وقت مدرسے تشریف لایئے پھر آپ سے تفصیلی گفتگو ہوگی۔

اُدھر آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں لوگ باگ مشتعل انداز میں نعروں کی گونج میں آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور میں آپ کو جمیل نقش کے بارے میں اس طرح تفصیل بتلا رہا ہوں جیسے کوئی قصہ سنایا جائے۔ یہ میری مجبوری ہے اگر میں آپ کو جمیل نقش کی بابت تفصیل سے نہیں بتلاؤں گا تو آپ کو نہ تو جمیل نقش کے حوالے سے کچھ معلومات مل پائیں گی نہ بریکنگ نیوز کا سبب آپ کی سمجھ میں آئے گا۔

غالباً یہ آٹھویں کلاس کی بات ہے۔ مجھے پڑوس کی لڑکی سے عشق ہو گیا۔ میں نے کچی پکی زبان میں جیسا تیسا خط لکھ کر جمیل کو دکھایا تو وہ بولا ''ابے یار! لڑکی کو امپریس کرنے کے لیے کوئی شعر، کوئی انگریزی کا جملہ'' انگریزی کے جملے کے نام پر میرا خون خشک ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ چھٹی کلاس سے ABC پڑھنا شروع کی ہے ابھی تو ہمیں He اور She کا فرق معلوم نہیں اور تم انگریزی کا جملہ لکھا رہے ہو؟ بولا ''کوشش کرنے سے سب کام آ جاتا ہے'' میں نے کہا ''یہ اسکول پڑھنے جو آتے ہیں اسے تم کیا نام دو گے؟'' کہنے لگا ''یہ نصابی تعلیم ہے فارغ وقت میں انگریزی اخبار اور رسالے پڑھا کرو اور ایک ایک دو دو لائن کا اردو میں ترجمہ کیا کرو''۔ میں نے جھلاّتے ہوئے کہا ''یہ تم مجھے خط لکھنے کی ترکیب بتلا رہے ہو یا سائنسی کلیہ سمجھا رہے ہو'' کہنے لگا اچھا لکھ ''اگر میں ایک آرٹسٹ ہوتا تو تمہاری تصویر بناتا اور اُس سے پیار کرتا''۔ میں ہونق بنا اُس کی شکل دیکھنے لگا۔ اس کا انگریزی سے کیا تعلق؟ ''اُس کی ہنسی مجھے زہر لگ رہی تھی'' بولا ''جملہ میں نے بتا دیا ہے ترجمہ تم کر لو'' میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے تنگ کرنے کے موڈ میں ہے لہٰذا میں نے اُس کا بازو دباتے ہوئے کہا کہ بھائی نی چل لکھ ''If i were an artist i would draw your picture and love it'' خوشی سے میری باچھیں کِھل گئیں اور جذبات میں آ کر میں نے اُس کا منہ چوم لیا۔

اُس دن سے پہلے ہم دونوں دوست اور کلاس فیلو تھے اُس کے بعد بہترین دوست بن گئے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہی پڑھتا ہوں مگر تم اتنے لائق کیوں ہو؟ بتانے لگا ''کہ اُس کے گھر میں سب لوگ پڑھے لکھے ہیں اور سیاست میں بھی خاصے متحرک ہیں۔ اس لیے مجھے پڑھنے لکھنے پر کافی زور دیا جاتا ہے۔ حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا'' جمیل نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''میرے تایا جی بہت سخت آدمی ہیں۔ گھر کے ہر چھوٹے بڑے آدمی سے انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ فوج کے ریٹائرڈ کرنل ہیں۔ بتلاتے ہیں کہ اُنہوں

نے نیتا جی سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج میں بھی کام کیا ہے۔جیسے ہی میرے منہ سے نکلا یہ کون صاحب ہیں تو اپنی طبیعت کے برخلاف تایا جی نے مجھے پیار سے گلے بلکہ پیٹ سے لگاتے ہوئے کہا بیٹا پڑھا کرو پڑھنے سے انسان کا ذہن کھلتا ہے۔اب تم پوچھو کس طرح کھلتا ہے'' میرے منہ سے دھیمی آواز میں جی نکلا۔''اللہ تعالیٰ نے ہمارے دماغ میں کروڑوں کے حساب سے بلب لگائے ہیں ۔جب جب ہم نیا لفظ پڑھتے ہیں تب تب ایک بلب روشن ہوجاتا ہے۔''

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ہمارے گھر میں بائی سائیکل کے علاوہ کوئی مشین نہیں تھی اُس وقت سب سے پہلے جمیل نے کلاس روم میں آکر بتلایا تھا کہ نیل آرم سٹرانگ چاند پر پہنچ گیا ہے۔اُس وقت اسلامیات کا پیریڈ چل رہا تھا۔مولانا ذاکر حسین اپنے مزاج کے برعکس اونچی آواز میں بولے ''ملاعون کیا بک رہا ہے؟ کائنات کے راز اللہ رب کریم کے علاوہ کوئی نہیں جان سکتا'' جمیل نے آہستہ سے میرے کان میں کہا ''یہ لوگ ہر چیز کو بعد میں تسلیم کرتے ہیں پھر اُس کا استعمال بھی سب سے زیادہ یہی کرتے ہیں مثال کے طور پر لاؤڈ اسپیکر'' میں نے مولانا کے ڈر سے اُس کی ران میں چٹکی کاٹی تا کہ وہ خاموشی سے مولانا صاحب کی بات سنے۔

ایک دن کلاس میں آیا تو اُس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈائری تھی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ڈائری تھماتے ہوئے بولا ''آدھی چھٹی میں پڑھ کے بتانا'' میں نے جمیل کے کہنے کے مطابق آدھی چھٹی میں وہ ڈائری پڑھی تو مجھے یقین نہ آیا یہ جمیل کی تحریر ہے۔وہ کہانی تھی نا افسانہ بلکہ حالات حاضرہ پر ہلکا پھلکا تبصرہ تھا مگر کئی جگہ اس طرح کی باتیں اور جملے تحریر تھے کہ ان کو لکھنے کے لیے انسان کا پڑھا لکھا اور بُردبار ہونا ضروری ہے۔مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے ''ہمارے ہاں لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور سوہنی مہیوال کی کہانیوں کا بڑا چرچا ہے اور لوگ باگ اُنہیں پڑھتے بھی بہت شوق سے ہیں مگر برصغیر کی سب سے بڑی عشقیہ کہانی جس کے سبب متحدہ ہندوستان میں دو قومیں آمنے سامنے ہوگئیں اُس کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا۔یعنی پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن وجے لکشمی پنڈت اور محمود حسن جن کا تعلق بہار سے تھا اور جو انڈین سول سروس میں بیوروکریٹ تھے۔تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے اور کئی ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے۔وجے لکشمی اور محمود حسن ایک دوسرے سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے۔جب وجے لکشمی کو محمود حسن سے الگ کر کے اُن کی شادی کرنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔جس کے بعد موہن داس کرم چند گاندھی کو بلایا گیا جنہوں نے وجے لکشمی کے آگے ہاتھ جوڑ کے بنتی کی کہ وہ ہندو جاتی کی عزت کی خاطر شادی کر لے۔وجے لکشمی نے گاندھی جی کی بات مان کر شادی تو کر لی مگر تھوڑے عرصے بعد ہی علیحدگی اختیار کر لی۔جس کے بعد اُنہیں بھارت کا سفیر بنا کر کسی عرب ملک میں بھیج دیا گیا۔ محمود حسن مصر میں پاکستان کے سفیر تھے لہٰذا اب دونوں کے ملنے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔محبت میں جس استقامت اور جنون کی اس جوڑے نے مثال قائم کی اُس کو ایک سازش کے تحت منظر عام پر آنے سے روکا گیا۔

کلاسز بدلتی گئیں مگر جمیل نقش کا مزاج نہ بدلا۔اب وہ باقاعدہ ادیب کے طور پر مشہور ہو گیا تھا۔اُس کی کہانیوں کو پڑھ کر اکثر لوگ اسے انقلابی یا ترقی پسند کے القاب سے یاد کیا کرتے تو وہ جھنجھلا جاتا۔''کون سا انقلاب؟ کون سی ترقی پسندی؟ یہ سب پیچھے سے ہانکے لگائے گئے ہیں اور میں مانگے تانگے کی مرغی کے بجائے گھر کی دال کھانے کا قائل ہوں۔اگر میں انقلابی ہوں تو اپنے دماغ کی سوچ کا۔اگر میں ترقی پسند ہوں تو اپنے دل کی آواز کا'' غالباً تیرھویں کلاس تھی جب جمیل نقش نے یوم آزادی کی تقریب پر کچھ نازیبا الفاظ استعمال کر دیے مثلاً ہندوستان کی تقسیم یا ملک میں ٹوٹتی بنتی حکومتوں کو کسی بڑی طاقت کا شاخسانہ قرار دے کر اپنا راستہ خود چننے کی تجویز پیش کر دی جس کے سبب اُسے کالج سے نکال دیا گیا۔کچھ دنوں بعد ملاقات ہوئی تو اُس کی شیو بڑھی ہوئی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔میں نے پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا ''وہی جو پچھلی بار ہوا تھا'' یعنی کالج سے نکال دیا گیا'' اُس نے ہاں میں سر ہلا کر جواب دیا۔میں نے کہا ''تیرے تایا جی کب کام آئیں گے؟'' پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے ''تایا جی کو گزرے ہوئے ڈیڑھ برس ہو گیا''۔''پھر؟''۔''یار داخلہ تو کوئی مسئلہ نہیں اللہ کا بڑا کرم ہے۔ابا جی کا بڑا اثر رسوخ ہے مسئلہ میری سوچ کا ہے''۔''مطلب؟''۔''مطلب یہ میرے بھائی کہ میں اپنے دل دماغ کے خلاف نہیں چل سکتا وہ کہتے ہیں نا'':

میں زہر ہلاہل کو قند نہیں کہہ سکتا

''اب کیا ہوا؟'' سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے ''یار ہونا کیا تھا وہ تم نے مصطفیٰ زیدی اور شہناز کا ذکر تو سنا ہوگا'' نفی میں سر ہلاتے ہوئے ''نہیں سنا۔اتنا مشہور قصہ'' بے بسی سے پھر سر ہلاتے ہوئے۔''ابے یار مصطفیٰ زیدی بڑے نامور شاعر تھے۔الٰہ آباد کے رہنے والے تھے پہلے تیغ الٰہ آبادی کے نام سے شاعری کیا کرتے تھے پاکستان آکر اپنے اصلی نام مصطفیٰ زیدی سے شاعری کرتے تھے بڑے شاعر تھے اور یہ واحد شاعر تھے جو جوش اور فراق کی صحبت کا فخر سے ذکر کرتے تھے ہندوستان سے جوش صاحب کو پاکستان لانا بھی انہیں کا کارنامہ ہے'' پنڈت جواہر لال نہرو نے جوش صاحب کو ہندوستان میں روکنے کے لیے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد پھر اپنی بیٹی اندرا گاندھی کی سربراہی میں کمیٹیاں بنائیں جب دونوں کمیٹیاں جوش صاحب کو روکنے میں ناکام ہوگئیں تو نہرو جی نے آخری کوشش کے طور پر جوش صاحب سے ملاقات کر کے پاکستان جانے کی وجہ دریافت کی جس کے جواب میں جوش صاحب نے کہا ''مجھے انڈیا میں اردو زبان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے'' جواب میں پنڈت جی نے تاریخی جملہ کہا ''آپ کو ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے جبکہ مجھے پاکستان میں آپ کا۔۔۔!'' ''اچھا پھر؟'' ''او یار! میں بھی دیوار سے سر ٹکرا رہا ہوں تو میرے بھائی ایک خاتون ہیں جنہیں آنکھ بھر کے دیکھنا مشکل ہے۔اُن سے زیدی صاحب کا بہُت جور کا یارانہ تھا۔کسی محفل میں آج کے دور کے سب سے بڑے عوامی رہنما

نے خاتون کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔اُس کے بعد خاتون مصطفیٰ زیدی کے گھر کا راستہ بھول کر بڑے صاحب کے گھر کے راستے پر گامزن ہو گئیں''جس کے بعد مصطفیٰ زیدی نے یہ مشہورِ زمانہ شعر کہا:

انہیں پتھروں پہ چل کے اگر آسکو تو آؤ

میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

''پھر کیا ہوا؟'' ''ہونا کیا تھا میں نے اپنے کالم میں اس کا ذکر کر دیا۔دوسرے دن جب آفس پہنچا تو ایڈیٹر صاحب نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کیا اور باہر گیٹ تک چھوڑنے آئے''

اس کے بعد کی ملاقات بھی کچھ عجیب تھی۔بیگم کی ہدایت پر میں سبزی منڈی سے ہفتے بھر کی سبزی لینے گیا تو وہاں کھوے سے کھوا چھِل رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب کا مونڈھا میرے مونڈھے سے ٹکرایا تو اُنہوں نے شائستہ لہجے میں ''معاف کیجیے گا'' کہا''میرے من مندر کے تار بج اُٹھے'' میں نے غیر ارادی طور پر اُن صاحب کو پکارا۔جیسے ہی وہ میری طرف مڑے ایک منٹ کے لیے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور گرم جوشی سے بغل گیر ہو گئے۔اُس کی داڑھی میں سفید بالوں کی تعداد زیادہ ہو چکی تھی۔میں نے کہا''یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

کچھ تو ہوتے ہیں جنوں کے آثار

اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

میں بولا''یار مجھ سے سادے انداز میں بات کیا کر۔تُو جانتا ہے میں ٹھہرا بوڑم'' ''بچو آج میں تجھ سے پہلے چائے پیوں گا پھر باتیں ہوں گی'' ہم قریبی چائے خانے میں جا بیٹھے۔میں چائے کا آرڈر دیتے ہوئے اُس سے کچھ کھانے کا پوچھا تو اُس نے اُنگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔چائے والا جیسے ہی دو کپ چائے ہماری میز پر رکھ کر گیا اُس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور سگریٹ کا گہرا کش لے کر بولا''اب جو دل چاہے پوچھ'' ''یار میں تو یہی پوچھ رہا ہوں کہ تُو نے یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے'' ''چھپتا پھر رہا ہوں'' ''کس سے؟'' ''اپنے آپ سے'' ''پہیلیاں نہ بجھا''سننا چاہتا ہے سُن۔

''آخری ملاقات کے بعد سے تین اخبار بدل چکا ہوں'' ''وجہ؟'' ''پہلے اخبار میں ایک بڑے مذہبی ٹھیکیدار سے مشروب مغرب پکڑے جانے اور قحبہ خانے کی خاتون سے تعلق کے ذکر پر نکالا گیا۔دوسرے اخبار سے سب سے بڑے صاحب کی وطن کے خلاف بڑی طاقت سے اندر خانے سلسلہ جنبانی کو آشکار کرنے پر۔تیسرے اخبار سے بڑے بڑے لوگوں کو عیش وعشرت کا سامان مہیا کرنے والے کی نشاندہی کرنے پر'' ''تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے معاشرے کو سدھارنے کا؟'' ''ہرگز نہیں'' ''پھر کیوں پرائی آگ میں کُودنے کا شوق چراتا ہے'' ''اگر کوئی اجنبی شخص یہ سوال کرتا تو میں ہرگز جواب نہ دیتا مگر تم جیسا شخص جو مجھے سر سے پاؤں تک نہ صرف جانتا بلکہ پہچانتا بھی ہے وہ یہ سوال کر رہا ہے؟'' ''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ اب جو اخبار چھوڑا ہے اُس میں کون سا گل کھلا کر آئے ہو؟''

''چھوڑو یار! تم پھر کہو گے کہ۔۔۔؟'' ''نہیں کہوں گا تم بتلاؤ'' ''اب کیا بتلانا اب تو میں وطن چھوڑ کر جا رہا ہوں'' ''کیوں؟'' ''اس کے سوا چارہ نہیں'' ''یار مجھ سے تو صاف صاف بتاؤ بات کیا ہے؟'' ''بات صرف اتنی ہے پیارے کہ میں نے ایک معصوم لڑکی پر کوڑے برسانے والی خبر پر کالم لکھ ڈالا۔بس اُس کے بعد سے مجھے مسلسل فون پر دھمکیاں آ رہی ہیں یا وطن چھوڑ دو یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ''

اُس دن کے بعد میں کئی رات سو نا سکا۔کس چیز کا ماتم کروں:

قائداعظم کا فرمان لے کے رہیں گے پاکستان

یا

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

ایک دن، دو دن، ہفتہ، مہینہ، سال کے بعد نہ جمیل یاد رہا نہ اُس کے ساتھ گزرے ہوئے ایام۔وجہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔زندگی اتنی تیز رفتار ہو چکی ہے کہ یورپ کی طرح یہاں بھی ہر انسان Me and my self بن چکا ہے۔لیکن اب جب میں ٹیلی ویژن کی سکرین پر جمیل نقش کے نام کے ساتھ اناؤنسر کو جذباتی انداز میں ڈرا دینے والی خبریں سناتے دیکھ رہا ہوں تو جی ہول رہا ہے۔

ہوا کچھ یوں کہ وطن سے جانے کے بعد جمیل نقش نے یورپ، امریکہ، افریقہ کے دھکے کھانے کے بعد ہالی وڈ کا رُخ کیا جہاں اُس کی کہانی پر فلم بنائی گئی۔فلم چلی مگر اُتنی نہیں جتنی جمیل نقش کو توقع تھی۔مگر اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ اُسے بالی وڈ سے فلم لکھنے کی پیشکش آ گئی کیونکہ گوروں کی چوسی ہوئی ہڈی بھی ہمیں مرغوب ہوتی ہے پیشکش کو جمیل نقش نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔اُس کے پروڈیوسر نے کئی جگہ جمیل نقش کی رہائش کا بندوبست کیا مگر دودھ کا جلا چھاچ پھونک پھونک کر پیتا ہے۔اُس نے مسلم علاقے میں ایک گھر کرایے پر لے کر وہاں رہنے کو ترجیح دی۔فلم کا پروجیکٹ بڑے ادارے کا تھا لہٰذا وہ تیزی سے پایۂ تکمیل پہنچ رہا تھا۔ہالی وڈ کی فلم کی طرح بالی وڈ کی فلم میں بھی جمیل نقش نے اپنے انقلابی انداز کو برقرار رکھا جسے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر نے خوب سراہا۔اُن کی حوصلہ افزائی نے جمیل نقش کو اور اعتماد بخشا جس کے زیر اثر اُس نے فلم کا منظرنامہ اور مکالمے زیادہ بولڈ لکھے۔

فلم تیار ہوئی۔خوب تشہیر ہوئی۔فلم کی ریلیز سے پہلے جمیل نقش کو کئی فلمیں لکھنے کی پیشکش ہوئی جنہیں جمیل نقش نے بخوشی قبول کر لیا۔وجہ صرف یہ تھی کہ تیار ہونے والی فلم کے رشز دیکھنے والے لوگوں نے اتنی عمدہ رپورٹ دی کہ جمیل نقش فلم کی ریلیز سے پہلے ہی مصروف ہو گیا۔جس دن فلم کا پریمیئر تھا وہ دن بھی جمیل نقش کے لیے انتہائی خوش قسمتی لے کر آیا۔کم وبیش اتنے ہی فلمسازوں نے جمیل نقش کو اپنی فلم کی کہانی لکھنے کے لیے سائن کیا۔اب جمیل نقش نے اپنے لیے کار بھی خرید لی اور گھر خریدنے کے لیے بھی دوستوں سے مدد مانگنا شروع کر دی۔

جس دن فلم ریلیز ہونی تھی اُس رات مارے خوشی کے جمیل نقش کو

نیند نہیں آئی۔صبح ہی صبح وہ تیار ہو کر سوٹ ٹائی پہن کر پروڈیوسر کے دفتر پہنچ گیا جہاں پہلے سے گہما گہمی تھی۔فلم ساز کے دفتر میں سب سے زیادہ توجہ کا مرکز جمیل نقش تھا۔بہت سے لوگوں نے جمیل نقش کو دیکھ کر کہا کہ آپ فلم کے کہانی کار کے بجائے ہیرو لگ رہے ہیں۔جمیل نقش نے بھی ترنگ میں کہا کہ اگر ہیرو کہنا ہے تو ساتھ ہالی وڈ لگا لیجیے۔ڈائریکٹر نے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جمیل نقش کو مخاطب کیا"ہالی وڈ کیوں؟" جمیل نقش نے اپنے سفید بالوں کی جانب اشارہ کیا تو ڈائریکٹر نے کہا"شکر کرو تمہارے سر پر بال تو ہیں بھلے ہی سفید، یہ بوریاں بھر بھر کے نوٹ بٹورنے والے آج کے سُپر اسٹار تو سرے سے فارغ البال ہیں۔جتنے پیسے ان کی کنگی پٹی پر لگتے ہیں کسی زمانے میں اتنی رقم میں ہیرو مل جاتا تھا۔"

پروگرام کے مطابق فلم کا پورا یونٹ پہلا شو دیکھنے سنیما ہاؤس گیا۔جوں جوں فلم بین تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ووں ووں فلم کا یونٹ فلم ساز، ہدایت کار اور جمیل نقش کو مبارکباد دینے لگتا۔وقفے کے بعد جب فلم چلی تو کچھ لوگوں نے فلم کے حق میں اور کچھ نے خلاف نعرے لگائے جسے فلم کے یونٹ نے فلم کی کامیابی سے منسوب کیا۔جب فلم ختم ہوئی تو پورا یونٹ بجائے فلم ساز کے دفتر جانے کے فائیو اسٹار ہوٹل گیا جہاں پُرتکلف دعوت کا اہتمام تھا۔کئی لوگوں نے جمیل نقش کو مذاق میں کہا کہ اب وطن جانے کا خیال چھوڑ دیجیے اور یہاں کی شہریت کی درخواست دے ڈالیے۔جمیل نقش نے مصنوعی حیرت سے کہا۔"میں؟" سامنے والے صاحب نے پروڈیوسر کی طرف اشارہ کر کے کہا"سرکار صاحب کے بڑے مراسم ہیں چٹکی بجاتے میں آپ کا کام کرا دیں گے۔" جمیل نقش نے جواب میں کہا"دیکھئے نصیب میں کیا لکھا ہے"

کھانے کے بعد سب لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔جمیل نقش بھی اپنے گھر آ کر آرام سے سو گئے۔آج جتنی بے خبری کی نیند آئی اس سے قبل جمیل نقش اُس سے ناآشنا تھے۔نیند سے جاگنے کے بعد موبائل چیک کیا تو اُس پر ان گنت کالز تھیں کچھ نمبرز ایسے تھے جن کے مالک کو وہ جانتے تھے اور کچھ ایسے جن سے اُن کی کوئی شناسائی نہ تھی۔سب سے پہلے اُنہوں نے نئے نمبروں کو اس خیال سے چیک کرنا مناسب سمجھا کہ یقیناً نئے پروڈیوسر کی جانب سے پیشکش ہوں گی۔

جیسے جیسے جمیل نقش وہ کالز چیک کرتے گئے ویسے ویسے اُن کا رنگ اُڑتا گیا۔ساری نئی کالز چیک کرنے کے بعد اُنہوں نے اپنے قریبی دوستوں کو فون کر کے بتلایا تو اُنہوں نے اسے روزمرہ کی شرارت قرار دے کر جمیل نقش کو مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر جمیل نقش کے دل اور دماغ میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھار رہے تھے۔اُن کا جی چاہا کہ وہ چائے بنائیں اور اُس سے پُرسکون ہونے کی کوشش کریں مگر آج چائے بھی انہیں لطف نہیں دے رہی تھی۔اُنہوں نے چائے کے ساتھ سگریٹ سلگائی اور اُس کے بھی کئی کش لیے مگر بے چینی کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔پہلے اُنہوں نے سوچا کہ وہ باہر جا کر چہل قدمی کریں مگر اُن کے دل نے اس پر آمادگی کا اظہار نہ کیا۔اُنہوں نے پھر چائے بنائی پھر سگریٹ سلگائی مگر بے چینی کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی گئی۔

چائے اور سگریٹ کا سلسلہ بڑی دیر سے جاری ہے مگر اب تو کچھ اور ہی سنائی دے رہا ہے۔یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ جمیل نقش کے منتشر خیالات اور ناہموار دل کی دھڑکن کسی طور اپنی جگہ پر آنے لگی۔یہ تو وہ نعرے ہیں جس سے ایک جمیل نقش تو کیا ہزاروں جمیل نقش بھی ہوں تو اُن کے خون کی گردش بڑھ جاتی ہے اور جذبات کا بہاؤ تیز ہو جاتا ہے۔کچھ دیر جمیل نقش پُرسکون ہونے کی کوشش کرتے رہے مگر آوازیں آہستہ آہستہ اُن کے قریب اور قریب ہو رہی ہیں۔اناؤنسر کی آواز پُرجوش ہو گئی ہے۔

جمیل نقش نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھنے کی کوشش کی تو اُنہیں پھر اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ ہجوم کا رُخ اُن کے گھر کی طرف ہے۔اُنہوں نے پھر سے اپنے قریبی دوستوں کو فون کر کے مدد مانگنا چاہی تو کسی بھی فون سے کوئی جواب نہ آیا۔وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر میں ٹہلنے لگے۔اُس گھر میں جس میں گزشتہ ایک سال سے نہایت عیش و آرام سے وہ تنہا رہ رہے تھے۔

نعروں کی آواز تیز ہو رہی تھی وہی نعرے جنہیں سن کر کبھی جمیل نقش کے خون کی گردش بڑھ جاتی تھی جذبات کا بہاؤ تیز ہو جاتا تھا اور جان کی پرواہ کیے بغیر وہ تن تنہا بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرانے کو آمادہ ہو جاتے تھے مگر آج وہی نعرہ سُن کے اُن کا خون خشک ہوا جاتا ہے۔اُن کے جذبات کا بہاؤ تھم گیا ہے اُن کے دل کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوئی جاتی ہے۔ہجوم قریب سے قریب تر ہو رہا ہے۔جمیل نقش کی پریشانی دیدنی ہے۔اُن کے ہوش و حواس گم ہو گئے ہیں صرف کان کام کر رہے ہیں جنہیں فقط ایک ہی آواز سنائی دے رہی ہے:

نعرۂ تکبیر اللہ اکبر

کرشمۂ قدرت

امریکی خاتون مارگریٹ بُومر جب سولہ ہفتہ کی حاملہ تھیں تو اُنہیں پیٹ میں تکلیف کا احساس ہوا۔الٹراساؤنڈ کے ذریعے معلوم ہوا کہ بچے کی ریڑھ کی ہڈی کے قریب خاص طرح کا پھوڑا موجود ہے۔ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے غور و خوض کے بعد تیئسویں ہفتے میں خاتون کے پیٹ کی سرجری کا فیصلہ کیا کیونکہ پھوڑا بچے کے دل کو متاثر کر رہا تھا۔سرجری کے دوران ڈاکٹروں نے بچے کو بیس منٹ کے لیے ماں کے پیٹ سے باہر نکالا اور پھوڑا نکال کر بچے کو دوبارہ اُس کے مقام پر رکھ دیا گیا۔اس دوران ماہر ڈاکٹرز بچے کے دل کی دھڑکن کا مسلسل مطالعہ کرتے رہے۔یہ بچہ دوسری مرتبہ چھتیس ہفتے بعد پانچ پاؤنڈ پانچ اونس کے وزن کا دوسری بار پیدا ہوا جو ہر طرح سے صحت مند تھا اور اب یہ بچہ چار ماہ کا ہو چکا ہے۔

"چہار سُو"

"حرفوں سے آشنائی"

یونس صابر (پشاور)

(پروفیسر ریاض احمد شاد کے پنجابی کلام کا ترجمہ)

حرفوں سے آشنائی — تیرا کرم ہے سائیں!
میری لکھت پڑھائی — تیرا کرم ہے سائیں
آدم کو جب بتائے — نام اور حرف اپنے
بُت کو بھی بات آئی — تیرا کرم ہے سائیں
حرفوں کو یوں پرویا — لکھّے صحیفے دل پر
امّ الکتاب لائی — تیرا کرم ہے سائیں
تیرے بیاں نرالے — سب بات تیرے من کی
پتھر نے کہہ سُنائی — تیرا کرم ہے سائیں
رنگوں کے سب معانی — پھولوں کی ساری رمزیں
خوشبو کھُلی سُنائی — تیرا کرم ہے سائیں!
شعر و سخن کہانی — اسلوب خوش بیانی
تیری عطا سے پائی — تیرا کرم ہے سائیں
تُو نے ریاض احمد! — محفل جو یاں سجائی
تھی سچ سخن کمائی — تیرا کرم ہے سائیں!

وشال کھُلّر (لدھیانہ، بھارت)

میں چمن میں کیا گیا گویا کہ دانائی گئی — لیکن اس سے یہ ہوا کہ ساری رسوائی گئی
وقت پڑنے پر جو کام آئے وہ سچّا یار، خوب! — غمزدہ میں کیا ہوا کہ میری پر چھائی گئی
رازِ دل دفنا دیا تھا ہونٹ کے منڈوے تلے — اک ذرا وہ کیا کھُلا کہ اس کی گہرائی گئی
اک مقدّس روپ اس کا بھیڑ سے تھا مختلف — اس کے میرے درمیاں کی کیوں نہ تنہائی گئی
ہے معطّر سانس کی اک ڈور سے سارا وجود — روح نکلی جسم سے جو بھی تھی رعنائی گئی
اب کہاں وہ رنگ وہ حالات کھُلّر، عشق میں — موسموں نے رنگ بدلا اور پروائی گئی

غلام جیلانی یکتا (جموں، کشمیر)

کبھی یوں بھی نگار یار دیکھی — خود اپنے آپ سے بے زار دیکھی
وہیں پر ٹھوکریں کھائیں ہیں ہم نے — جہاں بھی راہ کچھ ہموار دیکھی
یہ میرے حال خستہ کا اثر تھا — نظر اُس کی تبسم بار دیکھی
بہاروں نے دکھائی بے رخی جب — خزاں پھولوں کی ہے غم خوار دیکھی
غموں میں رہ گئے ہیں ڈوب کر ہم — طبیعت جب کبھی بے زار دیکھی
گزری زندگی کچھ ایسے یکتا — کہ اپنی جیت میں بھی ہار دیکھی

شہاب صفدر (راولپنڈی)

نور تھا اس قدر نظارے پر
جم نہ پائی نظر نظارے پر
ہو گئی خرچ ساری بینائی
ایک تصویر بھر نظارے پر
ذکر سے سیرِ باغ کر لیں گے
بندشیں ہیں اگر نظارے پر
خالی دیوار سے بجز آنسو
کیا پڑھے چشمِ تر نظارے پر
جس کو آتا ہے دیکھنا اُس کا
ختم ہو گا سفر نظارے پر
گاؤں آیا ہے شہر پہلی بار
چونک اٹھتا ہے ہر نظارے پر
کس نے کتنی سمیٹ لی حیرت
یار ہو گی خبر نظارے پر
تھی بہکنے پہ آنکھ ہی مائل
یوں نہ الزام دھر نظارے پر
دیکھتا کیا ہے آس پاس شہاب
تُو فقط دھیان کر نظارے پر

○

نعیم الدین نظر (میرپورخاص)

رات کس کرب میں کٹی میری
سو گئے وہ ، خبر نہ لی میری
روز پڑھتا ہوں ہجر کے قصے
روز بڑھتی ہے بے کلی میری
ایک مدّت سے وہ نہیں آئے
کتنی سنسان ہے گلی میری
دھوپ رنج و الم کی ڈھلتی نہیں
میر جیسی ہے زندگی میری
سر اُٹھاتے رہے انا کے بت
مر سکی تھی نہ خود سری میری
اُن کو محسوس بھی نہ ہو شاید
پھر بھری بزم میں کمی میری
میں کسی کی نظر میں آ نہ سکا
اتنی مدّھم تھی روشنی میری

○

ابراہیم عدیل (جھنگ)

جو دیوانہ تمہارا بن گیا ہے
وہی ذرہ ستارہ بن گیا ہے
ہمیں پہچانتا کوئی نہیں ہے
منافع سب خسارا بن گیا ہے
کہاں اب چھوڑ کر جائیں قفس کو
یہی بلخ و بخارا بن گیا ہے
غمِ ہستی کی وسعت کیا بتائیں
فلک بھی اک کنارا بن گیا ہے
بہت برسا تمہارے غم کا بادل
کہ میرا جسم گارا بن گیا ہے
اجڑ کر پھر نہ بس پایا کبھی دل
شکست و غم کا چارا بن گیا ہے
کنارے پر سفینے آ لگے ہیں
کوئی تنکا سہارا بن گیا ہے
حقیقت اس جہاں کی اور کیا ہے
ہوا اُن کا اشارا بن گیا ہے
تیرے ہونٹوں تک آیا جو تبسم
وہی کوثر کا دھارا بن گیا ہے
عدیل اس کے ستم کا ایک پتھر
غزل کا استعارہ بن گیا ہے

○

شائستہ سحر (میر پور خاص)

اگر چہ عام ہیں لوگوں میں استعارے مرے — سمجھ سکا نہ مگر کوئی بھی اشارے مرے
تمہارے ہجر کی آتش میں راکھ ایسے ہوئے — گریزاں مجھ سے ہوئے ہیں کئی شرارے مرے
تپید گئی شرر عشرتِ حریم مری — یہ خاک تجھکو مبارک مجھے شرارے مرے
غمِ وصال سے خود مجتنب وہ ہو جائے — کوئی فراق کے لمحے اگر گزارے مرے
بھٹک نہ جائیں کسی اضطراب رفتہ میں — صلیبِ شب سے کوئی خواب اب اتارے مرے
تو اپنے جبر کے ایوان کی خبر لے لے — کھڑے ہیں تن کے ابھی صبر کے ستارے مرے
سماعتوں میں لگے کھلنے پھر جزا کے رنگ — کھلے ہوئے ہیں کئی دور گوشوارے مرے
عداوتوں کی ہوا سخت جان لیوا تھی — بجھا کے چلتی بنی ہے چراغ سارے مرے
تو اپنے پیار کی شبنم یہاں روا کر دے — حزونِ کرب سے دریا ہوئے ہیں کھارے مرے
ترے چمن کے سبھی پھول نوچ ڈالونگی — فلک سے ٹوٹ کے بکھرے اگر یہ تارے مرے
کوئی تو اترے سرِ بام روشنی لے کر — یہ گردِ غم سے بھرکے روز و شب نکھارے مرے
الٹ دیا ہے طبق کو کسی نے وحشت میں — زمیں کی گود سے نکلیں گے اب ستارے مرے
مرے نصیب سے وابستہ قسمتیں سب کی — سحؔر وہ بخت کبھی آن کے سنوارے مرے

مراق مرزا (ممبئی، بھارت)

یہ سچ نہیں کہ شکستہ دلوں میں خواب نہ ہو — اندھیری رات کی آنکھوں میں ماہتاب نہ ہو
میں شہرِ عشق میں بھٹکا ہوا مسافر ہوں — دعا کرو کہ مری زندگی عذاب نہ ہو
کبھی تو ہم کسی منزل پہ اس طرح بھی ملیں — کہ درمیان ہمارے کوئی حجاب نہ ہو
اگر ہے آگ کہیں تو دھواں اٹھے گا ضرور — گناہ ایسا نہیں کہ جو بے نقاب نہ ہو
دکھائی دینے لگے گی زمیں یہ مرگھٹ سی — بشر کے دل میں اگر کوئی آفتاب نہ ہو
تم اپنی پیاس سے رشتہ بنائے رکھو مراقؔ — نظر جو آتا ہے دریا کہیں سراب نہ ہو

نوید سروش (میر پور خاص)

دشمنوں ہی پہ مجھے اپنے سدا ناز رہا — دوستوں جیسا نہ اُن کا کبھی انداز رہا
جو تہی دست تھے منزل پہ وہی پہنچے ہیں — ساتھ بس رختِ سفر مرا آغاز رہا
ہم خیال ہوگئے وہ بھی جو مخالف تھے مرے — میری فطرت کے سبب یہ مرا اعجاز رہا
یک بہ یک ہوگیا روشن یہ مرا سارا وجود — جب تصور میں ترے مائلِ پرواز رہا
کس کو معلوم کہ کب کوئی مقابل آ جائے — جو مرا دشمنِ جاں تھا وہی ہم راز رہا
کس کی آواز تھی شامل مری خاموشی میں — کون تنہائی میں بن کر مری آواز رہا
جانے وہ کون تھا یہ سوچ رہا ہوں میں سروشؔ — جس کی خاطر مرا دروازۂ دل باز رہا

○

کاوشؔ عباسی (کیلی فورنیا)

شکستہ خواب پر آخر تو مجھ کو رونا تھا
جو تھا نصیب میں آخر وہی تو ہونا تھا

یہ تیوروں میں مرے اِک بگاڑ سا جو ہے
کبھی یہ سپنا کوئی سانولا سلونا تھا

خوشی تو کیا کوئی ملتی معاش میں پر آہ
وہ اک جو لذتِ غم تھی اُسے بھی کھونا تھا

گنوا کے غیرتِ خوں چند راحتوں کے لیے
میں اب یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ نہ ہونا تھا

اِک اُشک آنکھ میں میری رکھا گیا کاوشؔ
اُسی میں حال سب اپنا مجھے سمونا تھا

○

ڈاکٹر رضی محمد (میر پور خاص)

چلے جائیں، مگر جائیں گے کیسے؟
اکیلے آپ رہ پائیں گے کیسے؟

ہمارے بن، ہمارے پیار کے بن
بساطِ دل بچھا پائیں گے کیسے؟

ہمیں یہ خوشبو جب تم سے ملی ہے
تو ہم اوروں کو مہکائیں گے کیسے؟

تمہارا اسم ہے جب اسمِ الفت
تو ہم اوروں پہ دہرائیں گے کیسے؟

یہ گھر اک آدمی سے بھر گیا ہے
مسافر اس میں ٹھہرائیں گے کیسے؟

ہمارے ہوتے دو ننھے سے آنسو
تمہاری آنکھ میں آئیں گے کیسے؟

مقام ابتدا اگر انتہا ہے
تو اس نکتے سے بڑھ پائیں گے کیسے؟

اکٹھے جو بہت آساں لگے تھے
وہ غم تنہا سہے جائیں گے کیسے؟

تمہارے نام کے آخر میں کل سے
نیا اک نام سن پائیں گے کیسے؟

محبت آج سمجھوتا بنی ہے
یہ سمجھوتا نبھا پائیں گے کیسے؟

کہا تو تھا کہ سمجھائیں گے دل کو
یہ سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیسے؟

رضیؔ کو تنگ جو کرتے رہو گے
تو پھر وہ پاس آ پائیں گے کیسے؟

○

گلؔ بخشالوی (کھاریاں)

برہنہ پیڑوں کے پتے تلاش کرتا ہوں
گئی بہار کے خاکے تلاش کرتا ہوں

غموں کی بحر میں تنکے کا آسرا لے کر
میں حسرتوں کے کنارے تلاش کرتا ہوں

جہاں لُٹا تھا کبھی قافلہ محبت کا
اُسی نگر میں وہ رستے تلاش کرتا ہوں

مہک رہی ہے فضا آج جن کی خوشبو سے
میں کربلا کے وہ غنچے تلاش کرتا ہوں

کہاں گئی وہ محبت، کہاں گئے وہ لوگ
گئی رُتوں کے اثاثے تلاش کرتا ہوں

وہ جن کو دیکھ کے گلؔ کو سکون ملتا تھا
بہت دنوں سے وہ چہرے تلاش کرتا ہوں

○

شکیل جمالی

(دہلی، بھارت)

اشک پینے کے لیے خاک اُڑانے کے لیے
اب مرے پاس خزانہ ہے لٹانے کے لیے

ایسی دفعہ نہ لگا جس میں ضمانت مل جائے
میرے کردار کو چن اپنے نشانے کے لیے

کن زمینوں پہ اتارو گے اب امداد کا قہر
کون سا شہر اجاڑو گے بسانے کے لیے

میں نے ہاتھوں سے بجھائی ہے دہکتی ہوئی آگ
اپنے بچّے کے کھلونے کو بچانے کے لیے

ہوگئی ہے مری اجڑی ہوئی دنیا آباد
میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں یہ بتانے کے لیے

نفرتیں بیچنے والوں کی بھی مجبوری ہے
مال تو چاہیے دوکان چلانے کے لیے

جی تو کہتا ہے کہ بستر سے نہ اتروں کئی روز
گھر میں سامان تو ہو بیٹھ کے کھانے کے لیے

○

دیپک آرسی

(جانی پور، بھارت)

راکھ ہو جاتا ہے جب بستی کا اک گھر اور بھی
ڈر کوئی پیوست ہو جاتا ہے اندر اور بھی

جس میں کھارا پن نہیں ہے اور نہ تلچھٹ کا وجود
اُس نے رکھا ہے مِری خاطر سمندر اور بھی

جو ملا اونچا بہت اونچا ملا مجھ سے دراز
ڈھونڈنے نکلا تھا میں اپنے برابر اور بھی

بھول کر بیٹھے ہوئے ہیں دنیا بھر کے سنگ تراش
جس نے سب کو ہی تراشا ہے اِک آذر اور بھی

الوداع کہنا پڑا ہے عمر بھر جس میں رہا
جب ازل بتلا گئی ہے تیرا اک گھر اور بھی

ایک راون کا پتہ تھا ہے نیا راون عجب
دس اُتارے تو اُگ آئے سنکڑوں سر اور بھی

کاٹ کر نکلا ہی تھا وہ پنکھ میرے آرسی
جانے پھر کیسے نکل آئے مِرے پر اور بھی

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

وہ عرفانِ نفس مجھ کو عطا ہو
کہ قطرہ نہ سمندر سے جدا ہو

زمین و آسماں کے بیچ مجھ کو
تصوّر ہی ترا اِک خوش نما ہو

خدایا! دے مجھے ایسا کوئی گُن
کہ حق تخلیق کا مجھ سے ادا ہو

اَماں میں آبرو ڈرا کی چاہوں
تحفظ میرا، میری ہی رِدا ہو

عطا وجدان اِک پیغام میں ہو
لئے پھرتی معطّر سی ہوا ہو

جو سجدہ سارے سجدوں سے ہے افضل
اُسی سجدے پہ اپنی اِنتہا ہو!

○

کھلی کھڑکی

(ساکی)

ترجمہ: ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

(ساکی، جس کا اصلی نام ایچ ایچ منرو تھا ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۶ء میں انتقال کر گیا۔ پراسرار کہانیاں اس کی پہچان ہیں اور اسی حوالے سے اس نے اپنا تخلص ''ساکی'' رکھا جو درحقیقت ساقی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ وہ برما میں پیدا ہوا تھا مگر اس کی تعلیم انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے وہ گولی کا نشانہ بن کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا)

☆

''میری خالہ چند لمحوں میں نیچے اتر آئینگی اور آپ سے ملاقات کریں گی'' ایک بہت ہی مہذب، پراعتماد اور کم عمر پندرہ سالہ لڑکی نے کہا۔ ''اس چھوٹے سے عرصے میں تمہیں مجھے برداشت کرنا ہوگا۔'' مسٹر نٹل جو اس خاتون سے ملنے آئے تھے۔ ان کو خیال تھا کہ شاید یہ ملاقات بارآور نہ ہو۔ دراصل جب وہ اس دیہی علاقے میں کچھ ماہ گذارنے کے لئے روانہ ہوئے تھے تو ان کی بہن نے کہا تھا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں تنہائی اور گوشہ نشینی کے لئے جا رہے ہو۔ مگر پھر بھی انسان کو کسی نہ کسی سے کبھی نہ کبھی ملنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہیں مسز سٹیپلٹن کے نام تعارفی خط دے دونگی تا کہ تم کبھی دل بہلانے کے لئے ان سے مل لیا کرو۔ اسی مقصد سے وہ یہاں آئے تھے۔ ''کیا تم یہاں کئی لوگوں کو جانتے ہو؟'' لڑکی نے پوچھا۔ مسٹر نٹل نے کہا ''میں تو کسی ایک فرد کو بھی نہیں جانتا۔ مگر میری بہن نے تمھاری خالہ کے نام ایک خط دیا ہے'' اس پر لڑکی نے نہایت خود اعتمادی سے کہا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ کہ تم میری خالہ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔'' مسٹر نٹل کہنے لگے ''بالکل صحیح میں ان کے نام کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا'' انہوں نے دل میں سوچا کہ معلوم نہیں مسز سٹیپلٹن شادی شدہ ہیں، بیوہ ہیں یا اس عمر میں بھی وہ غیر شادی شدہ ہیں یعنی ان کی شادی کبھی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن پھر ڈرائنگ روم کے اطراف نظر ڈالتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ یہاں کسی مرد کا وجود رہا ہے۔ لڑکی نے چہرے پر سنجیدہ تاثرات لا کر کہا ''میری خالہ کے ساتھ آج ہی کے دن، تین سال پہلے ایک سخت المیہ ہوا تھا۔'' پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی۔ ''المیہ!'' مسٹر نٹل نے پوچھا۔ انہیں حیرت تھی کہ اس انتہائی خوبصورت اور پرامن علاقے میں کوئی المیہ بھی ہو سکتا ہے۔ لڑکی نے کہا کہ تمہیں حیرت ہونی چاہئے تھی کہ اکتوبر کی سرد سہ پہر کے وقت ہم نے یہ کھڑکی کیوں کھلی رکھی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بہت بڑی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جو باہر سبز لان پر کھلتی تھی۔ مسٹر نٹل نے پوچھا ''کیا اس کھڑکی کا اس المیے سے کوئی تعلق بنتا ہے۔ وہ کہنے لگی ''یقیناً، اسی کھڑکی کے ذریعے تین سال پہلے آج ہی کے دن ان کے شوہر اپنے دو بھائیوں کے ساتھ شکار پر نکلے تھے اور پھر وہ کبھی واپس نہ آئے۔ گھنے جنگل میں وہ اپنے پسندیدہ شکارگاہ کی طرف جا رہے تھے کہ دلدل کے اوپر چھائی ایک انتہائی سیاہ اور تاریک دھند نے ان کو نگل لیا۔ ان کی لاشیں بھی آج تک نہ مل سکیں۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان کی لاشیں بھی نہ ملیں کیونکہ۔۔'' اس لڑکی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اس کی آواز گھٹ گئی اور اس کی خود اعتمادی کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ جذبات کے تحت خاموش ہو گئی اور کچھ بول نہ سکی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سنبھلی اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میری بدنصیب خالہ اس وقت سے نہ صرف روتی رہتی ہے بلکہ اسے پختہ یقین ہے کہ وہ سب اپنے شریر کتے کے ساتھ اسی کھڑکی سے واپس آجائیں گے کہ جیسے وہ یہاں سے نکلے تھے۔ اسی وجہ سے یہ کھڑکی صبح کی پہلی کرن کے ساتھ کھول دی جاتی ہے۔ اور رات کو مکمل اندھیرا ہونے کے بعد ہی بند کی جاتی ہے۔ مجھے اپنی بدنصیب خالہ پر بہت رحم آتا ہے۔ اور میں دکھی ہو جاتی ہوں انہوں نے مجھے بار بار بتایا ہے کہ جب ان کا شوہر اپنے سیدھے ہاتھ پر سفید رنگ کی برساتی ڈالے اور ان کا چھوٹا بھائی ''رونی'' باہر نکلے تھے تو سب سے چھوٹا بھائی ایک گانے کی دھن کی سیٹی بجاتا ہنستا کھیلتا باہر نکلا تھا مگر انہیں آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ وہ یہ منظر بھلائے نہیں بھولتی مقامی انتظامیہ نے انہیں سمجھایا ہے کہ واقعی انہیں زمین ہی نگل گئی ہے۔ وہ اس کی ایسی منظر کشی کرتی ہیں اور اس یقین سے کہتی ہیں کہ کسی بھی دن وہ کھڑکی سے اسی طرح ہنستے کھیلتے واپس آئیں گے، جیسے نکلے تھے۔ اس ڈرائنگ روم میں ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے یہ سن کر مجھے جھرجھری سی آتی ہے اور خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ کہیں سچ مچ میں وہ کھڑکی سے اندر نہ آجائیں۔ یہ سنتے ہوئے مسٹر نٹل پر اس بیان کا بڑا گہرا اثر ہوا مگر اسی لمحے اس کی خالہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں اور انہوں نے بڑے خلوص سے تھوڑا سا جھک کر مسٹر نٹل سے اپنی تاخیر پر معذرت کی اور کہنے لگیں کہ مجھے امید ہے کہ میری بھانجی نے اس دوران تمہاری خاطر خواہ مہمانداری کی ہوگی اور تمہیں بور نہ ہونے دیا ہوگا۔ مسٹر نٹل نے جواب دیا ''نہیں نہیں اس نے تو بڑی دلچسپ باتیں کی ہیں۔ مسز سٹیپلٹن نے کہا کہ یہ کھلی ہوئی کھڑکی تمہارے لئے تکلیف دہ تو نہیں کیونکہ میرا شوہر اور اس کے بھائی کچھ ہی دیر بعد شکار کے بعد اسی کھڑکی سے واپس آئیں گے۔ وہ شکار پر گئے ہوئے ہیں اور ان کے جوتے یقیناً کیچڑ میں لت پت ہوں گے مگر انہیں اس بات کی کوئی پروا نہ ہوگی کہ وہ میرے صاف ستھرے فرش کو خراب کر دیں گے کیونکہ مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک شکاریات پر اور اپنے شوہر کے شکار کے شوق پر گفتگو کرتی رہیں۔ مگر مسٹر نٹل کو یہ گفتگو بالکل نہیں بھا رہی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ بڑھیا غم میں پاگل ہو چکی ہے۔ انہوں نے کوشش کی کہ بات کسی طرح بدل دیں مگر وہ مستقل اسی موضوع پر جمی رہیں۔ ادھر ان کی بھانجی مسٹر نٹل کی طرف دیکھ کر اپنی آنکھیں گول گول گھما رہی تھی۔ وہ کبھی کبھی ترچھی نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے اور انہیں اس بات کا پچھتاوا تھا کہ انہوں نے اس ملاقات کے لئے وہی دن چنا تھا کہ جو اس المیے کی برسی کا دن تھا۔

مسز سٹیپلٹن کہنے لگیں کہ میری صحت ٹھیک نہیں ڈاکٹروں نے مجھے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے اور کسی قسم کے ذہنی دباؤ سے بچنے کے لئے کہا ہے۔ مسٹر نٹل ان سے متفق تھے اور کہنے لگے واقعی آپ کو جسمانی اور ذہنی آرام کی ضرورت ہے۔‘‘ ہے تو صحیح!‘‘ پھر مسز سٹیپلٹن نے اچانک کھڑکی کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور چہرے پر خوشی لہرا گئی۔ انہوں نے تقریباً چیختے ہوئے کہا ارے وہ آ گئے۔ چائے کے وقت سے پہلے ہی۔ اب وہ ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو سکیں گے۔ مسٹر نٹل کا وجود جیسے اندر ہی اندر خوف سے کپکپانے لگا اور انہوں نے لڑکی کی طرف دیکھا جس میں یہ پیغام چھپا تھا کہ میں تمہاری خالہ کی ذہنی حالت کو سمجھتا ہوں۔ پھر انہوں نے کھلی کھڑکی کے پار سبزہ زار کی طرف دکھا۔ شام کے جھٹ پٹے اور ہلکی دھند میں تین اشخاص کھڑکی کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر شکاری بندوقیں تھیں اور سب کے بوٹ کیچڑ سے آلودہ تھے، ایک آدمی کے سیدھے ہاتھ پر سفید برساتی تھی اور ایک پیارا سا کتا تھکے تھکے قدموں سے ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔ مسٹر نٹل نے گھبرا کر اپنا ٹوپ اور چھڑی اٹھائی اور بدک کر بھاگ کھڑے ہوئے اور اس قدر تیزی سے بھاگے کے سامنے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ جس آدمی کے سیدھے ہاتھ پر برساتی پڑی تھی اس نے داخل ہو کر بڑے پیار سے مسز سٹیپلٹن کو دیکھ کر کہا ’’میری پیاری دیکھو میں شام سے پہلے واپس آ گیا۔ ہاں، میرے جوتوں پر کیچڑ لگی ہے۔ لیکن وہ خشک ہو گئی ہے۔‘‘ پھر کہنے لگے ’’مائی ڈیئر یہ کون تھا جو مجھے دیکھ کر حواس باختہ ہو کر بھاگ کھڑا ہو۔‘‘ وہ کہنے لگیں، ’’مجھے بھی حیرت ہے۔ یہ کوئی مسٹر نٹل تھا، جو شاید مجھ سے ملنے آیا تھا۔ مگر جانے کیوں سماجی آداب کے برخلاف بائی بائی کئے بغیر یا اجازت لئے بغیر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ یا پھر شاید وہ اس کتے سے ڈر گیا جو تمہارے ساتھ آ رہا تھا کیونکہ اس کی بہن نے مجھے بتایا تھا کہ ایک دفعہ وہ ہندوستان میں گنگا کے کنارے جنگلی کتوں میں پھنس گیا تھا اور بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا۔

ان کی بھانجی صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور زیر لب مسکرا رہی تھی۔ فی البدیہہ افسانہ طرازی اس کی خاصیت تھی۔

- بقیہ -

زہریلا انسان

اکاؤنٹ میں کُل کتنے روپے تھے۔ لیکن میں بنک سے حسبِ منشا رقم نکلوا لیتا تھا۔ ایک تو میرے اخراجات خاصے محدود تھے اور دوسرا مجھے بے جا اسراف کی عادت ہی نہیں تھی۔ پچھلے دس ماہ میں مَیں نے ایک دن کیفے ٹیریا میں جا کر کچھ کھانے پینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہاں پر میرے علاوہ تقریباً ہر لڑکے کے پاس انواع و اقسام کے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر تھے۔

ایک بار امر کہنے لگا تمہارے جانے سے ہاسٹل میں میرا من نہیں لگتا تھا۔ اگر تمہارے ماتا پتا برا نہ مانیں تو میں بھی کسی ہفتے تمہارے ساتھ گھر جایا کروں؟ میں نے امر کو اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتانے کے بعد کہا تھا کہ وہ جب بھی چاہے میرے ساتھ میری جھونپڑی میں جا سکتا ہے۔ اس نے سمجھا شاید میں مذاق کر رہا ہوں لیکن مجھے سنجیدہ دیکھ کر کہنے لگا، اچھے میں کبھی تمہارے ساتھ چل کر دیکھوں گا۔ اس کے بعد امر نے کبھی میرے ساتھ جانے کا نہیں کہا۔ ہر ہفتے مجھے جیپ میں گھر لے جانے والے ڈرائیور کا نام رحیم چاچا تھا۔ وہ بھی میری طرح کم گو تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ میرے قریب آ گئے۔ ایک بار میں نے انہیں کہا کہ میں گاڑی چلانا سیکھنا چاہتا ہوں۔ اس روز کے بعد ہر ہفتے کالج سے گھر اور گھر سے کالج آتے جاتے اوقت انہوں نے مجھے گاڑی چلانا سکھانا شروع کر دیا۔ سات آٹھ ماہ کے اندر اندر انہوں نے مجھے بھی ایک مشتاق ڈرائیور بنا دیا۔ مجھے کئی اقسام کی گاڑیوں کو چلانے کا تجربہ دینے کے واسطے وہ مجھے چھوڑنے کے لیے کبھی کار لے آتے اور کبھی جیپ۔ اس طرح مجھے کار اور جیپ چلانے کی خاصی مہارت ہو گئی تھی۔ مجھے اس کالج میں آئے ہوئے تقریباً آٹھ نو ماہ ہوئے تھے۔ اس دوران میں نے اپنی دوستی کا دائرہ صرف امر تک ہی محدود رکھا تھا۔

دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو میں اپنے معمول کے مطابق آٹھ بجے لائبریری سے اٹھا، امر کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اس کے کمرے میں کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کیں اور پھر چائے پی کر اپنے کمرے میں آیا۔ نہا کر سونے کے کپڑے پہنے، کالی کو بیگ سے نکال کر کچھ دیر تک باتیں کرتا رہا پھر کالی کو اپنے بیگ میں رکھ کر بتی بجھا کر تقریباً دس بجے سو گیا۔ مجھے بہت جلد گہری نیند آ جاتی ہے۔ آج بھی نیند کی دیوی نے آنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ دروازہ زور زور سے پیٹنے کے شور سے میری آنکھ بوکھلاہٹ میں کھلی۔ چند لمحے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شور کہاں سے آ رہا ہے اور کون کس کا دروازہ پیٹ رہا ہے۔ غور کیا تو کوئی میرے دروازے کو بری طرح پیٹنے کے ساتھ ساتھ چیخ چیخ کر میرا نام لے لے کر مجھے دروازہ کھولنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ہمارے وارڈن مسٹر والٹن اپنے سونے کے کپڑوں میں بوکھلائے کھڑے تھے۔ میرے دروازہ کھولنے پر انہوں نے اسی بوکھلاہٹ میں مجھے کہا، میرے ساتھ جلدی سے چلو۔ کسی لڑکے کو سانپ نے کاٹا ہے، پرنسپل صاحب نے مجھے تمہیں بلانے کو کہا ہے۔ سب سے پہلے مجھے کالی کا خیال آیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں یہ حرکت کالی کی تو نہیں۔ مجھے پر جیسے کوئی بجلی گری تھی اس کے ساتھ ہی میرا دماغ سے سُن ہو گیا۔

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (نیویارک)

قسط......۵

میں، جینا اور ٹام اس دلچسپ مماثلت پر حیران تھے۔ میں نے مسکرا کر کہا، لگتا ہے، ہم پچھلے جنم میں ایک دوسرے کے کچھ لگتے تھے۔ معلوم نہیں یہ محض ایک اتفاق ہے یا جنیٹکس کا ورثہ؟ ٹام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا؟ اگر یہ ورثہ ہے تو پھر ہم اس جنم میں بھی ایک دوسرے کے کچھ لگتے ہیں، میں نے کہا۔ جینا بولی، ہاں اس جنم میں ہم دوست ہیں، یہ کوئی کم رشتہ تو نہیں۔ اس پر ہم تینوں کھُل کر ہنسے۔ ٹام بولا، میں اس پر مزید تحقیق ضرور کرونگا لیکن آج کے بعد تم اس تل کو ایک دوسرے کی دوستی کا نشان سمجھنا۔ بالکل، جینا اور میں نے بیک وقت کہا۔ جیپ سرکٹ ہاؤس میں دوپہر کے دو بجے داخل ہوئی۔ برآمدے میں خانسامے نے ہمیں کھانے کی تیاری کی اطلاع دی۔ کھانے کی میز پر مائیکل اور ڈانا ہمارے منتظر تھے۔ کھانے سے پہلے جینا اپنی ماں کو ہمارے ہاتھ کے تل کے بارے میں بتانا نہیں بھولی۔ اس نے یہ تل مائیکل کو بھی دکھایا۔ ہماری طرح وہ دونوں بھی اس اتفاق پر حیران ہوئے۔ سب کی بھوک چمک رہی تھی اس لیے سب لوگوں کا دھیان کھانے پر تھا۔ میں نے سب کی دیکھا دیکھی پہلے ہاتھ دھوئے، پھر ان کی تقلید میں آہستہ آہستہ کھانا کھاتا رہا۔ میں انہیں یہ محسوس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ کرسی پر بیٹھ کر کانٹوں، چھریوں اور چمچوں سے کھانا کھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

کھانے کے بعد جینا اپنا کیمرہ لے آئی اور بولی، میں نے کالی کے ساتھ کئی تصاویر کھینچوائی ہیں اب تمہارے ساتھ بھی تصاویر اترواؤں گی۔ میں نے جینا اور باقی تمام گھر والوں کے ساتھ کئی تصاویر بنوائیں۔ باقی تصویروں کے علاوہ ایک تصویر میں نے اور جینا نے اپنے پیدائشی نشان کی بھی بنوائی۔ اس تصویر میں ہم دونوں اپنے ہاتھوں کے پیدائشی نشان کیمرے کو دکھا رہے ہیں۔ تصویریں اترواتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ان لوگوں نے ابھی چلے جانا ہے اور اس سے پہلے کہ یہ مجھے جانے کو کہیں مجھے خود ہی چلے جانا چاہیے۔ میں نے آہستہ سے ٹام سے کہا کہ وہ مجھے اب جانے کی آ گیا دیں۔ جینا نے وعدہ کیا وہ مجھے تمام تصویریں بھجوائے گی۔ پھر اس نے تقریباً بھرائی ہوئی آواز میں مجھے گلے لگاتے ہوئے میرے ماتھے کو بوسہ دے کر الوداع کرتے ہوئے مجھے خط کا جواب دینے کی تاکید کر کے کہنے لگی، تمہارے ساتھ گزرا ہوا وقت نہ جانے اتنی جلدی کیوں بیت گیا۔ میری آنکھوں سے اُس کے محبت بھرے رویے سے آنسو بھر آئے۔ ڈانا نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا، تمہیں ملے ہوئے صرف دو روز ہوئے ہیں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے تم ہمارے خاندان کا ایک فرد ہو۔ تم نے ہم سب پر جو احسان کیا ہے وہ ہمیں کبھی نہیں بھول پائے گا۔ ہم ہر سال تمہیں ملنے آئیں گے اور تمہیں کسی گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے ساتھ لندن لے جائیں گے۔ میں نے سب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کیا اور ان سب نے میرا۔ پھر تمام لوگ مجھے جیپ تک چھوڑنے آئے۔ ڈرائیور نے میرے بیٹھتے ہی جیپ کو آگے بڑھا دیا۔ جب تک جیپ نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی وہ لوگ وہیں کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے۔

جیپ نے سڑک ناپنا شروع کی تو میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن کی باگ کھلی چھوڑ دی۔ پچھلے دو دنوں سے مجھے سوچنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کسی فلم کی کہانی کا کوئی حصہ لگتے تھے اور ان میں حقیقت کا شائبہ کم کم نظر آتا تھا۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ پچھلے دو دنوں کے واقعات کو اپنے دل کے کس خانے میں رکھوں۔ دل کے کئی خانے ہوتے ہیں، محبت کا، جذبات کا، عقیدت کا، خونی رشتوں کا، دوستی کا، تعلق کا، ہمسایہ گیری کا، خوف کا، مذہب کا، ملک کا، مٹی کا، سرزمین کا، زبان کا خانہ اس کے علاوہ نہ جانے اور کتنے خانے ہیں اور کسی کو دل کے کسی خانے میں بٹھانے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ زیادہ نازک رشتوں کے لیے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ کسی سے دوستی اور محبت یا جذباتی لگاؤ پیدا کرنا ایک دو دن کا کھیل نہیں ہے۔ اس دشت کو پار کرنے میں سالوں لگ جاتے ہیں۔ میں نے جینا کو دوستی کا وچن ضرور دیا تھا اس سے دوستی نہیں کی تھی۔ اور پھر دوستی زبانی کلامی نہیں عملی شے کا نام ہے۔ صرف دو دنوں کی جانکاری کے بعد نہ کسی کا عمل پرکھا جا سکتا ہے اور نہ کسی کو دوست کہا جا سکتا ہے۔ مجھے ابھی کسی کو اپنے دل کے کسی خانے میں رکھنے کی اتنی جلدی بھی نہیں تھی۔

لیکن ایک حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح تھی کہ ان لوگوں نے بغیر کسی لالچ کے دو دن کے قلیل عرصے میں مجھے میری اوقات سے بہت زیادہ دیا تھا۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد کسی نے مجھے ایک بار بھی جتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے ان کی کسی بات سے کسی قسم کے ذاتی مطلب یا مفاد کی ابھی تک بو نہیں آئی تھی۔ اور جہاں تک مفاد کا تعلق ہے تو میرے پاس ان کو دینے کے لیے بھلا تھا ہی کیا اور وہ میرے بارے میں سب کچھ کسی کھلی کتاب کی طرح جانتے تھے۔ میں نے اب تک اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لوگوں کو سانپ کی کاٹ سے بچایا تھا۔ ان میں چاچو کے علاوہ ابھی تک مجھے کسی نے کچھ نہیں دیا تھا۔ مجھے غلط مت سمجھیں، میں کسی سے کچھ لینے کے لالچ میں کسی کا کبھی علاج نہیں کرتا۔ میں تو صرف دوسرے لوگوں سے جینا اور اسکے خاندان کا موازنہ کر رہا ہوں۔

میں نے اپنی سترہ سالہ زندگی میں کبھی اتنا شاندار خواب دیکھنے کی بھی جسارت نہیں کی تھی جتنا مجھے یہ سب کچھ پچھلے دو دنوں میں ملا تھا۔ ان لوگوں نے ایک معمولی سے سپیرے کو، جس کے لیے ہائی سکول کا منہ دیکھنا کسی کرشمے سے کم نہ تھا، اٹھا کر ایک ایسے کالج میں داخل کرا دیا تھا جس میں کروڑ پتی والدین کی اولاد داخل ہونے کو ترستی تھی۔ اس کالج میں ارب پتی والدین کی اولاد، بڑے بڑے سیاستدانوں کی اولاد، بڑے بڑے نوابوں اور راجاؤں کی اولاد پڑھنے کے لیے

ملک کے طول وعرض سے آتی تھی۔ والدین سالوں اس کالج میں بچوں کے داخلے کا انتظار کرتے تھے۔ اس کالج میں داخل ہونے والے ملک کے سب سے کامیاب ترین طلباء تصور کیے جاتے تھے، اور یہاں کا داخلہ ہی طلباء کے روشن مستقبل کی ضمانت تصور کیا جاتا تھا۔

مجھے اس بات کا سکون تھا کہ میں نے یہ سب کچھ مانگا نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ میری جھولی میں آ کر گرا تھا۔ بابو کہا کرتے تھے، نہ مانگے ملے دودھ، مانگے ملے پانی۔ اوپر والا ہرایک کو اپنے سمے پر دان کرتا ہے۔ یہ سب کچھ مجھ پر دان ہی ہوا تھا۔ اوپر والے کی دان کو ٹھکرانا بھی کفرانِ نعمت میں شمار ہوتا۔ اس لیے یہ کام مجھے وقت پر چھوڑ دینا چاہیے اور مجھے سمے کے دھاروں کے ساتھ بہنا چاہیے۔ یہ دھارے مجھے میری منزل تک پہنچادیں گے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ مجھے منزل تک پہنچنے کے لیے اپنے تمام حواس کو بحال رکھنا ہوگا۔ باقی کام اوپر والے کا ہے اور پھر ابھی تک مجھے خود بھی اپنی منزل کا علم نہیں تھا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں خود کو پُرسکون سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہم لوگ جھونپڑی تک پہنچنے والے تھے۔ کل جو سفر ہم نے بس میں بیٹھ کر دو تین گھنٹوں میں طے کیا تھا، آج جیپ نے اسی فاصلے کو آدھے گھنٹے سے کم وقت میں طے کر لیا تھا۔ ڈھلوان پر پہنچ کر ڈرائیور نے جیپ روکی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا، اس نے مجھے پندرہ دن بعد تیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے گاڑی واپسی کے لیے موڑی اور میں ڈھلوان پر چڑھنے لگا۔

جھونپڑی میں بابو اپنے بستر پر ہاتھ میں دارو کا کٹورہ لئے ہوئے آہستہ سے گنگنا رہے تھے۔ میری غیر متوقع آمد پر خاصے حیران ہوئے اور کالی بھی اڑتی ہوئی میرے کندھوں پر آن بیٹھی۔ بابو بولے، رامو بیٹے سب خیریت تو ہے، تم نے تو کل آنا تھا۔ ہاں بابو، داخلہ آج ہی ہو گیا اور وہ بھی سیاحوں کی وجہ سے دوسرے کالج میں ہوا ہے، میں نے زیادہ تمہید میں نہ جاتے ہوئے کہا۔ میں بابو کو جانتا ہوں انہیں ایسی غیر ضروری باتوں سے کم دلچسپی ہے۔ بابو بولے، ہاں وہ لوگ آج صبح یہاں آئے تھے۔ ٹام نے جب تمہارا نام اخبار میں دیکھا تو تم سے خاصا متاثر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ تمہیں ایک بڑے کالج میں داخل کرائے گا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ اس بات کا فیصلہ میرا رامو کرے گا۔ مجھے صرف ایک بات کا قلق تھا کہ کہیں ماسٹر جی بُرا نہ مانیں۔ نہیں، چاچو خوشی سے راضی ہو گئے تھے، یہاں بھی میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ تم ماسٹر جی کی سسرال میں ہی رہو گے نا، بابو نے پیالے سے دارو کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ نہیں بابو، بڑے کالج میں رہائش کا بھی سارا انتظام ہے، میں نے جواب دیا۔ ماسٹر جی نے رہائش کا بھی بُرا نہیں مانا؟ بابو نے پوچھا۔ نہیں بابو، میں یہ کہتا ہوا گھڑے سے پیالے میں اپنے لیے دارو انڈیلنے لگا تو بابو نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا، یہ تم نے فوجیوں جیسے بال کس سے کٹوائے ہیں رامو؟ ان بالوں نے تمہاری شخصیت بدل دی ہے اور تم بھلے لگ رہے ہو۔ میں ہاتھ میں کٹورہ لے کر پلٹا اور اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بابو سے کہا، میرے بال نئے کالج والوں نے کاٹے ہیں، بابو۔

بستر پر بیٹھ کر میں نے دارو کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور بابو سے پوچھا، بابو نہ جانے یہ سیاح مجھ پر اتنا زیادہ مہربان کیوں ہو گئے ہیں؟ کوئی انسان کبھی کسی پر اوپر والے کی مرضی کے بغیر مہربان نہیں ہوتا بیٹے۔ یہ سب کچھ اوپر سے آتا ہے۔ جب اُدھر سے منظوری آتی ہے تو سب کچھ خود بخود ہونا شروع ہو جاتا ہے، بابو نے آکاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تم نے کسی سے کچھ مانگا تو نہیں نا؟ بابو نے اپنا خالی کٹورہ ایک طرف رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ نہیں بابو، میں نے جواب دیا۔ تو جو کچھ بن مانگے ملے اسے لینے سے انکاری ہونے کی بجائے اسے فخر سے لینا چاہیے۔ کل اور آج میرے لیے جو کچھ بھی لے کر آئے ہیں میں نے انہیں لے کر آنے دیا ہے بابو، میں نے دارو کا پیالہ خالی کیا اور اپنے بستر پر دراز ہو کر اپنے سینے پر لیٹی ہوئی کالی کا بدن سہلانے لگا۔ مجھے کالی سے کھیلتا دیکھ کر بابو کہنے لگے۔ کالی اس سیاح لڑکی سے دو دن کے اندر خاصی مانوس ہو گئی ہے اور وہ لڑکی بھی کالی سے ایسے ہی مانوس ہو گئی ہے۔ ہاں بابو یہ بات میرے لیے حیران کن ہے۔ کالی نے آج تک میرے علاوہ کسی اور سے اتنی اپنائیت پہلے کبھی نہیں دکھائی۔ میری بات سن کر بابو بولے، نہیں رامو بیٹے۔ دراصل کالی سے اس لڑکی کے علاوہ اتنی محبت بھرا رویہ تمہارے علاوہ کسی اور نے اس سے پہلے نہیں برتا اور اس لڑکی نے تمہارے ساتھ اپنائیت کا جو سلوک برتا ہے اسے کالی نے محسوس کیا ہے۔ لڑکی کے اس رویے کی وجہ شاید یہ ہے کہ تم دونوں نے اس کے باپ کی جان بچانے میں برابر کا حصہ لیا ہے۔ بابو کی بات سچ تھی مجھے اور کالی کو آج تک ایک دوسرے کے علاوہ کوئی تیسرا پیار کرنے والا نہیں ملا تھا اور جینا بھی ہم دونوں سے اپنے باپ کی وساطت سے جڑی ہوئی تھی۔ دارو کے خمار سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں پھر میری آنکھیں دوسری صبح کے وقت کھلیں۔

آٹھ دن ایسے ہی گزر گئے، میں اپنی سوچ کو سمیٹ کر آنے والے سمے کا منتظر تھا۔ نویں دن چاچو خوش خوش ہمارے ہاں آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک بیگ تھا، مجھے بڑی گرم جوشی سے گلے لگا کر بیگ مجھے دیتے ہوئے کہا، تمہاری امی نے تمہارے لیے نیا بیگ اور نئے کپڑے بھجوائے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ نئے کالج میں گٹھڑی کی بجائے نئے کپڑے بیگ میں بھلے لگیں گے۔ میں نے بیگ کھولا تو اندر تین جوڑے کپڑوں کے تھے۔ ان میں دو جوڑے سفید کڑھے ہوئے کرتے اور دو سفید پاجامے تھے۔ ایک جین کی پتلون اور سفید قمیص کے علاوہ ایک جوڑا جوتوں کا تھا۔ میں کپڑے دیکھ چکا تو چاچو بولے، رامو بیٹے تمہارے بھاگوں مجھے اتنی اچھی نوکری ملی ہے۔ بابو نے تصیح کرتے ہوئے کہا، کسی کے بھاگوں کچھ نہیں ملتا ماسٹر جی، سب کو اپنے کرموں کا پھل ملتا ہے۔ آپ کو جو بھی ملا ہے آپ کا اپنا کرما ہے۔ آپ کی بات ٹھیک ہے شان جی۔ پر اوپر والا بھی تو کسی کو ذریعہ بنا کر ہی دیتا ہے نا۔ میرا واسطہ تو آپ لوگ بنے ہیں۔ اب میری ہی مثال لے کر دیکھیں۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ میں پاہیرالہ سے یہاں رامو کے لیے ہی آیا

تھا۔ یہاں میرا تبادلہ ہوتے ہی آپ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ رامو کے سا ول سے فارغ ہوتے ہی مجھے اس کالج میں نوکری ملی جہاں پر میری پہلے بھیجی ہوئی درخواست کو رڈی کی ٹوکری میں پھینکا جاتا تھا اور اب کی بار مجھے انٹرویو اور کاغذات دیکھے بغیر نوکری مل گئی۔ ہاں اور سنو۔ مجھے یہاں سے نوکری بھی نہیں چھوڑنا پڑے گی۔ سکول سے میری پنشن بھی منظور ہوگئی اور نئے کالج میں میری ڈھائی گنا تنخواہ بھی ہوگئی ہے۔ ہم لوگ پاہیرالہ میں اپنے مکان میں شفٹ بھی ہو گئے ہیں۔ ہمارا گھر کالج سے کوئی دو میل دور ہے۔

پھر چاچو نے کالج کے بارے میں کچھ تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ بیٹے، تم نے مسٹر ٹامس سمتھ کی جان بچائی ہے۔ جو کانونٹ کالج کا مالک ہے۔ مسٹر سمتھ نے آج سے بیس سال بیشتر ہندوستاں میں ایک کانونٹ سکول کھولا تھا۔ سکول کیا تھا امیر وکبیر خاندان کے بچوں کی تعلیم اور تربیت کا ایک تجربہ تھا۔ جو اتنا کامیاب ہوا کہ تین سالوں میں اسے دسویں سے بارہویں تک کا درجہ دے کر کالج بنا دیا گیا۔ بیس سال بعد مسٹر سمتھ کے پورے ملک میں چار کالج ہیں اور پانچواں بن رہا ہے۔ ہر کالج میں اس نے اپنے خاندان کا ایک نہ ایک فرد پرنسپل بنا کر برطانیہ سے بھیجا ہوا ہے۔ اور خود اوکسفورڈ میں پروفیسر ہے، وہ لندن سے ہندوستان ایسے آتا جاتا ہے جیسے ہم بیجی خلی سے پاہیرالہ آتے جاتے ہیں۔ اس کا چھوٹا بھائی مسٹر رچرڈ سمتھ پاہیرالہ کالج کا پرنسپل ہے۔ اس نے مجھے سکول میں اردو اور ہندی پڑھانے کے لیے لیکچرار بنا دیا۔ مسٹر رچرڈ سمتھ نے ہی مجھے بتایا ہے کہ تم نے اس کی موجودگی میں اس کے بڑے بھائی کو موت کے منہ سے نکالا تھا۔

بیٹا جہاں تمہارا داخلہ ہوا ہے وہاں پڑھنے والے طلباء کسی اعلیٰ ہوٹل کے مہمانوں کی طرح رہتے ہیں۔ پڑھائی کے علاوہ ان طلباء کو اور کسی بات کی فکر نہیں ہوتی۔ کھانا پینا، پہننا، رہنا، کمروں کی صفائی غرض زندگی کی تمام ذمہ داریاں کالج کے سر ہیں۔ ہر کالج میں کم از کم پانچ سو طلباء اور طالبات ہیں۔ ایک کالج کا سالانہ بجٹ ہمارے ملک کی کئی ریاستوں کے سالانہ بجٹ سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہم ان کی زبان بولتے، پڑھتے اور لکھتے وقت بگاڑتے ہیں، اس لیے وہ دیسی لوگوں کو انگریزی پڑھانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس کالج میں انگریزی زبان صرف انگریز پڑھاتے ہیں۔ باقی تمام مضامین کے لیے دیسی ملازم رکھے گئے ہیں۔ مسٹر سمتھ نے تمہاری دیکھ بھال بھی میرے ذمے لگا دی ہے اور مجھے بتایا ہے کہ تمہارا قیام بھی کالج میں ہی ہوگا۔ اگر وہ نہ بھی کہتے تب بھی تمہارا خیال رکھنا میرا فرض بنتا ہے۔ اتنی باتیں بتانے کے بعد چاچو نے پوچھا، اچھا اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارا پاہیرالہ جانے کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے بتایا کہ شکروار کو جیپ مجھے لینے آئے گی تو کالج جاؤں گا۔ کہنے لگے، میری مانو تو چند دن ہمارے ہاں آجاؤ۔ دراصل میں آج اسی مقصد کے لیے ہی آیا تھا۔ تمہاری امی کا خیال ہے اگر تم چند دن ہمارے ہاں رہ جاؤ گے تو کالج جانے سے پہلے کچھ تروتازہ ہو جاؤ گے۔

آپ کا شکریہ چاچو، میرے جانے سے باپوا کیلے رہ جائیں گے اس لیے میں زیادہ سے زیادہ وقت ان کی سیوا میں رہنا چاہتا ہوں۔ میرے جواب پر باپو نے کہا۔ تو میری فکر مت کر رامو بیٹے، اپنی سوچ۔ میں نے کہا، میں نے اپنی سوچ کر ہی جواب دیا ہے باپو۔ آپ کے بغیر میں بھی تو اداس ہو جاتا ہوں۔ میری بات سن کر باپو نے مجھے اپنی بغل میں بھینچتے ہوئے کہا، میں کہیں بھاگا تھوڑی جا رہا ہوں، بہادر بن رے۔ تم اپنا جیون شروع کر رہے ہو اور میرا جیون تو بس۔۔۔ میں نے باپو کو ٹوکتے ہوئے کہا، بس بس آگے کچھ مت بولو باپو۔ مجھے یہ سب کچھ سوچنا اچھا نہیں لگتا۔ باپو نے مسکرا کر میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا، اچھا اچھا آگے کچھ نہیں کہوں گا۔ چاچو نے گہری سانس لے کر کہا، اگر تم اب نہیں جانا چاہتے تو کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں پاہیرالہ میں رہتے ہوئے جب بھی جی چاہے ہمارے گھر آجایا کرنا اور پھر کالج میں تو تم سے ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ چاچو کچھ دیر تک بیٹھے باپو سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اُٹھتے ہوئے بولے، اچھا اب میں چلتا ہوں تاکہ گھر جانے کے لیے آخری بس پکڑ سکوں۔ چاچو کے جاتے ہی باپو نے پوچھا، کالی کے بارے میں تم نے کیا کچھ سوچا ہے؟ یہ تمہارے ساتھ جائے گی یا یہیں رہے گی۔ میرے خیال میں وہاں پر مکمل طور پر سیٹ ہونے کے بعد ہی اسے ساتھ لے جاؤں گا، میں نے جواب دیا۔ ایسے میں چند لوگ ایک بچے کو سانپ کاٹے کے علاج کے لیے لے آئے، باپو ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو میں نے بیگ جھونپڑی میں لا کر ایک طرف رکھ دیا۔

باقی دن بھی ایسے ہی گزر گئے۔ شکروار کو جیپ نے مجھے لینے آنا تھا۔ باپو نے مجھے صبح اپنے وقت پر اُٹھا دیا۔ کہنے لگے، جاتے وقت اپنے ساتھ چند منکے لیتے جانا، پھر ایک جار کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، اس میں مَیں نے تمہارے لیے رات کی رانی کے پھول اور پتیاں سکھا کے رکھی ہیں۔ یہ بھی اپنے بیگ میں رکھ لو اور ہاں اپنی بین بھی ساتھ لے جانا نہ بھولنا۔ ان چیزوں کی کیا ضرورت ہے باپو؟ میں پڑھنے کے لیے جا رہا ہوں، کسی سانپ کے کاٹے کا علاج کرنے نہیں، میں نے باپو کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ باپو اپنی جگہ سے اُٹھ کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولے، تم سپیرے ہو رامو بیٹے اور یہ تمہارے ہتھیار ہیں۔ یہ تمہارے ساتھ ایسے رہنے چاہئیں جیسے ایک بڑھئی کے ساتھ اس کے اوزار رہتے ہیں۔ اپنے اوزاروں کے بغیر ہنر مند لوگ بے ہنر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نہیں معلوم تمہیں کب ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑے جہاں تمہاری ضرورت آن پڑے اور تم اپنے ہتھیار نہ ہونے کی وجہ سے بے بسی سے ہاتھ ملتے رہ جاؤ اور پھر تمام جیون پچھتاوے میں گزارو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی ایسا ہوا تو تم تمام عمر خود کو معاف نہیں کرو گے۔ باپو سچ کہہ رہے تھے اور ان کی یہ بات میں نے ایسے پلّے باندھی کہ اس روز کے بعد کبھی ان تینوں ہتھیاروں کے بغیر اپنے گھر سے نہیں نکلا۔

میں نے ان تینوں ہتھیاروں کو اپنے کپڑوں کے بیگ میں رکھ دیا۔

نئے کپڑے پہننے کا وقت آیا تو ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ مجھے پہلے دن سکول میں پتلون اور قمیص پہن کر جانا چاہیے۔ لیکن پھر سوچا کہ ہر کپڑا پہننے، پہن کر

بیٹھنے اور چلنے کے اپنے آداب ہوتے ہیں اور خلافِ آداب کپڑے پہننے والا چھچھورا لگتا ہے۔ میں نے زندگی میں اس سے پہلے جین کبھی نہیں پہنی تھی اور مجھے جین پہننے کے آداب بھی نہیں آتے تھے۔ میں نہ کسی کو خود پر ہنسنے کی دعوت دینا چاہتا تھا اور نہ ہی کسی کے مذاق کا نشانہ بننا چاہتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے بیگ سے اپنے لیے ایک نیا کرتا پاجامہ نکال کر پہن لیا اور اپنی زندگی کا ایک نیا موڑ مڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔

جیپ ٹھیک دس بجے پہنچی تو میں تیار بیٹھا تھا۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا، باپو اور کالی کو الوداعی کلمات کہہ کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ جیپ چلتے ہی میں نے آنکھیں بند کیں اور مراقبے میں خود کو آنے والے واقعات کے لیے تیار کرنے لگا۔ سارے راستے میں نے ڈرائیور سے کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اس نے مجھے۔ کالج پہنچ کر میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور اپنا بیگ سنبھالتا ہوا کالج کے مشرقی دروازے سے ہال میں داخل ہوا تو دروازے کے پاس ایک بڑی سی میز کے پیچھے وہی آدمی بیٹھا تھا جس نے مجھے دو ہفتے قبل داخلے میں مدد دی تھی۔ اس کے سامنے میز پر کئی لفافے پڑے تھے اور ہر لفافے پر ایک نام کے ساتھ ایک نمبر لکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور آنکھوں سے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میرے جانے پر اس نے اپنے سامنے والے لفافوں سے میرے نام کا لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے میز نمبر سات پر جانے کو کہا۔ میں نے ہال میں نظریں دوڑائیں تو مجھے وہاں دس بارہ گول میز نظر آئیں۔ ہر میز پر جلی حروف میں ایک نمبر لکھا ہوا تھا اور میزوں کے گرد چھ چھ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ایک ہاتھ میں اپنا بیگ اور دوسرے میں لفافہ سنبھالتے ہوئے میز نمبر سات کی طرف بڑھا۔ اس میز پر تین طلباء مجھ سے پہلے بیٹھے تھے۔ میں بیگ کو ایک خالی کرسی کے پاس رکھتے ہوئے کرسی پر بیٹھا اور لفافہ اپنے سامنے میز پر رکھ کر آس پاس کے لوگوں پر نظریں دوڑائیں۔ ہال میں موجود لڑکوں میں میرے علاوہ کسی نے کرتا پاجامہ نہیں پہنا تھا۔ بہت سوں نے جین کی پتلون اور قمیص پہنی تھی اور باقیوں نے سوٹ پہنے تھے۔ بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ ایک مرد یا عورت ضرور تھی جو شاید انہیں یہاں پر چھوڑنے آئے تھے۔ میری میز پر بیٹھے ہوئے لڑکوں نے اپنے لفافے کھولے ہوئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے اپنا لفافہ کھولا۔ لفافے میں ایک بٹوہ تھا، بٹوے میں میری تصویر والا کالج کا کارڈ تھا۔ کارڈ میں ٹائی کے ساتھ تازہ تازہ کٹے ہوئے بالوں والی میری مسکراتی تصویر دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تصویر کسی دیہاتی کی ہے۔ اگر تصویر اترواتے ہوئے جینا میرے ساتھ نہ ہوتی تو یہ تصویر میرے دیہاتی ہونے کا سارے کالج میں ڈھنڈورہ پیٹتی۔ دیہاتی ہونا کوئی گالی نہیں ہے، میں یہاں پر صرف جینا کی موجودگی اور غیر موجودگی میں کھنچوائی جانے والی تصویر کا موازنہ کر رہا ہوں۔

اس کے علاوہ لفافے میں ایک چابی تھی جس پر 3C کندہ تھا۔ ساتھ ہی کچھ اور کاغذات بھی اس لفافے میں تھے۔ میں کاغذات کھول کر پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اپنے دائیں طرف کرسی پر بیٹھے ہوئے لڑکے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ہیلو، میرا نام امر ہے۔ میں نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا، میرا نام رامو ہے۔ کالے سوٹ پر نیلی ٹائی پہنے ہوئے، کھلتے ہوئی رنگت پر لمبی ناک اور گھنی بھوؤں والا یہ لڑکا مجھے بھلا لگا تھا۔ میں شملہ سے آیا ہوں۔ اس نے اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک درمیانہ عمر تپلی سی عورت جس نے کالے رنگ کی بنارسی سلکی ساڑھی پہنی تھی، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ میری ممی ہیں جو مجھے یہاں پر چھوڑنے آئی ہیں۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر امر کی ممی کو نمستے کہا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا، تمہیں گھر سے چھوڑنے کے لیے کوئی نہیں آیا؟ ہم لوگ اسی علاقے میں رہتے ہیں اسی لیے۔۔۔۔

میں آگے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ میری نظر اپنی طرف بڑھتے ہوئے چاچو پر پڑی۔ چاچو نے آج پتلون قمیص پہنی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے ہمارے قریب آئے تو میں نے امر سے انکا تعارف کراتے ہوئے کہا، یہ میرے چاچو ہیں۔ امر نے مسکراتے ہوئے چاچو سے ہاتھ ملایا اور امر کی امی نے آداب کہا۔ ہم سے تعارف کروانے کے بعد انہوں نے میز پر بیٹھے باقی پانچ لڑکوں سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ آج کے دن ہمارے رہنما ہوں گے۔ انہوں نے گھر والوں سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو اب جا سکتے ہیں۔ آپ کے بچوں کی باقی ذمہ داری ہم پر ہے۔ اس پر طلباء کو چھوڑنے کے لیے آنے والوں نے اپنے اپنوں کو الوادعی کلمات کہنے کے بعد جانا شروع کیا اور امر کی ماں نے جانے سے پہلے مجھے کہا، تم ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ میں نے اقرار میں سر ہلایا تو وہ دروازے کی طرف بڑھیں۔ ساتھ ہی چاچو نے ہمیں اپنے اپنے لفافوں سے چابی نکالنے کو کہتے ہوئے بتایا، یہ تمہارے کمرے کی چابی ہے۔ ہر چابی پر کمرے کا نمبر کندہ ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا کہتے ہوئے کہا، میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تمام کے پاس سامان ہے، اس لیے سب سے پہلے ہم آپ کے کمروں میں جائیں گے جہاں آپ اپنا اپنا سامان رکھ کر ہلکے ہو جائیں۔ اس کے بعد ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔ ہم ان کے پیچھے چلتے ہوئے اپنے اپنے کمروں تک پہنچے۔ وہ باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر کہنے لگے، تم لوگوں کے پاس پندرہ منٹ ہیں۔ ان پندرہ منٹوں میں تم اپنے کمروں میں موجود سامان کا جائزہ لے کر باہر آؤ لیکن واپسی پر اپنا لفافہ ساتھ لانا نہ بھولنا۔ میں نے اپنے کمرے کا تالا کھولتے ہوئے دیکھا کہ چاچو کے ساتھ آنے والے ہم پانچوں کے کمرے ایک ساتھ تھے۔ امر کا کمرہ میرے کمرے کے بالکل سامنے تھا۔

کمرے میں موجود تمام آسائشیں کسی بڑے ہوٹل سے کسی طور کم نہیں تھیں۔ ہر کمرے کا اپنا غسل خانہ تھا، کپڑے ٹانگنے کی ایک بڑی الماری، ایک بستر، دو کرسیاں، دو ٹیبل لیمپس جن میں ایک لیمپ بستر کے پاس اور دوسرا میز پر پڑا تھا۔ بستر کے پیچھے ایک بڑی کھڑکی تھی جس پر پردے ٹنگے تھے۔ میں نے پردہ ہٹا کر دوسری طرف دیکھا تو خوبصورت پاہیرالہ جھیل کا منظر دیدنی تھا۔ مجھے بستر کے پاس

بڑا بڑا سا سوٹ کیس نظر آیا جس پر میرے نام کا ایک لفافہ ٹیپ لگا کر چپکایا گیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس سے لفافہ کھولا تو اس میں ایک خط تھا۔ ایک چابی اور سو سو برطانوی پونڈ کے تین نوٹ تھے۔ یہ خط ٹام کی طرف سے تھا جس میں لکھا تھا:

یہ چابی تمہارے سوٹ کیس کی ہے۔ اس سوٹ کیس میں تمہارے لیے کپڑے اور جوتے ہیں۔ یہ کپڑے اور جوتے جینا نے تمہارے لیے پسند کیے ہیں۔ میں نے زیادہ کپڑے اس لیے بھی نہیں بنوائے کہ ابھی تمہارے بڑھنے کی عمر ہے کپڑے جلدی چھوٹے ہو جائیں گے۔ تم حسبِ ضرورت کالج کے درزی کو ناپ دے کر اپنی پسند کے مزید سوٹ سلواتے رہنا۔ تمہاری روزانہ کی ضرورت کے لیے تین سو پونڈ ہیں۔ کالج کے بنک میں اپنا اکاؤنٹ کھلوا کر مجھے اکاؤنٹ نمبر لکھنا تاکہ میں وقتاً فوقتاً تمہارے لیے کچھ رقم اس اکاؤنٹ میں جمع کرواتا رہوں۔ اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو رچرڈ سے کہنا۔ مجھے کبھی کبھار خط لکھ کر اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے آگاہ کرتے رہنا۔ ڈانا، جینا اور مائیکل کی طرف سے نیک تمنائیں۔ تمہاری کامیابی کا متمنی۔ ٹام

رقم جیب میں ڈال کر میں نے چابی سے سوٹ کیس کا تالا کھولا تو اس میں دو کوٹ پتلون والے سوٹس، دو ٹائیاں، جرابیں، انڈرویئر، جین کی پتلونیں، تین جوڑے سونے والے کپڑے، دو بیلٹ، چھ قمیصیں، دو جوڑے بوٹ اور ایک جوڑا بغیر ایڑی کے چست جوتوں کا تھا۔ میں نے سب کچھ اسی سوٹ کیس میں ہی رہنے دیا۔ پندرہ منٹ پورے ہونے والے تھے اس لیے میں کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر جیسے میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ میرے آتے ہی چاچو ہم سب کو لے کر کھانے کے ہال میں لے جا کر کہنے لگے، ہال کی دائیں طرف سبزی خوروں کے لیے ہے اور بائیں جانب گوشت خوروں کے لیے۔ ہال لڑکوں سے خاصا بھرا ہوا تھا۔ گوشت والی لائن لمبی تھی جبکہ سبزی والی چھوٹی تھی۔ میرے ساتھ والے پانچوں طلباء گوشت والی ڈشوں کی جانب بڑھے تو میں جان بوجھ کر آہستہ سے چلتا ہوا سب کے پیچھے گوشت خوروں کے کھانے کی طرف بڑھا اور ان کے کھانا لینے کے انداز پر توجہ دیتا تھا۔ سب لڑکے میز پر لگی ہوئی خالی پلیٹوں سے ایک خالی پلیٹ لے کر کھانے کی پانچ چھ ڈشوں سے اپنی اپنی پسند کی ڈش حسبِ ضرورت اپنی پلیٹ میں ڈال کر ہال کے درمیان بچھی ہوئی میزوں اور کرسیوں پر بیٹھتے اور میزوں پر رکھے ہوئے چمچے کانٹے اور چھریاں اٹھا کر کھانا شروع کرتے۔ پانی کا ایک جگ بھی گلاسوں کے ساتھ ہر میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے سب کی نقل کرتے ہوئے اپنے لیے کچھ کھانا پلیٹ میں ڈالا اور میز پر سب سے الگ تھلگ چپ چاپ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ میرے علاوہ کچھ لوگوں نے کھانے کے بعد میٹھا بھی لیا۔ کھانے کے بعد ہم پانچوں لڑکے چاچو کی معیت میں ایک چھوٹے سے کمرے میں گئے۔ جہاں چاچو نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھ کر اپنے لفافے سے کالج کا ID Card نکالنے کو کہا۔ پھر اس کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، اس کارڈ کو اپنی جان سے عزیز رکھنا۔ یہ کارڈ اس کالج میں تمہاری پہچان ہوگا۔ اس کارڈ کے بغیر کہیں نہ جانا۔ کالج کے ہر سٹور سے بغیر کارڈ کے کچھ نہیں ملے گا۔ کارڈ گم ہونے کی صورت میں اس کی رپورٹ کالج کے دفتر میں درج کروائیں اور اگر کسی کا گمشدہ کارڈ مل جائے تو دفتر میں جمع کرائیں۔

پھر بولے، کلاسیں شروع ہونے میں ابھی تین دن باقی ہیں۔ ان تین دنوں میں کالج کی یونیفارم شاپ سے یہ کارڈ دکھا کر اپنی یونیفارم لیں۔ اپنے کپڑے روزانہ تبدیل کریں اور لانڈری یا ڈرائی کلیننگ کے لیے کپڑے وقت پر دینا اور وہاں سے لے آنا تمہاری روزمرہ کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ پھر انہوں نے ہمیں لفافے میں رکھے ہوئے دوسرے کاغذات میں سے پیلے رنگ کا کاغذ نکالنے کا کہہ کر بولے، اس کاغذ پر تمہارے کورس کی کتابوں کی فہرست درج ہے اور ساتھ ہی ہر کورس کے لیے دوسری ضروریات درج ہیں۔ کتابوں کی دکان سے اپنے لیے کتابیں لیں اور سٹیشنری کی دکان سے اپنے استعمال کے لیے پین، کاغذ، کاپیاں اور باقی جو کچھ اس پرچے پر لکھا ہے لیں۔

پھر بولے، ہاسٹل کے ہر ونگ کا ایک وراڈن ہے۔ کالج کی حدود سے باہر اپنے وارڈن کی اجازت کے بغیر نہ نکلیں۔ گیارہ بجے رات کے بعد اپنے کمرے سے بغیر کسی ایمرجنسی حالت کے نہ نکلیں۔ کالج کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے طلباء کو کالج سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ تقریباً دو گھنٹوں تک مسلسل مختلف ہدایات دینے کے بعد بولے، کسی نے اور کوئی سوال تو نہیں پوچھنا؟ ہم سب خاموش رہے تو وہ بولے، اب آپ لوگ اپنے اپنے کمروں میں جائیں اور باقی دو دنوں میں کلاسیں شروع ہونے کی تیاری کریں۔

سب لوگ اٹھ کر جانے لگے تو چاچو نے مجھے روک کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوے سے کچھ نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا، رامو بیٹے یہ پیسے جیب خرچ کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہیں سکول کا سامان خریدنے کے لیے ضرورت ہوگی۔ میں نے روپے واپس کرتے ہوئے کہا، میرے پاس ابھی کافی پیسے ہیں۔ جب نہیں ہونگے تو آپ سے کہہ دونگا۔ انہوں نے روپے واپس رکھ لئے اور کہا، اچھا اب میں چلتا ہوں مجھے اور طلباء کو یہاں لے کر آنا ہے۔ ان سے جدا ہو کر میں اپنے کمرے کی طرف چلا۔

کالج آنے کے بعد سے اب تک کا دن میں جین اور سوٹ پہنے ہوئے لڑکوں کا بغور مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ میرے آج کے مشاہدے کے مطابق شلوار، کرتا، پاجامہ اور دھوتی وغیرہ ڈھیلا ڈھالا اور سست لباس ہے۔ اس لباس کے ساتھ ہوائی چپل، ملکیشن یا کھوسہ اچھا لگتا ہے۔ اس لباس میں انسان چلنا، اٹھنا اور بیٹھنا بھی سستی سے ہے۔ جین ایک چست لباس ہے اور اس کے استھ بغیر ایڑی والے چست جوتے پہنے جاتے ہیں اور چست انداز میں چلا اور بیٹھا جاتا ہے۔ سوٹ ٹھہرا ہوا یا اکڑا ہوا لباس ہے۔ اس کو پہننے والوں کی چال میں متانت ہوتی ہے۔ اس کو پہننے والا سنبھل کر بیٹھتا ہے اور اس کی بول چال میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ سوٹ پہننے کے لیے جوتے جرابیں، بیلٹ اور ٹائی تک کا ایک دوسرے سے مماثل

ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جین پہننے کے لیے ستھرے یا میلے جوتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ سوٹ پہننے کے لیے چمکدار جوتے ہونا لازمی ہیں۔

اپنے مشاہدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے سب سے پہلے سوٹ کیس سے جین کی پتلون، ایک قمیص ایک انڈر وئیر اور بغیر ایڑی کے چست جوتے پہنے۔ پتلون کی پچھلی جیب میں کالج والوں کا دیا ہوا بٹوہ ڈالا۔ کچھ دیر خود کو آئینے کے سامنے ہر زاویے سے چلتا، ٹھہرتا اور بولتا ہوا دیکھتا اور سنتا رہا۔ پھر دھڑکتے دل سے کمرے کی چابی لے کر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر پہلے بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے میں واپس آیا، کالج والا لفافہ اٹھایا۔ ایک سو پونڈ کا نوٹ اپنے بٹوے میں رکھا اور بازار کی طرف چل پڑا۔ سب سے پہلے کتابوں کی دکان پر گیا، وہاں پر اپنا کارڈ دکھا کر کورس کی کتابیں لیں۔ پھر سٹیشنری کی دکان سے لسٹ میں لکھا ہوا سامان لے کر انہیں سو پونڈ کا نوٹ دیا تو انہوں نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا کہ ان کے پاس اس کا بھان نہیں تھا۔ لیکن میرا نام ایک رجسٹر پر لکھ کر انہوں نے سامان مجھے دیتے ہوئے کہا میں کل بنک کھلنے پر بھان لے کر ان کو پیسے ادا کر دوں۔ اس کے بعد میں یونیفارم شاپ پر گیا۔ وہاں بھی انہوں نے میرا کارڈ دیکھ کر دو ہینگر میرے حوالے کیے۔

سکول کی گرمیوں کی یونیفارم سفید پتلون اور نیلی قمیص تھی جبکہ سردیوں میں لال بلیزر کا کوٹ، لال ٹائی اور کالی پتلون تھی۔ یہ سب کچھ لے کر میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ سامان لے کر اپنے کمرے میں ابھی آیا ہی تھا کہ کسی نے دروازہ بجایا۔ میں نے کھولا تو دروازے پر امر تھا۔ کہنے لگا، میں نے اپنے کمرے میں چائے بنائی ہے اگر تمہیں بھی میری طرح چائے پینے کی عادت ہے تو آ جاؤ۔ ہاں چلو، میں امر کے کمرے میں آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس نے اپنے تمام کپڑے ہینگروں پر ٹانگ کر الماری میں لٹکائے ہوئے تھے۔ اگر میں یہاں نہ آیا ہوتا تو میرے کپڑے ایسے ہی پڑے رہتے۔ دراصل گھڑوں میں کپڑے رکھنے والے کے لیے ہینگر سے کپڑے ٹانگنا بالکل نیا خیال تھا۔ اب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے اپنی بڑھوتی کے لیے دوسروں سے تعلقات اور روابط رکھنے ہوں گے۔ اگر میں اس کالج میں بھی ہائی سکول کی طرح اپنے خول میں رہا تو میں اپنے ماحول سے کچھ نہیں سیکھ سکوں گا۔ یہ سوچ کر میں نے امر سے تعلقات آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس کے قریب کرسی پر بیٹھا تو امر نے پوچھا کہ میں چائے میں کتنی کھانڈ پیتا ہوں۔ میں نے کہا، تمہارے جتنی۔ وہ ہنس کر کہنے لگا، تمہیں کیسے پتہ ہے کہ میں کتنے چمچ کھانڈ پیتا ہوں؟ میں نے کہا، جب تم اپنے کپ میں کھانڈ ڈالو گے تو مجھے پتہ چل جائے گا۔ اس نے ہم دونوں کے لیے ایک چمچ کھانڈ ڈال کر ایک کپ میرے سامنے رکھا اور ایک اپنے سامنے رکھتے ہوئے بیٹھا تو میں نے کہا، مجھے تمہاری ممی اچھی لگتی ہیں۔ کہنے لگا، تم بھی انہیں اچھے لگے ہو۔ جب تم ہماری میز پر آئے تو ممی نے تمہیں دیکھ کر کہا تھا، یہ لڑکا بڑا سادہ سا ہے۔ بھگوان کرے اس لڑکے کا کمرہ تمہارے قریب ہو۔ اگر ہو سکے تو اس سے دوستی کر لینا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے اپنی ماں کے کہنے پر دوست بنانا چاہ رہے ہو، میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا؟ کہنے لگا، یہ بات نہیں، دراصل میں یہاں پر بالکل نیا ہوں اور اپنے گھر سے بھی پہلی بار اتنی دور اکیلا آیا ہوں اور پورے کالج میں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ چلو میرا بھی یہی حال ہے۔ آج سے ہم اکیلے نہیں دو ہیں، میں نے کہا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں ابھی بازار سے کیا کچھ لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا، مجھے بھی بازار جانا ہے۔ کیا تم میرے ساتھ ایک بار پھر بازار جانا پسند کرو گے؟ میں نے جواب دیا، کیوں نہیں، ابھی چائے پی کر چلتے ہیں۔

چائے کے بعد ہم دونوں اٹھ کر ایک بار پھر بازار گئے اس نے وہ تمام سامان لیا جو میں پہلے لے کر آیا تھا۔ میں نے ایک دکان سے ہینگر لئے، یہاں بھی وہی ہوا، دُکاندار کے پاس سو پونڈ کا بھان نہیں تھا۔ امر نے میرے بدلے قیمت دینے کی کوشش کی تو میں نے روک دیا۔ دُکاندار نے میرا نام لکھ کر مجھے ایک درجن ہینگر دے دئے۔ ہم واپس پہلے امر کے کمرے میں گئے جہاں اس نے اپنا سامان ایک سلیقے سے رکھا۔ اس کی سلیقہ مندی دیکھ کر مجھے اپنے کمرے میں جا کر سب کچھ سلیقے سے رکھنے کی تحریک ہوئی تو میں نے امر سے کہا، میرا سامان ابھی تک کمرے میں بکھرا پڑا ہے میں جا کر اس کو ٹھیک سے رکھ آؤں۔ کہنے لگا چلو میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔ یہ مدد میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ میرے کمرے میں آ کر امر نے ہی میرا سارا کام کیا۔ میں تو بس کپڑے اسے اٹھا اٹھا کر دیتا جاتا اور وہ رکھتا جاتا۔ اس نے میرے سوٹ، جین کی پتلونیں، شرٹس، کرتے پاجامے الماری میں ہینگروں پر لٹکا کر رکھے۔ پھر اس نے ایک دراز میں میرے انڈر ویئر اور جرابیں اور دوسرے میں میرے سونے کے کپڑے رکھے۔ پھر خالی بیگ کو سوٹ کیس میں رکھ کر سوٹ کیس کو الماری کے ایک کونے میں ایسے رکھا کہ مجھے اس کی سلیقہ مندی کا قائل ہونا پڑا۔ مجھے اعتراف ہے کہ امر کی مدد کے بنا میں اپنے کمرے کا اتنا عمدہ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر امر گھڑی پر وقت دیکھ کر کہنے لگا، کھانے کا وقت ہے۔ چلو کھانا کھا کر آتے ہیں۔

کھانے کے دوران امر مجھے اپنے بارے میں بتاتا رہا اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ میری ساری توجہ اس کے کھانے کے آداب پر جمی تھی اور میں اس دوران اس کی نقل کرتا رہا۔ امر چھوٹا سا نوالہ منہ میں ڈال کر آہستہ سے اسے اپنے بند منہ میں چباتا تھا۔ کھانے کے دوران کبھی کبھار پانی کے ایک یا دو گھونٹ پی لیتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم اپنے کمروں کی طرف چل پڑے۔ امر ایک بھولا بھالا سا لڑکا تھا۔ اسے اپنے امیر ہونے پر بھی کوئی مان نہیں تھا۔ اس نے ایک بار بھی میرے بارے میں پوچھنے یا کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی میں نے اپنے بارے میں اسے کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ہم اس بار اپنے اپنے کمروں میں گئے تھے۔ اندھیرا چھا گیا تھا میں نے جین اتاری اور زندگی میں پہلی بار سونے کے کپڑے پہن کر بستر پر لیٹا۔ مجھے یہ سوچ کر ایک قسم کا سکون محسوس ہوا کہ میں نے اپنی کسی حرکت سے لوگوں

کی توجہ اپنی جانب مبذول کئے بغیر پہلے دن کامیابی سے پتلون پہنی تھی۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ اتنے اونچے اور بڑے لوگوں کی بھیڑ میں ایک معمولی سپیرا کہاں اور کیسے فٹ ہوگا؟ لیکن پھر سوچا کہ وقت یہ سب کچھ مجھے دے رہا ہے اور میں اسے لینے میں بخل سے کام نہیں لوں گا۔ یہ سب کچھ سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی۔ عادت کے مطابق میری آنکھ صبح جلدی کھل گئی۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا، الماری سے ایک سوٹ نکال کر پہنا، ٹائی لگائی بوٹ پہنے اور ایک بار پھر خود کو آئینے کے سامنے ہر زاویے سے چلتا، ٹھہرتا، بولتا، دیکھتا اور سنتا رہا۔ میرا سب سے زیادہ وقت ٹائی کی گرہ لگانے میں لگا تھا۔ سوٹ پہن کر کمرے سے نکل کر امر کا دروازہ کھٹکھٹا کر ناشتے پر جانے کے لیے پوچھا، اس نے برش سے دانت صاف کرتے ہوئے دروازہ کھول کر مجھے کہا، تم بیٹھو میں تیار ہولوں پھر جاتے ہیں۔ اس کو دانت صاف کرتے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ کلی کر کے دانتوں کو صاف کرنے سے برش سے صاف کرنا کافی بہتر ہے۔ یہ سوچ کر میں نے بھی دانت صاف کرنے کا سامان خریدنے کا فیصلہ کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد ہم بازار گئے۔ میں نے سب سے پہلے بنک جا کر تین سو پونڈ جمع کروا کر اپنا اکاؤنٹ کھلوایا۔ وہاں سے میں نے کچھ کیش لیا۔ کیش لے کر کل والی دکانوں پر جا کر ان کا بل ادا کیا۔ وہاں سے ہی میں نے اپنے لئے دانت صاف کرنے کا برش اور ٹوتھ پیسٹ لی۔ پھر ہم لوگ ڈاک خانے گئے جہاں سے میں نے انگلینڈ کے لیے کچھ لفافے لئے اور امر نے اندرون ملک کے لیے لفافے لئے۔ پھر ہم لوگ اپنی کلاسوں کے کمرے دیکھ آئے۔ آج کا سارا دن میں نے کامیابی سے سوٹ میں گزارا۔ کمرے میں آ کر ٹام کو خط لکھنے بیٹھا تو اپنی لکھنے کی کمزوری کا احساس ہوا۔ میں نے جیسے تیسے چند سطور میں انہیں شکریے کے ساتھ اپنا اکاؤنٹ نمبر بھیجا۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی کلاس میں گئے۔ ہر کلاس میں بیس طلباء کے لیے تکیے دار، گدّے والی کرسیاں تھیں اور ان کے آگے میز رکھے تھے۔ ہر میز پر کورس کی کتابیں رکھی تھیں۔ میز کی دراز میں کاغذ، پین اور باقی ضروریات کا سامان تھا۔ دو دن بعد میں ایک دن کے لیے بچی خلی گیا۔ باپو کو مختصر انداز میں اپنے ہفتے کی روداد سنائی۔ اکیلا کمرہ ہونے کی وجہ سے کالی کو لے جانا بھی میرے لیے آسان ہو گیا تھا۔ کالی کے لیے میں نے اپنے ہاسٹل کے کمرے کی الماری میں رکھے ہوئے بیگ میں جگہ سوچ چکی تھی۔ دوسرے روز کالی کو اپنے بیگ میں لے کر میں ہاسٹل پہنچا۔ کورس کی ساری کتابیں انگریزی زبان میں تھیں۔ پہلے دن کی کلاسیں پڑھنے کے بعد مجھ پر چند باتیں واضح ہو گئی تھیں۔ میں انگریزی دیسی زبان میں بولتا تھا جبکہ میرے کلاس میٹس خاصی شستہ اور برطانوی لہجے میں بات کرتے تھے۔ میری انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی رفتار کسی بیل گاڑی کی سی تھی جبکہ باقی لڑکوں کی رفتار کسی موٹر کی سی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس ماحول میں پنپنے کے لیے مجھے اپنی ساری توجہ اس کمزوری کی طرف مبذول کرنا ہوگی۔

میں نے اپنے دن کو کچھ اس طرح سرف کرنا شروع کر دیا کہ صبح اٹھ کر ناشتے کے بعد سکول جاتا، چوتھے پریڈ کے بعد دوپہر کا کھانا کھاتا، دو بجے آخری پریڈ کے بعد سکول سے واپس اپنے کمرے میں یونیفارم اتار کر جین پہنتا۔ امر کے ساتھ اس کے کمرے میں کچھ دیر گپ شپ کے دوران چائے پیتا۔ پھر دھونے اور ڈرائی کلیننگ کے کپڑے جمع کر کے ڈرائی کلینرز کو دے کر وہاں سے صاف شدہ کپڑے لے کر لائبریری جاتا۔ وہاں بیٹھ کر سب سے پہلے ہوم ورک کرتا۔ اس کے بعد میں روزانہ ایک انگریزی اخبار کا اداریہ پڑھتا پھر اس کو اپنے الفاظ میں لکھتا۔ اس کے بعد لائبریری سے ہی اپنی پسند کی کوئی کتاب کم از کم ایک گھنٹہ پڑھتا۔ کتاب میں پڑھے ہوئے انگریزی کے نئے الفاظ کو ایک کاپی میں درج کرتا۔ ان کے مطالب لغت میں دیکھتا۔ اپنے مطالعے کا دو صفحات پر مشتمل ایک خلاصہ لکھتا جس میں نئے پڑھے ہوئے الفاظ کا استعمال کرتا۔ تقریباً آٹھ بجے لائبریری سے اٹھ کر شام کا کھانا امر کے ساتھ کھاتا۔ پھر امر کے ساتھ کچھ دیر کے لیے باتیں کرتا، اپنے کمرے میں جا کر نہاتا۔ کچھ دیر کالی کے ساتھ کھیلتا پھر کالی کو بیگ میں واپس رکھ کر سو جاتا۔ جب کبھی ذہنی تھکان محسوس کرتا تو اپنی بین لے کر جھیل کنارے چلا جاتا اور کچھ دیر تک اکیلے میں بجاتا رہتا۔

ابتدا میں میری انگریزی پڑھنے کی رفتار دو تین صفحات فی گھنٹہ اور لکھنے کی رفتار آدھا صفحہ فی گھنٹہ تھی۔ آٹھ دس ماہ کے اندر اندر میرے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی رفتار دس گنا ہو گئی۔ انگریزی بولنے کے لیے میں نے امر کا سہارا لیا تھا۔ امر کی پیدائش لندن میں ہوئی تھی اور اس نے اپنی زندگی کے پہلے بارہ سال بھی وہاں پر گزارے تھے اس لیے وہ کسی اہلِ زبان کی طرح انگریزی بولتا تھا۔ میرے کہنے پر ہم دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف انگریزی زبان میں گفتگو کرنے لگے بلکہ وہ میرا انگریزی لہجہ بھی ٹوک ٹوک کر درست کرتا تھا۔ نو دس ماہ کے اندر اندر میری انگریزی لکھنے، بولنے اور پڑھنے کا معیار میرے باقی کلاس فیلوز کے برابر ہو گیا تھا۔ مجھے کلاس میں لڑکوں کے سامنے انگریزی بولتے وقت اپنے لہجے میں دیسی پن کا وہ احساس نہیں ہوتا تھا جو سال کے شروع میں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے نہیں بلکہ ہمارے انگریزی کے استاد مسٹر ولبرٹ نے محسوس کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا۔

ٹام اور جینا نے بھی میرے خطوط سے میری انگریزی زبان کے ارتقاء کو محسوس کرتے ہوئے میری لکھائی کو اپنے خط میں سراہا تھا۔ میں شاید یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جینا نے مجھے وہ تمام تصاویر جو اس نے میرے اور کالی کے ساتھ اتروائی تھیں بھجوائی تھیں۔ میں ہر ہفتے ٹام اور جینا کو بڑی باقاعدگی سے علیحدہ علیحدہ خط لکھا کرتا تھا۔ ابتداء میں ایک بات لکھنے کے لیے دس بار سوچنا پڑتا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک بات کو دس طریقوں سے لکھنے پر قادر ہو گیا تھا۔ میرے ابتدائی خطوط چند سطروں پر مشتمل ہوتے تھے جو بڑھتے بڑھتے دو صفحات تک جا پہنچے۔ یہ خطوط لکھنے میں مجھے پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ ٹام باقاعدگی سے میرے بنک اکاؤنٹ میں رقم جمع کراتا رہتا تھا۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ وہ کتنی رقم ماہانہ میرے اکاؤنٹ میں جمع کرتا تھا اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے

باقی صفحہ ۸۸ پر ملاحظہ کیجیے

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ ساؤتھ امریکہ)

پروین شیر (نیویارک)

قسط......۴

دھنک راستے

کیرولینا اب سیاحوں کو لے کر کوری کانچا (Qorikancha) کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بتا رہی تھی کوری کانچا ایک کیچوا لفظ ہے جس کے معنی سونے کے محل کے ہیں۔ یہ انکا سلطنت کا سب سے اہم محل تھا۔ یہاں کئی عبادت گاہیں تھیں۔ دھنک ان کے لیے ایک Symbole تھی۔ ایک برج کا۔۔۔ کہا جاتا ہے یہ انہیں ان رشتہ داروں سے ملاقات بھی کراتا تھا جو دنیا سے جا چکے تھے۔ دوسرے جہاں میں۔ یہاں دھنک کا Temple بھی تھا جسے کے دریچے آسمان کی طرف کھلتے تھے جہاں سے قوسِ قزح نظر آتی تھی۔ یہ عقیدہ سن کر پروین چونک اٹھی تھی۔۔۔ کتنا خوبصورت خیال تھا۔ وہ دریچوں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ صدیوں پہلے انکاز بھی وہاں کھڑے ہو کر دھنک کی پگ ڈنڈی کو دیکھا کرتے تھے۔ خیالوں میں اس پر چل کر اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔

یہ خوبصورت رنگین راستہ خدا نے ان کے لیے اسی مقصد سے بنایا تھا جو کبھی کبھی نمایاں ہو کر انہیں یہ خوشی عطا کرتا تھا۔ پروین دیر تک چھوٹے سے دریچے سے چھوٹا سا آسمان دیکھ رہی تھی۔ سوچ کے ان گنت دروازے وا ہو رہے تھے۔ تخلیقیت کے جراثیم سر اٹھانے لگے تھے۔ جو اس کے قلم سے یوں باہر نکلے تھے۔

پُل

بے کراں نیلگوں آسماں کے سمندر پہ
اک پُل ہویدا ہوا!
رنگ اوڑھے ہوئے
دو جہانوں کے دونوں سرے تھام کر
اک مسیحا بنا
جگمگاتا ہوا، یہ دھنک راستہ
فاصلوں کو مٹاتا ہے
اور
یہ ملاتا ہے
بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے انہیں
جا کے جو بس گئے ہیں
کسی اور دنیائے معدوم میں۔۔۔!

کوری کانچا کی یہ عبادت گاہ ان کے سورج خدا کے خادم کی تھی۔ یعنی چھوٹے خدا کی۔ دیواروں میں طاقچے بنے ہوئے ہیں جن پر عبادت میں کام آنے والی مقدس اشیاء رکھی جاتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے Altar ہیں جو قربانی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ دھنک کی عبادت گاہ سے ملحق صاعقہ (Thunder) نام کے خدا کی عبادت گاہ ہے۔ یعنی Illapa کی۔ کیرولینا کے مطابق وہاں سنہرے کپڑوں کے پردے لگائے جاتے تھے۔ کچھ دور پرونیس کی عبادت گاہ ہے۔۔۔ Venus۔۔۔ جو شام کا پہلا ستارہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کا چھوٹا خدا تھا۔ دیواروں میں سوراخ بنے ہوئے ہیں جن سے وہ ستارے کو دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے خدا۔۔۔ چاند کی عبادت گاہ ہے۔۔۔ چاند جو سورج خدا کی بہن اور بیوی تھا۔ کچھ ہی آگے جا کر ایک نیم دائرہ نما دیوار ہے جس کا نام Solar Dram تھا۔ یہ انکاز کی ذہانت اور کاریگری کا شاہکار ہے۔ اس دیوار کے پتھر اس طرح ایک دوسرے میں فٹ ہیں بغیر سیمنٹ کے کہ زلزلہ بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ اس میں کئی روشن دان ہیں جن سے سورج کی کرنیں روشنی سے غسل کرانے آتی تھیں۔ دیواروں پر سنہرے ریشم کی کشیدہ کاری کے کپڑے لگے ہوئے ہیں۔ چھت پر بھی ان کے اہم جانور الپاکا کے فر کے بنے ہوئے کپڑے لگائے جاتے تھے۔

کوری کانچا پوری طرح انکاز سلطنت کا مذہبی مرکز تھا۔ وہ سورج کی عبادت اس لیے کرتے تھے کہ وہ روشنی عطا کرتا ہے۔ چاند ان کی کاشت کاری کا رہبر تھا۔ زمین اپنی کوکھ سے غذا مہیا کرتی تھی۔۔۔ قدرت کی ہر طاقت ان لوگوں کا خدا تھی۔ کیرولینا کہہ رہی تھی۔۔۔ یہاں کی زمین اور دیواروں پر پہلے سونے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ کورٹ یارڈ (صحن) میں سونے کے مجسمے تھے جسے سورج کی عبادت گاہ کہتے تھے کیونکہ یہ سورج دیوتا کے لیے تھا اور یہاں انکاز سلطنت کے صرف خاص اور اہم لوگ آیا کرتے تھے جنہیں یہاں بیٹھنے کی اجازت تھی۔ اسپین نے یہاں کے سارے سونے Ransom میں لے لیے تھے ان کے بادشاہ کی رہائی کے عوض میں۔

یہ کھنڈرات پروین کے لیے وقت کی سرنگ تھے جو اُسے کسی انوکھی دنیا میں لے گئے تھے۔۔۔ ان گنت اونچی نیچی سیڑھیاں طے کر کے سیاحوں کا گروپ واپس بس میں آ گیا تھا۔ بس ہوٹل کی طرف جا رہی تھی۔۔۔

صدیوں پرے

کوسکو میں تیسری صبح انگڑائیاں لے کر جاگ گئی تھی۔ ٹور بس کو آج سیاحوں کو لے کر سارا دن چلنا تھا۔ صوبہ اوروبامبا (Urubamba) کی طرف جو 2 ہزار سات سو میٹر سمندری سطح سے اونچا ہے۔ اُس کے گروپ کے سب سیاح خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ کیرولینا اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر۔۔۔ مائیک ہاتھوں میں لے کر مخصوص لہجے میں اپنے ملک کی قدیم اور انوکھی داستان سنانے لگی

تھی۔وہ کہہ رہی تھی۔۔۔سب سیاح حیران بچوں کی طرح نرالی کہانی سن رہے تھے۔

''انکاز (Incas) کا عقیدہ تھا کہ خواب میں خدا اور مرحوم لوگ باتیں کیا کرتے ہیں۔انکاز بھی مصری قوم کی طرح ممی (Mummies) بناتے تھے اور آج بھی ان کی نسل یہی کرتی ہے۔ان کے آباؤ اجداد اونچے پہاڑوں، سورج، چاند، ستارے، دھنک، زمین اور پانی کی عبادت کرتے تھے۔ان کی خاص دعائیں تھیں کہ سورج ہمیشہ جوان رہے اور چاند ہمیشہ جوان عورت۔۔۔دنیا پلٹا نہ کھائے اور ہمیشہ سکون سے رہے۔۔۔ یہ لوگ بے حد مذہبی تھے۔اپنے تراشے ہوئے بال اور ناخن حفاظت سے رکھتے تھے کہ موت کے بعد جب واپسی ہوگی تو یہ ان کے کام آئیں گے۔کیونکہ یہ تناسخ Reincarnation کے تصور پر یقین رکھتے تھے۔ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ موت دوسری دنیا میں جانے کا ایک کٹھن راستہ ہے۔یہ ایک لمبی، اندھیری سڑک ہے جس پر سیاہ کتے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے کیونکہ یہ کتا اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا ہے اور رہبری کرتا ہے۔تاریک راستے کو طے کر کے دوسری دنیا ملتی ہے جو بالکل اسی دنیا جیسی ہے۔۔۔ پھول، ہریال، درخت، برف اور پہاڑوں والی۔ان لوگوں کے Moral Code (چوری نہیں، جھوٹ نہیں، کاہلی نہیں) پر جو بھی عمل کرتا تھا وہ دوسری دنیا میں سورج خدا کی گرمی کا مستحق تھا اور جو عمل نہیں کرتا تھا اسے برفیلی زمین ملتی تھی۔بچوں کی پیدائش ہوتے ہی سر پر کپڑا باندھ دیا جاتا تھا سر کی شکل بدلنے کو۔جس سے سماجی درجے کا فرق پہچان لیا جاتا تھا۔۔۔انکاز کے لیے پانی بہت پاک شے تھی اور ہے زندگی کے لیے۔پاکیزگی کی نشانی ہے۔چودہ سال کی عمر میں بچے کو کئی رسومات سے گزرنا ہوتا تھا اور کئی امتحانات سے بھی۔پھر اسے ایک ہتھیار دیا جاتا تھا جس کے رنگ سے معاشرے میں اس کے درجے کا پتہ چلتا تھا۔لڑکیوں کی شادی سولہ سال کی عمر میں ہو جاتی تھی۔بالوں کے اسٹائل بھی معاشرے میں ان کے درجے کی نشاندہی کرتے تھے۔انسانوں کی قربانی بھی عام تھی جس میں بچے یا غلام کی قربانی دی جاتی تھی۔قربان ہونا عزت کا باعث سمجھا جاتا تھا''۔۔۔ کیرولینا نے اب کچھ دیر کے لیے وقفہ لیا تھا۔۔۔ کچھ سیاح اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ کچھ اپنے آپ میں مصروف تھے۔پروین اور کیتھی دلچسپی کے ساتھ اس کی باتوں میں محو تھیں۔

بس چل رہی تھی اور منزل ابھی دور تھی۔کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کیرولینا پھر شروع ہو گئی تھی۔۔۔کہہ رہی تھی ''انکاز ہر سال آلو اور مکئی کی فصل کٹنے پر سورج خدا کا شکر بجا لانے کے لیے جشن مناتے تھے۔ان کے پاس کوئی گاڑی نہیں تھی۔پیدل سفر کرتے تھے۔کچھ فاصلے پر آرام گاہ ہوتی تھی جہاں رات میں رک کر آرام کرتے تھے۔نہ تو زیادہ جرائم ہوتے تھے اور نہ کوئی جیل تھی۔سبھی کے پاس سب کچھ تھا۔سب سے بڑا جرم خدا کو برا کہنا تھا جس کی سزا موت تھی۔اونچے پہاڑ کی چوٹی سے ایسے مجرم کو دھکا دے کر گرا دیا جاتا تھا۔دوسرا جرم تھا کسی مرد کا کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بیہودگی۔اگر کوئی ایسا کرتا تھا تو اُسے دیوار پر ننگا لٹا کر بھوکا چھوڑ دیا جاتا تھا۔چھوٹے جرم کی سزا میں ہاتھ اور پیر کاٹ دیے جاتے تھے یا آنکھیں نکال لی جاتی تھیں۔۔۔چونکہ ان کے پاس کوئی تحریری زبان نہ تھی اس لیے پیغام پہنچانے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ پیغام بر بھیجا جاتا تھا۔ ایک لڑکا دوڑ کر جاتا تھا کچھ دور۔۔۔دوسرے لڑکے کو پیغام سناتا تھا۔پھر وہ دوسرا لڑکا کچھ دور تک دوڑتا ہوا جاتا تھا اور تیسرے لڑکے کو پیغام سنا دیتا تھا۔یوں کڑی سے کڑی زنجیر کی طرح ملتی جاتی تھی۔اس طرح سینکڑوں میل تک سینکڑوں دوڑنے والوں کے ذریعہ ایک جگہ سے دور دوسری جگہ کوئی خبر پہنچ جاتی تھی۔اس کی تربیت بچپن ہی سے دی جاتی تھی۔اس مقصد کے لیے ناہموار پہاڑوں پر ہزاروں میل لمبی ہموار سڑکیں بنائی گئیں تھیں۔12ویں صدی میں انکاز کی سلطنت کوسکو میں تھی لیکن 1572 میں اسپین نے ان کی سلطنت ختم کر دی تھی۔

اب کیرولینا بول بول کر تھک چکی تھی۔وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کچھ پڑھنے میں مشغول تھی۔کچھ سیاحوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔پروین کی آنکھیں نیلے آسمان اور سبز زمین میں کھوئی ہوئی تھیں۔بس تیزی سے اوروبامبا کی طرف بھاگ رہی تھی۔ پہاڑوں پر تنگ کچی اوبڑ کھابڑ سڑکوں پر۔۔۔کبھی جنگلوں کے اندر۔۔۔بادل نیچے وادیوں میں تیر رہے تھے۔

لاما اور الپا کا کی دنیا

سیاحوں کی ٹور بس پہاڑوں کے اوپر ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچ کر رک گئی تھی جس کا نام کاکاکولو (Caccaccollo) ہے۔اس گاؤں میں صرف ایک سو بیس خاندان رہتے ہیں۔کچی زمین پر بسا ہوا یہ گاؤں پروین کو ایک بار پھر اپنے وطن لے گیا تھا۔۔۔کچی گلیاں، بدرنگ مکانات کچھ پہاڑوں کی اونچائی پر تو کچھ ڈھلوانوں پر پھیلے ہوئے۔یہاں مرد کاشت کاری اور عورتیں الپاکا کے Fur سے بُنائی کرتی ہیں۔چھوٹی سے کمیونٹی میں چار سو رنگ بکھرے ہوئے تھے۔عورتیں شوخ رنگوں کے روایتی لباس میں تھیں۔کچھ مٹی کا کھلا میدان تھا۔۔۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا چاروں طرف۔چھوٹی دوکانیں پھوس کی چھت کی بنی ہی تھیں قطاروں میں۔انکا (Inca) عورتوں کے ہاتھوں سے بُنے ہوئے الپکا اور لاما کے فر (Fur) کے سویٹر، اسکارف، ٹوپیاں وغیرہ سجی ہوئی، ٹنگی ہوئی تھیں اور ہوا میں لہرا رہی تھیں۔کچھ بچے بے فکری سے کھیل میں مگن زندگی کو صحیح معنوں میں جی رہے تھے۔عورتیں زمین پر بیٹھے ہوئے لکڑی کے بڑے بڑے فریم پر الپاکا کے اون سے کچھ بُن رہی تھیں۔کچھ عورتیں اپنی پیٹھ پر اپنے بچوں کو باندھ کر یہ کام کر رہی تھیں۔پروین کو ایک عورت نے مسکرا کر دیکھا تھا اور فریم پر بُنائی کے طریقے بتا رہی تھی۔۔۔ایک چھوٹی سی دوکان میں ایک آٹھ سال کے معصوم بچے کو سامان بیچتے ہوئے دیکھ کر پروین کو اُس پر پیار اور رحم آ رہا تھا۔۔۔اُس کے چہرے کی معصومیت نے دل چھو لیا تھا۔۔۔

یہ گاؤں بھی ہندوستان پاکستان کے گاؤں جیسا ہے۔فرق ان لوگوں

کی پوشاک اور سربہ فلک پہاڑ کی ڈھلوان پر بنے ہوئے مکانات کا ہے۔ پہاڑوں پر جانے والے راستوں کا ہے۔ کھلے میدان کے ایک گوشے میں الپا کا اور لاما کی دنیا تھا۔۔۔فینس کے اندر۔ وہ اپنی دنیا میں خوش تھے۔ الپا کا کے فرتو اتنے زیادہ تھے کہ زمین چھور ہے تھے۔ لاما اور الپا کا پیرو کے خاص مویشی ہیں۔

ایک عورت کیچوا زبان میں پروین سے باتیں کر رہی تھیں اور کیرولینا ترجمہ کر رہی تھی۔ وہ عورت کہہ رہی تھی کہ ''وہ لوگ نیچے جا کر وادی میں کاشت کاری کرتے ہیں اور پہاڑ کی اونچائی پر رہتے ہیں۔ وہ اپنے خداؤں سورج، چاند، ستارے، دھنک وغیرہ سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ اور یہاں سے قدرتی نظاروں کا لطف بھی خوب لے سکتے ہیں۔۔۔ وہ لوگ الپا کا کھاتے ہیں اور اس کے فر سے اُون بنا کر ہر طرح کی بُنائی کرتے ہیں جس سے آمدنی ہوتی ہے'' یہ گاؤں پاک وادی۔۔۔ Sacred Valley میں ہے۔ یہاں کے لوگ مسکراتے رہتے ہیں اور خوش مزاج ہیں۔ وہ سوچ رہی تھی بغیر کسی دولت کے آسائش کے انسان کتنی خوشی اور سکون سے بھرپور زندگی گزار سکتا ہے۔ کھلے میدان میں مٹی کے برتن میں پتھروں کے درمیان شعلوں پر کھولتے رنگوں میں کچھ عورتیں الپا کا اور لاما کے فر سے بُنے ہوئے اون کو رنگ رہی تھیں۔ اس گاؤں میں یہ لوگ صدیوں پرانے طریقوں اور قدرتی وسائل سے کپڑے بناتے ہیں۔ ان عورتوں کے ہاتھوں سے الپا کا اور لاما کے فر سے بُنے ہوئے کمبل، سویٹر، موزے اور دیگر اشیاء ان کی معاشی مدد کرتی ہیں۔

پروین کے قریب ایک چھوٹا سا سات یا آٹھ سال کا بچہ اپنے ہاتھوں میں رنگ برنگے کوسکو شہر کے پوسٹ کارڈس لے کر آیا تھا۔ اُمیدوں کے ساتھ کہ شاید انہیں کوئی خریدے۔۔۔ پروین کی نظریں پوسٹ کارڈ سے زیادہ اُس بچے کی آنکھوں پر ٹکی ہوئی تھیں جو اُمید وبیم میں تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو آگے بڑھائے ہوئے کارڈس کو تھامے ہوئے معصومیت کا مجسمہ بنا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ پروین نے اس سے دس کارڈس خریدے تو وہ خوشی سے اُچھلتا ہوا اپنے دوستوں کے پاس فخر سے گیا تھا۔ اس بچے کے چہرے پر کسی فاتح سپاہی کے تاثرات تھے۔ یہ دیکھ کر کئی بچوں کے جھنڈ ہاتھوں میں مختلف مصنوعات لے کر آگئے تھے۔ دوسرے سیاح ان سے قیمت کم کرنے کے لیے بضد تھے۔ شاید وہ بچے بھی اس بے رحم رویے کے عادی تھے۔

پس زندگی

سیاحوں کی بس پاک وادی (Sacred Valley) سے ہوتے ہوئے خوبصورت گاؤں پزاک (Pisaq) کی طرف آگئی تھی جہاں پہاڑوں پر بکھرے ہوئے کھنڈرات ہیں۔ ان پہاڑوں پر چڑھ کر کھنڈرات تک جانا آسان نہ تھا۔ یہ جگہ انکاز (Incas) کی آرام گاہ تھی جو سارے فرائض اور جنگ سے دور سکون بخش تھی۔ یہ جگہ ان کی کاشت کاری کے لیے بھی اہم تھی اور اب بھی ہے۔ یہاں ہزاروں Terraces موجود ہیں۔ پزاک کے بلند قامت پہاڑوں کے سامنے دوسرے پہاڑوں پر قطاروں میں مقبرے ہیں۔ جو تقریباً پانچ کلومیٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا نام Tanqanamarka Tombs ہے۔ دور سے یہ پہاڑ پر کھُدے ہوئے گول سوراخ جیسے نظر آرہے تھے۔ یہ مقبرے تین مختلف قسم کے تھے جو درجہ بہ درجہ معاشرتی رتبے کے مطابق تھے۔ کچھ صرف سوراخ، کچھ طاق کی شکل کے تھے اور کچھ روضہ کی شکل کے۔ دونوں طرف کے پہاڑوں کو ایک پُل ملا رہا ہے۔ اسی پر چل کر میت کو وہاں دفن کرنے لے جاتے تھے۔ ان مقبروں میں کچھ ممیز (Mummies) اور لاشیں حال ہی میں دریافت ہوئی ہیں۔ مقبروں کے پہاڑوں سے کچھ دوری پر مختلف عبادت گاہیں۔۔۔ دھنک، صاعقہ، ستارہ وینس، چاند اور سب سے بڑا خدا۔۔۔ سورج کی تھیں۔۔۔ پزاک کا رنگین گاؤں حسین ہے۔ یہاں کی زبان کیچوا ہے۔ کوسکو سے یہاں تک آنے میں پہاڑوں پر دائروں میں تنگ سڑکیں ہیں نیچے جاتی ہوئی۔ یہ کوسکو سے تقریباً دو ہزار فٹ نشیب کی طرف ہے۔ اس شہر کے پرسکون ماحول میں چار ہزار افراد آسان زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں تنگ گلیوں میں ایک وقت میں ایک ہی گاڑی جا سکتی ہے۔۔۔ پیدل چلنا زیادہ آسان ہے۔

جیت (Ollantaytambo)

پاک وادی کے ایک اور شہر Ollantaytambo اور اس کے کھنڈرات میں پہنچ کر یہاں کی دل چسپ کہانی کیرولینا سنا رہی تھی کہ۔۔۔ ''یہاں کے ایک فوجی کو انکاز (Incas) کے بادشاہ کی بیٹی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ لڑکی کے باپ نے انکار کر دیا تھا لیکن وہ فوجی جنون کی حد تک محبت میں مبتلا تھا۔ اس کو بادشاہ نے قید کر لیا تھا۔ لڑکی کا نام کوسی (Kusi) تھا۔ ان دونوں کی محبت کی نشانی ایک بچہ تھا۔ آخر بادشاہ نے انہیں معاف کر دیا تھا اور دونوں نے شادی کر لی تھی۔ اس محبت کی داستان پر ایک ڈرامہ بھی لکھا گیا تھا جس کا نام Ollantay ہے۔''

اس شہر میں بھی ان گنت کاشت کاری کے Terracess ہیں۔ کھنڈرات میں مضبوط انکا دیواریں (Inca Walls) پہاڑوں پر تراشی ہوئی اونچی نیچی سیڑھیاں ہیں۔ انکاز کی یہ پاک وادی اپنے خوشگوار موسم ''اوروبامبا'' ندی کی وجہ سے اِنکا کے معتبر لوگوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ یہاں کی تازہ ہوائیں، آرام دہ درجہ حرارت اور قدرتی حسن لازوال ہے۔۔۔

بل کھاتی ہوئی ندی (Urubamba)

''اوروبامبا'' اس شہر کا نام اس کی ''اوروبامبا'' ندی کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ یہ ندی وادیوں میں بہتی ہوئی پہاڑ کے اوپر سے بل کھاتے ہوئے موٹے ریشمی دھاگے جیسی نظر آرہی تھی۔ دور تک جاتی ہوئی پاک وادی سے گزرتی ہوئی۔۔۔ پزاک شہر سے جاتی ہوئی۔۔۔ چمکتے ہوئے ریشم جیسی۔

پاک وادی۔۔۔ حسین شہر ہے جو ''اوروبامبا'' وادی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں اسپین کو ایک خاص جنگ میں شکست ہوئی تھی۔ پاک

وادی کے خوبصورت رنگین بازار سیاحوں کو اپنی طرف پکار رہے تھے۔

دن بھر کے تھکے ہوئے سیاحوں کو ٹور بس اب ہوٹل کی طرف لے جا رہی تھی جس کا نام ہے Villa Urubamba۔ سب تھک چکے تھے لیکن کیرولینا مائیک تھامے ہوئے بول رہی تھی۔

''اوروبامبا کے معنی ہیں مکڑی کی ہموار زمین کے Flat Lant of Spider۔ یہ بہت خاموش شہر۔۔۔ اوروبامبا ندی کے قریب پہاڑ کی گود میں ہے۔'' مسحور کن۔۔۔ برف کی چاندی سی جھل مل ٹوپی پہنے ہوئے کوہسار سورج کی روشنی میں دمک رہے تھے۔ اوروبامبا پاک وادی کا سب سے بڑا شہر ہے جس کے قریب انکاز کے کھنڈرات بھی ہیں۔۔۔ ''ولا اوروبامبا'' پھولوں اور کوہساروں کی گود میں ہے۔ سکون کی خوشبو اس کے اردگرد رقصاں رہتی ہے۔

وادیوں میں

علی الصباح چڑیوں کی چہکار نے جگا دیا تھا۔ بے حد خوابناک سماں تھا۔ ''ولا اوروبامبا'' کے چاروں طرف درخت، جھاڑیاں اور کورٹ یارڈ میں پھول ہی پھول کھلے ہوئے تھے۔ چاروں طرف اونچے کوہسار آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے نہ جانے کیا سرگوشیاں کررہے تھے۔ پرندے نغمے سنا رہے تھے۔ خوشگوار ہوائیں خوشبو ہاتھوں میں لیے ہوئے رقصاں تھیں۔ سب سیاح اپنی رہبر کیرولینا کے انتظار میں تھے۔ بس سے ریلوے اسٹیشن جانا تھا۔ جہاں سے ایک ٹرین ایک چھوٹے سے شہر Aguas Calientes سیاحوں کو لے کر جانے والی تھی۔ یہ شہر مشہور ماچوپیچو کے قریب ہے۔ سمندری سطح سے دو ہزار میٹر اونچائی پر Aguas Calientes اسپینی زبان کا لفظ ہے۔ کیرولینا نے بتایا تھا کہ اس کے معنی ''گرم چشمہ'' (Hot Spring) کے ہیں۔ یہ شہر ''اوروبامبا'' ندی کے کنارے پر واقع ہے۔

ٹرین ڈھلوانی ''اوروبامبا'' وادی سے گزر رہی تھی۔ چاروں طرف شیشے تھے اس میں۔ چھت بھی شیشوں کی تھی تاکہ سیاح وادی کے حسن سے محظوظ ہو سکیں۔ جنگلوں کے درمیان سے ٹرین گزرتی کبھی پہاڑوں کے درمیان سے۔ شیشے کی چھت سے نیلا آسمان اور اُس پر اڑتے ہوئے بادلوں کے سفید پرندے بھی نظر آرہے تھے۔ وہ کبھی جنگلوں کے خوبصورت رنگ دیکھتی کبھی آسمان۔۔۔ اُس کی حالت بچوں جیسی تھی جنہیں کوئی بے حد پسندیدہ کھلونا مل جاتا ہے۔ وہ قدرتی حسن کی ہر تتلی پکڑ لینا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی ٹرین میں بسی ہوئی چھوٹی سی دنیا کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ اگلی سیٹ پر کچھ لڑکے اور لڑکیاں تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ آنکھیں بند کیے ہوئے آرام کررہے تھے۔

کچھ عورتیں اور مرد ٹرین کے ہر ڈبے میں جا کر الپاکا فر کی بنی ہوئی اشیاء فروخت کر رہے تھے۔ ٹرین گنگناتی ہوئی اپنی منزل Aguas Calientes کی طرف چلی جارہی تھی۔۔۔ کیرولینا کے کہنے کے مطابق یہ چھوٹا سا شہر ایک Remote بھولی ہوئی جگہ تھی۔

ٹرین وادیوں سے گزرتی ''اوروبامبا'' کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اپنی منزل پر آکر رک گئی تھی۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر گہما گہمی تھی۔ لوگوں کا جم غفیر تھا۔ سیاح زیادہ تھے مقامی لوگ کم کم۔ عورتیں اپنے بھڑکیلے رنگوں کے روایتی لباس میں مختلف مصنوعات ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے فروخت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔۔۔ سیاحوں کو لے کر بس ہوٹل Hanaqpacha Inn پہنچ گئی تھی۔ یہ کیچوا زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''بلندی کی دنیا جہاں خدا رہتا ہے۔''

یہ حسین شہر قدرت کے خزانوں سے مالا مال ہے۔ اس کا نام Aguas Calientes یعنی Hot Water اس لیے پڑا کہ شہر کے پہاڑ پر۔۔۔ دور اونچائی پر Thermal Springs ہیں۔ سیاح وہاں گرم پانی سے اپنے تھکے ہوئے اعضا کو آرام پہنچاتے ہیں۔ یہ انوکھا شہر ٹرین کا ٹرمینل ہے۔ ٹرین کوسکو اور وروبامبا سے سیاحوں کو ماچوپیچو لے کر آتی ہے۔ یہاں کوئی گاڑیاں نہیں چلتیں۔ صرف وہ بسیں ہیں جو ماچوپیچو (Machu Picchu) لے جاتی ہیں۔

بے چین لہریں

ہوٹل Hanaqpacha Inn کے اندر داخل ہوتے ہی خوبصورت پیالیاں اور کوکا چائے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔۔۔ میزبان حسب معمول گرم جوش تھے۔ کمرے میں پہنچ کر پروین نے جیسے ہی کھڑکیوں کے پردے سرکائے اُس نے دیکھا جو نظارے سامنے نظر آرہے تھے وہ ماورائے دنیا تھے آنکھیں خیرہ ہوگئی تھیں۔ پروین بت بنی ہوئی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ اُن پر نظریں جمائے ہوئے خواب حقیقت بن گیا تھا۔ چاروں طرف اونچے پہاڑوں کے قدموں میں بہتی ہوئی پرشور اوروبامبا ندی۔۔۔ پتھروں کے درمیان راستہ بناتی ہوئی، سنگلاخ دیواروں سے سر ٹکراتی ہوئی، چیختی ہوئی، بے چین، تیزی سے بہتی جارہی تھی۔ جیسے وہ بے کل ہو کر کسی کی تلاش میں بے تحاشہ بے ہوشی کے عالم میں دوڑی جارہی تھی۔ نہ جانے کس تلاش میں وہ صدیوں سے اسی طرح بھاگتی جارہی تھی۔ اس کی زور آور پرشور لہریں نہ جانے کون سے درد میں مبتلا تھیں۔ پتھروں پہ اپنا سر پٹک پٹک کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ ان کی چیخ میں بھی بے حد نرمی تھی۔ رات کی ملگجی فضاؤں میں سیال چاندی بہہ رہی ہو جیسے۔ پتھروں کے درمیان سختی اور نرمی کا عجیب سنگم تھا۔

مدھم روشنی میں اس کا سیمیں بدن۔۔۔ جیسے رات کی سیاہ مخملی چادر پر چاندنی کی روپہلی گوٹ جھل مل کر رہی ہو۔ بل کھاتی ہوئی لہروں کے جل ترنگ سماعت کی پنکھڑیوں پر شبنم کی طرح ٹپک کر تازگی بخش رہے تھے۔ حسنِ قدرت کے طلسم میں وہ اس طرح کھوگئی تھی کہ گرد و پیش کی کوئی خبر نہ تھی۔ وہ اوروبامبا ندی کا گونجتا ہوا نغمہ اور پہاڑوں کے خاموش لبوں سے کہانیاں سن رہی تھی۔ نظریں نظاروں کی شراب قطرہ قطرہ پی رہی تھیں۔ نشے میں چور ہو رہی تھیں۔۔۔ رات آدھی گزر چکی تھی لیکن اس کی سحر زدہ آنکھوں کی رحل پر قدرتی حسن کی کتاب کھلی ہوئی رکھی تھی۔ طلسماتی فضاؤں نے نظروں کو مقناطیس کی طرح جکڑ لیا تھا۔ نیند چھین لی تھی۔ مسحور آنکھیں گئی رات تک سیراب ہوتی رہی تھیں۔

''ضمیرِ وقت''

چراغِ فکر

(سید ضمیر جعفری کی نذر)

حسن عسکری کاظمی
(لاہور)

وہ بزمِ شعر میں ہر لحظہ مسکراتا تھا
سخی تھا ایسا کہ لعل و گہر لٹاتا تھا

مثالِ شعلۂ شب تاب تھا وجود اس کا
چراغِ فکر و نظر بھی وہی جلاتا تھا

عطائے موجۂ خوش رنگ تھا وہی ہم میں
ستارہ سا وہ سرِ شام جگمگاتا تھا

کبھی نہ آئے گا محفل میں اب نظر لیکن
وہ دن بھی یاد ہیں محفل میں جب وہ آتا تھا

عجب طرح کی تھی سنجیدگی ظرافت میں
ضمیرِ وقت کو جیسے وہی جگاتا تھا

وہی تو درد کی سوغات بانٹتا تھا کبھی
ہنسی ہنسی میں وہ اپنا ہمیں بناتا تھا

اسی کا کما تھا یاروں کے غم غلط کرنا
وہ صبح وشام سدا نیکیاں کماتا تھا

بسی ہوئی ہیں وہ آنکھیں حسنؔ تصور میں
وہ گفتگو میں ہمیں آئینہ دکھاتا تھا

❍

وطن میں اجنبی

یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

آپ کے نوشتہ نے
ناگہاں ایک نظم کہلوائی

وطن میں اجنبی!
اجنبی ماحول کا احساس ہوا
لفظ ''وطن'' پر تنہا دل ہی نہیں
چشمِ تشنہ بھی تو چھلک آئی
وطن جہاں کوئی بھی نہ ہو جب اپنا
دل میں ہُوک اُٹھے، اور
نگاہ میں جہانِ گذشتہ کا
جو کبھی محبتوں کا تھا شیدائی
کشتیٔ حیات اُسے کہاں لے آئی
صحرائے دل میں بیکراں تنہائی
ترکِ وطن تو اِک حادثہ ٹھہرا
تھا وقت اور حالات نے ستم ڈھایا
ورنہ تشنہؔ کہاں تھے ہرجائی
میرے بھائی!!!

❍

رات کا سنّاٹا۔۔۔

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

رات کا یہ سنّاٹا
اور میں تنِ تنہا
آنکھیں بھاری بھاری ہیں
رَت جگے کی ماری ہیں

لمحہ لمحہ بوجھل ہے
جی بہت ہی بے کَل ہے
پھر کوئی خیال آ کر
دل کو چھیڑ جاتا ہے
ایک پل خوشی دے کر
دیر تک رُلاتا ہے

اک عجیب عالم ہے
زیست وقفِ ماتم ہے
یاس کی گھٹاؤں نے
آ کے مجھ کو گھیرا ہے
دل کی سُونی بستی میں
چارسُو اندھیرا ہے

ہُو کے ایسے عالم میں
تلخیوں کے موسم میں
درد و یاس کا طوفاں
جب اُمڈ کے آتا ہے
میری آرزوؤں کے
کرب کو بڑھاتا ہے

زیست کی ڈگر پر میں
سوزِ ہجر کا مارا
ایک ایسا راہی ہُوں
جس نے اپنی منزل کو
خود ہی کھو دیا پا کے
آپ اپنے ہاتھوں سے

آہ! میرے ماضی کی
کرب ناک یادوں کے
سوگوار لمحوں کو
میری ذات نے اب تک
بے طرح گزارا ہے
رُوح میں اتارا ہے

اِن حزیں خیالوں میں
رنج دِہ سوالوں میں
کچھ الجھ گیا ہوں میں
اور سوچتا ہوں میں
رات کا یہ سنّاٹا
اور میری تنہائی
دل کے آبگینے کو
چُور چُور کر دیں گے
اور تیری خوشبو کو
مجھ سے دُور کر دیں گے!

یہ خیال آتے ہی
کانپ کانپ اُٹھتا ہوں
اور میری آنکھوں سے
آنسوؤں کا اک ساون
پھر برسنے لگتا ہے
اور ایک اندیشہ
تجھ سے پھر بچھڑنے کا
دل کو ڈسنے لگتا ہے

رات کا یہ سنّاٹا
اور میں تنِ تنہا
آنکھیں بھاری بھاری ہیں
رَت جگے کی ماری ہیں۔۔۔

بے اعتنائی

حسن منظر
(کراچی)

بے اعتنائی اور ایسی بے اعتنائی
نہ شیکسپیئر کی کوئی وقعت ہے
نہ اُسے جاننے کی فرصت،
نہ ہومر، فردوسی اور کالیداس کو،
نہ اتنی کہ سندرتا کی دیویوں کو
کوئی واسنا سے دیکھے،
نہ اپنے اپنے وقت کے ناموروں،
celebrities کو یاد کرنے کی۔

سکندر کے ہاتھ تو ہیں لیکن
اُن میں تلوار ہے نہ بھالا،
ہے تو ایک سیاہ تونبی کا کشکول،
یاقوت، موتیوں اور سونے کا
ملتجی نہیں، رحم اور عفو کی بھکشا سے
بھرے جائے کو، پیاسے اونٹ کی طرح
منھ کھولے، بلبلاتا، بے تاب۔

سقراط اور ارسطو، برٹرنڈ رسل کے
پاس سے گزرے چلے جارہے ہیں
بلا آنکھوں اور سر سے
شناسائی کا بال برابر اشارہ کیے
ہزاروں ہزار سال کے
اُن سے شکشا کے بھکاری۔

برہمن خود ڈھونڈتا پھر رہا ہے
(اور کیسے بتائے دوسروں کو)
گنگا کدھر ہے اور اجودھیا گھاٹ کہاں۔

برہمن کے کندھے سے کندھا ملائے
اُتنا ہی ہراس اور خوف زدہ
چل رہا ہے وقت کا پال گئی
قارون پٹرولیم کا ہاتھ تھامے۔
اور ان کے پیچھے میں کاسۂ گدائی اٹھائے
ان گنت کھرب پتی، ملٹی کھرب پتی
مرے مرے قدموں سے وقت کا فاصلہ ناپتے ہوئے۔
اُدھر کو
جدھر پہاڑ اکھڑے پڑے ہیں
سمندر اپنی راہ بھول کر
دریاؤں میں اوپر چڑھا چلا جارہا ہے۔

اس نجانے کہاں کو رواں قافلے میں
چیونٹیوں کی لائن ڈوری سمان ہیں
کتنے ہی چھوٹے بڑے، ہیکڑی والے
سرنوائے، پشیمان
جن سے گھروں میں اور گھر سے نکلتے
کانپتے ہیں، عورتوں کے سینے
مِل ورکرز، کاریگروں، کسانوں، کنیاؤں
نردھنوں کے ہاتھ۔

ابھی کتنی دور ہے جانا
اُس دن کو پہنچنے کے لیے!
کتنی دور، کتنی دور اے ربِ غفور
اے خالقِ مطلق، پالنہار۔

○

''حیاتِ آب''

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

تمہاری یاد کو دل سے کبھی بُھلا نہ سکے
جو پیار بن کے تم آئے تو دِل سے جا نہ سکے

وہ روز شب جو سنہرے دِنوں کی یادیں ہیں
سدا بہار وہ لمحے کبھی بھلا نہ سکے

یہ جانا میں نے کہ رشتوں کا اعتبار نہیں
جو جسم و جان بنے تھے وفا نبھا نہ سکے

ہزار بار میری روح اُنہیں بلاتی رہی
وہ سوئے ایسے کہ اُن کو کبھی جگا نہ سکے

ہنسے تو ہم بھی تیرے بعد بارہا لیکن
جو تجھ سے مل کے ہنسے تھے وہ کیف پا نہ سکے

حیات آب سے نکلی تھی خاک سے مل کر
عطا ہمیں بھی ہوئی تھی، مگر نبھا نہ سکے

پیا تھا ہم نے تو آبِ حیات بھی لیکن
قضا جو سامنے آئی کہیں بھی جا نہ سکے

عجب سفر پہ چلا جا رہا ہوں میں بھی ریاضؔ
سفر تمام جو کر لے وہ لوٹ آ نہ سکے

○

وقت کی باڑھ

فیصل عظیم
(کینیڈا)

جھلملیوں کی آڑ میں رقصاں
درد کی آندھی
شور مچا کر
پانی کی دیوار اُٹھا کر
وقت کی سرحد توڑ رہی ہے
پانی کی دیوار میں قطرہ قطرہ روزن کھول رہی ہے
آنکھیں اپنے ہاتھ بڑھائے
روزن کے اُس پار کھُلی ہیں
عکس کی تہ میں
عکس کو چھو کر دیکھ رہی ہیں
بھیگے چہرے!۔
جسموں کی محتاط فصیلوں سے چپکے بے خود پیراہن
دیواروں پر گیلے تیروں کی بوچھاروں کی تحریریں
نشّے میں گم پیڑوں کے خوابیدہ پتّے
نکھری گھاس میں چاندی کے لبریز کٹورے
سحر زدہ گلیوں کی بھیگی بھیگی آنکھیں
اور انگڑائی لیتی دھرتی کی پوروں سے اُٹھتی سرشاری کی خوشبو!۔
پر ایسے میں جل کر
بجلی دھاڑ کے ہاتھ جھٹک دیتی ہے
پانی کی دیوار کے پیچھے
سب منظر دھندلا دیتی ہے
وقت کی باڑھ لگا دیتی ہے۔۔۔۔۔

○

اے زندگی! رقص تیرا۔۔۔

رُوپا صَبا
(چنڈی گڑھ، بھارت)

زندگی
کتنی دل فریب ہے تُو
کبھی کھنکتی ہے
رقص میں ڈُوب
جاتی ہے
سُروں کی جھیل بنتی ہے
اور۔۔۔ پھر۔۔۔ دفعتاً
ہانپنے لگتی ہے
کانچ کانچ
گھنگھرو گھنگھرو
بکھرنے لگتی ہے
مہاور سجے پیروں میں
چُبھنے لگتی ہے
اور۔۔۔ پھر خود کو
سہجتی سنبھالتی
پلکوں پہ شبنم سجاتی
ہَولے سے مسکرانے
لگتی ہے۔۔۔
کبھی مدھم پڑتا
کبھی گہرا ہوتا
پل پل بدلتا
رنگ تیرا
ہم بھی دیکھیں گے
کبھی کھنکتا
کبھی تھم تھم جاتا
رَقص تیرا
ہم بھی دیکھیں گے
ناظرین کی طرح
اِک فاصلے پہ کھڑے
حاضرین کی طرح
رَقص تیرا

''دسمبر لوٹ کر آنا!''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

جو آ ؤ گے۔۔۔
حسیں لمحوں کی خوشیاں سب میں بانٹیں گے۔۔۔
جو آ ؤ گے۔۔۔
حزیں لمحوں کا سارا کرب بھی پھر سے سمیٹیں گے۔۔۔
کہ جب آتے ہو۔۔۔
دونوں کو ہمیشہ ساتھ لاتے ہو۔۔۔
ذرا سوچو!
کہ گزرے کل اور آتے پل کا۔۔۔
اِک ابدی تسلسل ہے۔۔۔
تمہارے ساتھ ہی تو۔۔۔
یہ خوشی اور غم سنبھلتے ہیں۔۔۔
جو آ ؤ گے۔۔۔
تو کچھ حقِ رفاقت ہی اُدا ہوگا۔۔۔
مہکتے موسموں کی چاپ سُنتا۔۔۔
کہی اور اَن کہی باتیں سُنانا۔۔۔
لرزتے آنسوؤں سنگ مسکرانا۔۔۔
گزرتے سال کا وعدہ نبھانا۔۔۔
دسمبر لوٹ کر آنا۔۔۔!

شجر کے طیور

تصور اقبال

(پنڈی گھیب، اٹک)

نوید سروش سے میری شناسائی تو بہت پرانی ہے لیکن ''ہم نشینی'' کو کم وبیش ڈیڑھ برس ہوا ہے۔''ہم نشینی'' نوید سروش کا نقشِ اول ہے۔جس کا مطالعہ بالاستعیاب کرنے کے بعد مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ نوید سروش نوجوان نسل کا نمائندہ شاعر ہے۔نوید سروش نے یوں تو شاعری کی تقریباً تمام رائج الوقت اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن میرے ذاتی خیال میں غزل ہی اس کی پہچان اور محبوب صنفِ سخن ہے۔فکروفن سے آراستہ اس کی غزل عہدِ موجود کے تقاضوں کو نا صرف پُورا کرتی ہے بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ایسی شاعری جو قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کردے یقیناً کسی ایسے شاعر کی ہوگی جو بالکل الگ تھلگ سوچ کا حامل ہوگا۔سروش عمرِ عزیز کے اُس حصے میں ہے جب جذبے اور سوچ جوان ہوتے ہیں ایسے میں کامیابی خود بخود قدم چوم لیتی ہے۔سروش نے اپنی ذہانت، ریاضت اور محنت سے انتہائی قلیل عرصے میں بلند مقام حاصل کرلیا ہے۔انسانی جذبات واحساسات، داستانِ حسن وعشق، غمِ زمانہ اور سماجی اقدار کو بیان کرنے میں اسے ملکہ اور مہارت حاصل ہے۔سروش کے کلام میں روانی، اسلوب میں حسن اور غوروفکر میں گہرائی اور گیرائی بدرجہ اتم موجود ہے۔سروش کے اشعار میں اندازِ بیاں کی تازگی روایت اور جدت پسندی کا حسین امتزاج اس کے فنِ شعر پر قادر ہونے کا بین ثبوت ہے۔سروش اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے ایک مختلف انداز اختیار کرتا ہے۔اُسے بات کرنے کا سلیقہ بھی خُوب آتا ہے۔ وہ ایک دائرے میں مقید ہو کر شاعری نہیں کرتا بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدات سے حاصل کردہ احساسات کو اپنے اشعار میں بیان کرتا ہے۔کسی بھی فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے فنی شعور اور ہنر مندی بنیادی عوامل سمجھے جاتے ہیں اسی طرح شاعری میں بھی اور بالخصوص غزل کی شاعری میں محض قافیہ پیمائی اور الفاظ کی ہیر پھیر کلام کو اثر انگیز نہیں بناتی اس کے لیے سوچ کا مرکز ومحور تبدیل کرنا پڑتا ہے۔عصری آگہی بنیادی شرط ہوتی ہے۔بنے بنائے استعاروں، تشبیہوں اور زمینوں کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ اپنی پہچان بنانے کے لیے نئے استعاروں کے ساتھ ساتھ نئی زمینیں بھی تلاش کرنا پڑتی ہیں۔سروش نے اس حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بالکل نئے اور منفرد پیرائے میں اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش اور سعی کی ہے۔سروش کی غزلوں میں رسمی اور روایتی رنگ کے بجائے چمک دمک اور رعنائی کا عنصر نمایاں ہے۔جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سروش نے اپنی شاعری کو کسی ایک نقطے پر منجمد نہیں کیا بلکہ ہر موضوع پر قلم کشائی کی ہے۔اگر ہم سروش کے کلام کا بنظرِ عمیق جائزہ لیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ نہ تو کسی کی اندھی تقلید کرتا ہے اور نہ ہی کسی کے فرسودہ خیالات کو اپنے قریب آنے دیتا ہے۔وہ رجائیت اور انفرادیت کو پسند کرتا ہے اور ہمیشہ کچھ نیا کر گزرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔آیئے اب اُن اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں جو نوید کو سروش بنا رہے ہیں۔

اُس کے جانے کا لمحہ ... سانسیں، ہلچل اور برسات

ذکر کرتے ہیں اپنے ماضی کا ... دوست ملتے ہیں جب پُرانے دو

زندگی کی گلی میں نو گھر تھے ... عمر بھر میں مکان دس میں رہا

خامیاں کس طرح چھپاتا میں ... آئینوں کی جو دسترس میں رہا

جہاں دلدل دکھائی دے رہی ہے ... یہ پہلے باغ اک پھولوں بھرا تھا

بڑی اور چھوٹی ہر دو بحروں میں کیف انگیزی اور دل آویزی اپنی انتہائی حد کو چھوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔سروش گزشتہ کچھ عرصے سے شعر وادب کی تخلیق میں ہمہ تن مصروف ہے۔ادب کے سنجیدہ حلقوں اور ایوانوں میں اس کا نام احترام اور اہتمام سے لیا جاتا ہے۔سروش نے اپنی شاعری کے ذریعے قارئین کو متاثر کیا ہے۔اس کا شعری سفر نہایت ہی حوصلہ افزا ہے۔وقت کے ساتھ ساتھ نئے موسموں اور نئے مناظر کی داستانیں قلم بند کرنا کوئی سروش سے سیکھے۔وہ اپنے افکار اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔اس کے دل نواز لہجے سے کلاسیکی اور جدید رنگ اتنے نمایاں نظر آتے ہیں کہ بعض اوقات قدیم اور جدید میں امتیاز کرنا قدرے محال ہو جاتا ہے۔موضوعات کی شستگی اور رفعتِ تخیل نے اس کی شاعری میں مزید تاثیر پیدا کردی ہے۔فرسودہ اور پامال موضوعات اس کی شاعری میں کہیں نظر نہیں آتے اسے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ حقائق پر مبنی شاعری ہی زندۂ جاوید ہوتی ہے۔میں بذاتِ خود سروش کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور بحیثیتِ مجموعی اس کی شاعری کو انتہائی ارفع مقام پر دیکھتا ہوں۔میری دعا ہے کہ وہ اسی طرح ثابت قدمی سے آگے بڑھتا رہے اور شعری ایوانوں میں اپنی دھاک بٹھائے رکھے۔آیئے اب سروش کے چند خوبصورت اشعار سے لطف دوبالا کرتے ہیں۔

جب سزائے غمِ ہستی سے گزر جاؤں گا
میں اُجالوں کی طرح اور نکھر جاؤں گا

اک مکیں اک مکاں کی بات نہیں
ہم نے دیکھا ہے شہر بھر خاموش

احساس کو زبان کے سانچے میں ڈھال کر
اب دل یہ کہہ رہا ہے کہ اُن سے سوال کر

اب چھن گئی ہے پیروں تلے سے زمین بھی
ورنہ تو دسترس میں مری آسماں تھا کل

باقی صفحہ ۱۱۱ پر ملاحظہ کیجیے

حیاتِ جاوید، حالؔی کا جاودانہ شہکار

سید تقی عابدی
(کینیڈا)

حالؔی کے نثری کارناموں میں مقدمہ شعروشاعری، یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حیاتِ جاوید سرسید کی سوانح عمری ہے جو تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ حالؔی نے سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا کام سرسید کی زندگی میں شروع کیا لیکن اس کی تکمیل اور اشاعت سرسید کے انتقال کے دو تین برس بعد ہوئی۔ حیاتِ جاوید کا سارے ملک میں جاودانہ استقبال کیا گیا۔ چند مشاہیرِ ادب نے اس کے نقائص اور متنازعہ مسائل کی نشان دہی کی جن میں شبلی، صدر یار جنگ شیروانی، وحید الدین سلیم کے علاوہ کئی پردہ نشین مرد بھی شامل تھے، جنھیں حالؔی کا ہر کام خالی اور حالؔی ڈفالی نظر آتے تھے۔ شبلی نعمانی نے اسے کتاب المناقب مدلّل مدّاحی کذب اور جھوٹ کی داستان کہا، صدر یار جنگ شیروانی نے شبلی کے اعتراضات پر صاد کا نشان لگایا۔ وحید الدین سلیم جن کو حالؔی نے عظیم بنایا لکھا کہ جو ادعا حالی نے دیباچے میں کیا پوری کتاب میں اس کا شمّہ برابر بھی حق ادا نہیں کیا۔ یہ تمام افراد سکّے کے دونوں رخ یعنی سرسید کی مدح کے ساتھ ان کے بعض کاموں کی قدح بھی دیکھنا چاہتے تھے جو حیاتِ جاوید میں کہیں جلی اور کہیں خفی حالؔی نے سطور اور بین السطور بیان کی ہیں۔ جہاں تک سرسید کے مذہبی خیالات اور اجتہادی روش کا تعلق ہے حالؔی نے اُس سے اتفاق اور اختلاف کیا ہے۔ اگرچہ مدح کا پلڑا قدح کے مقابل بہت وزنی ہے لیکن حالؔی نے تنقید اور تنقیص کے کانٹوں سے سرسید کی پھلواری شخصیت کو تارتار نہیں کیا جو بعض اوقات مغربی سوانح نگار کرتے ہیں۔ حالؔی نے یہ بھی تاکید کی کہ ابھی مشرقی ماحول میں کریٹکل بیوگرافی کا وقت نہیں پہنچا چنانچہ آگے آنے والے اس رخ سے بھی نقاب کشی کریں گے۔ حالؔی کے قول کے مطابق اگر حیاتِ جاوید سرسید کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی اس کو حاصل ہونی دشوار تھی اور جب کبھی سرسید کے سامنے ان کے لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ''میری لائف میں سوا اس کے لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوّے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ سرسید اپنی سوانح لکھوانے کے بڑے آرزو مند تھے۔ انھوں نے کئی بار بلاواسطہ شبلی نعمانی کو اس کام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ کبھی دوست واحباب سے پیغام کبھی کسی دوست کے خواب کی تفصیل کہ شبلی سرسید کی سوانح لکھ رہے ہیں شبلی تک پہنچاتے تھے لیکن شبلی راضی نہ ہوئے۔

1889ء میں کرنل گریہم نے انگریزی میں سرسید کی بائیوگرافی شائع کی جو بقول ایک انگلش اخباری ریویو ایک مکمل بائیوگرافی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی۔ سرسید کے دوست حاجی اسماعیل خاں نے منشی سراج الدین احمد مالک چودھویں صدی کو سرسید کی سوانح لکھنے پر راضی کیا جنھوں نے مٹیریل جمع کرکے حاجی اسماعیل خاں کو دیا جو مسودے کی شکل میں پڑا رہا چنانچہ آخرکار حالؔی نے بذاتِ خود چند ماہ علی گڑھ میں رہ کر سوانح کا مواد جمع کیا اور منشی سراج الدین کا جمع شدہ مسودہ بھی حاصل کرکے حیاتِ جاوید تکمیل کی۔ سرسید کی بیوگرافی لکھنا آسان کام نہ تھا۔ سرسید ایک ہمہ جہت بلکہ مختلف الحسن حیثیتوں کے مالک تھے۔ ان کے دوست اور دشمنوں کی کمی نہ تھی۔ وہ کہیں صدیق اور کہیں زندیق سمجھے جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے حالات غدر کے بعد تو آسانی سے دستیاب تھے مگر اس سے پہلے کے حالات کا جمع کرنا مشکل تھا۔ سرسید کی زندگی میں انقلابات کی کمی نہ تھی۔ غدر کے بعد بہت سی معلومات انگریزی فائلوں میں تھیں جن کا ترجمہ بھی ضروری تھا۔ حالؔی نے یہ تمام امور دقیق دیدہ ریزی اور محنت سے کی۔ سرسید کے غدر سے قبل کے حالات حالؔی نے سیرت فریدیہ سے لئے جو سرسید کے نانا کے احوال زندگی سے متعلق تھی اور جسے خود سرسید نے لکھا تھا۔ کچھ واقعات اور حالات رشتہ داروں اور تذکروں سے جمع کئے۔ حالؔی نے سرسید کو ایک سو سوالات کا سوال نامہ بھیجا تھا کہ اس پر مختصر جوابات لکھ دیں مگر وہ بھی لکھا نہ گیا۔ حالؔی نے کچھ حالات اور واقعات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور تصانیف احمدیہ سے حاصل کئے اس طرح قطرہ قطرہ ساغرِ حیات میں بھر کر اُسے حیاتِ جاوید کر دیا۔ حیاتِ جاوید کو حالؔی نے دو حصّوں میں تقسیم کرکے پہلے حصّے میں سرسید کی زندگی کے واقعات اور ان کے امور جو ابتدائے زندگی سے ان کی رحلت تک انجام دئے تاریخی ترتیب سے بیان کئے اور دوسرے حصّے میں ان کی حیات اور ان کے کارناموں پر تبصرہ کیا۔

حالؔی نے حیاتِ جاوید کے نو سو صفحات پر سرسید کی حیات شخصیت اور فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زندگی کو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ بتایا ہے۔ حالؔی لکھتے ہیں سرسید کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انھیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسا بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاسکتے۔ حالؔی نے بتایا ہے کہ سرسید کی زندگی ہمیں کیا نصیحت اور سبق دیتی ہے۔ اور بعض مسائل پر غور کرنے کی دعوت دی۔ ہم یہاں ان نکات کو پیش کرتے ہیں جو ایسے جملے ہیں جن کو کھولیں تو دفاتر بھی ان کی تشریح کے لیے ناکافی رہیں۔

الف:۔ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تاکہ دنیا میں آرام سے رہو۔

حالؔی نے کہا ہے۔ چلو اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی۔

مولانا روم کہتے ہیں۔ زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز۔ یعنی اگر

زمانہ مخالف ہوتو تو بھی زمانے کے ساتھ ہوجا۔

علامہ اقبالؔ اس فکر کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ بے خبروں کی نصیحت ہے کہ اگر زمانہ تمہارے خلاف ہوتو تم بھی بدل کر زمانے کے ساتھ ہوجاؤ، اگر زمانہ ساتھ نہیں دیتا تو تم زمانے سے لڑ کر زمانہ کو بدل دو۔

حدیثِ بی خبراں است کہ بازمانہ بساز
زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

ب:۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیّت بننے کی کوشش کرو تا کہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ اس سے ذیل کے فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

(i) محکوم قوم قومی عزت حاصل کرسکتی ہے۔
(ii) شائستہ حکومت میں اس کا رسوخ واعتبار بڑھ سکتا ہے۔
(iii) قوم اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتی ہے۔
(iv) قوم میں خود داری اور سلف رسپکٹ کی تحریک ہوتی ہے اور غلامانہ خوشامد سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ج:۔ قوم کے تنزل سے قوم کے مذہب کو جو صدمہ پہنچتا ہے اس کا تدارک ہوسکتا ہے۔

د:۔ مذہب کے مہتم ہونے سے قوم جن آفتوں میں مبتلا ہوجاتی ہے اس کا علاج کیا ہے۔

ھ:۔ قوم اور وطن کی محبت کو جزوایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔

و:۔ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص طمع خودغرضی جھوٹ آرام طلبی اور عیش وشہرت سے دست بردار ہوجاؤ۔

ز:۔ تھوڑی تعلیم بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے عظیم الشان کام کرسکتے ہیں کہ بڑے بڑے مدبّروں سے نہ ہوسکے۔

ح:۔ قوم کی مخالفت کو صبر واستقلال سے برداشت کریں مگر ان کی حقیقی خیرخواہی کے لیے ان کی عقل عادت اور مرضی کے خلاف کام کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

ط:۔ تعصب سے نفرت اور دوسری قوموں سے حسن معاشرت ضروری ہے۔

ک:۔ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور کر دکھاؤ۔

ل:۔ وقت کی قدر کرو، اک لحہ بے کار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مرجاؤ۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ سرسید کا منشور تھا اور حالیؔ نے حیات جاوید میں ان کی حیات شخصیت کارناموں اور فتوحات کے ذیل یہ بتادیا کہ سرسید نے خود ان اہم نکات پر عمل کیا اور دوسروں کو عمل کرنے کی دعوت بھی دی۔ اسی لئے تو حالیؔ نے سرسید کے مرثیے میں کہا۔

چیست انسانی؟ تپیدن ازتپ ھمایگان
از سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن
زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم
گر توانی می توانی سید احمد خان شدن

یعنی انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج ودرد سے بیتاب رہتا ہے وہ جنت کی ہوا میں بھی محروموں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے۔ قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مرجانا اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ سرسید احمد خان بن سکتا ہے۔۔

واہ صفوت واہ!

(صفوت مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر)

مامون ایمن

(نیویارک)

جمعرات ،۳۱۔دسمبر۲۰۱۵ء کا دن فجر کے وقت ہی سے خود کو اُجالے سے بچانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ساڑھے پانچ بجے صبح ،وہ دن اپنی غیر روایتی کوشش میں کامیاب ہوگیا۔صفوت علی نے تمام عمر جس دل کی حفاظت وفاداری سے کی تھی اُسی دل نے بالآ خراپنی جفا کاری کا رنگ دِکھلا دیا۔موت سُرخ رو ہوئی۔وجہِ موت پر الزام آیا۔سننے والوں نے دل کو جفا کار کہہ کر آ نکھوں کا دریا بنایا۔آ نکھوں کو اشکوں کا مخزن بنایا۔یادوں،لمحات اور آلام کا مخزن۔وہ مخزن جس کی ہیئت میں مسلسل غم کی جھڑی تھی۔بلا شبہ صفوت نے احباب کو،اعزاء کو اپنے کردار کا ایک خزانہ دیا۔واہ صفوت واہ!معجّزہ یادوں،لمحات اور آلام کے مخزن میں شفاف آ ئینے تھے جن میں پنہاں عکس دیدوں سے سرگوشی کرتے نظر آ تے تھے۔۔۔صفوت کی زندگی واقعی''واہ'' سے معمور تھی۔۔۔پاک صاف،پُرخلوص، بے ریا،بااعتماد،قُرب کی خواہاں،دنیاوی اور کسی قدر دینی علم سے بھرپور،اردو اور انگریزی زبانوں میں چاشنی،بیان پر دسترس،ژرف سے دوستی،حال پر گرفت،فرد اکی فکر،جذبات کی مُسکان،احساسات کی سرگوشی،جلوت میں گُم،خلوت میں تنہا، ظاہروباطن میں یک جہتی۔۔۔واہ صفوت واہ!

صفوت علی محبت بانٹتا پھرتا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے چار ابتدائی برسوں میں اپنے والدین کو ایک ماہ کی قلیل مدت میں،اس دنیا سے اُس دنیا میں سفر کرتا دیکھ چکا تھا۔اُس کے چھوٹے بھائی کو لاہور سے ہندوستان بھیج دیا گیا تھا۔لہٰذا اُس کے آ ئندہ ماہ وسال پھوپھی کی نگرانی اور شفقت میں گزرے۔وہ ذہین تھا،علم کا دلدادہ تھا۔اُس نے گورنمنٹ سنٹرل موڈل ہائی سکول،لاہور سے ہائی سکول کا سرٹیفکیٹ وظیفہ کے ساتھ حاصل کیا اور فزکس میں ایم۔ایس۔سی کی سند گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی۔یادرہے کہ ان دونوں تعلیمی اداروں میں داخلہ ملنا کوئی آسان بات نہ تھی۔پھر اُس نے اسلام آباد سے فزکس میں ایم۔فل کی سند حاصل کی اور امریکا آ گیا۔یہاں اُس نے مشہورِ زمانہ ٹمپل یونیورسٹی، فلاڈیلفیا سے فزکس میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ سند حاصل کی اور امریکا میں تدریس اور تحقیق کی ملازمتوں پر فائز رہا۔اُس کی آخری ملاقات ایک اہم،عالمی ادارہ،اے ٹی اینڈ ٹی کے ساتھ تھی۔وہ اس ادارہ کے ایک خصوصی شعبہ Y2K کا ڈائریکٹر تھا۔پچھتر افراد پر مشتمل قابل عملہ اس کے ماتحت تھا۔۱۹۹۸ء اور ۱۹۹۹ء میں یہ بات عام ہو چکی تھی۔۔۔''۱۹۹۹ء کے اختتام پر کمپیوٹرز فیل ہو جائیں گے اور دنیا بھر میں کمپیوٹرز پر انحصار کرنے والے تمام ادارے کام کرنا بند کر دیں گے''یوں دنیا تشویش اور پریشانی کا شکار تھی۔اُس وقت صفوت علی نے حساب،فزکس اور کمپیوٹر کے مضامین پر مہارت استعمال کی تھی اور دنیا بھر کو اپنی رہنمائی اور پیشہ ورانہ قدرت سے سکون فراہم کیا تھا۔وہ بہت زیادہ ذمہ داری کا عہدہ تھا۔امریکا میں ہنرمندوں کی کمی نہ تھی۔ذرا تصور کیجیے۔۔۔''لاہور سے امریکا آنے والا ایک نوجوان اُس عہدہ کے لیے چُنا گیا تھا''اُس کے عملہ میں بہت سی خواتین وحضرات ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اُس پروگرام میں ملازمت کے اہل ٹھہرائے گئے تھے۔یہ اعزاز صفوت علی ہی کا حصہ تھا کہ اُس نے بہت عمدگی سے قیادت کا حق ادا کیا تھا۔اُس قیادت نے صفوت کو ایک سدا بہار عزم عطا کیا تھا۔اُس عزم میں درشتی نہ تھی۔مسکراہٹ تھی۔وہی مسکراہٹ بعد میں اُس کے چہرہ کی ایک مستقل پہچان بن گئی تھی۔وہ سنجیدہ کلام بھی سناتا تھا تو وہ مسکراہٹ اُس کے چہرہ پر کھیلتی رہتی تھی۔مجھ سے بہت سے احباب نے پوچھا ہے''مامون بھائی!آپ کا یہ دوست مسکراتا رہتا ہے،کیوں؟میرا جواب''یہ ایک محبتی آدمی ہے۔اس کی مسکراہٹ ہر آن احباب کو محبت کا پیام دیتی رہتی ہے۔''نمازِ جنازہ کے بعد ہر آنکھ نے دیکھا تھا کہ صفوت کے چہرہ پر وہ ٹریڈ مارک مسکراہٹ موجود تھی،اس کے چہرہ کو روشن کر رہی تھی۔واہ صفوت واہ۔مستقل مزاجی ہو تو ایسی ہو۔

نیویارک شہر کے ادبی منظر نامہ میں تین احباب کو انگریزی طرزِ نگارش پر خوب دسترس حاصل تھی۔ڈاکٹر مظفر شکوہ اور ڈاکٹر صفوت علی۔تیسرے بندہ کا نام لینا یوں ممکن نہیں کہ وہ اس زبان کی تدریس سے رزقِ حلال کماتا ہے۔

اردو نثر اور شعر کے علاوہ صفوت کو اسلامی تعلیمات اور قرآن فہمی سے خاص دلچسپی تھی۔وہ گاہے بگاہے Danbury کی مسجد میں جمعہ اور دیگر اہم مواقع پر اردو اور انگریزی میں تقریر کیا کرتا تھا۔نیز انٹرفیتھ سے متعلق جلسوں میں بھی وہ دیگر مذاہب والوں کے سامنے انگریزی زبان میں تقریروں سے،سامعین کو اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرتا تھا،اس انداز سے کہ باہمی دُوریاں اور غلط فہمیاں ختم ہوں،نفرت،شک اور علاقائی ونسلی تعصّبات کے بادل چھٹیں اور قُرب، آشنائی اور اعتبار واعتماد کی فضا قائم ہو۔صفوت کا دینی عقدہ واضح تھا لیکن وہ دوسرے عقیدوں کی تقاریب میں بھی بہت اہتمام سے شرکت کرتا تھا۔واہ صفوت واہ!

صفوت نے اردو ادب کو تین کتابیں پیش کیں۔مثنویِ وقت،مثنویِ رسولؐ اور سوادِ حور۔نوعیت کے اعتبار سے مثنویِ وقت کو اردو ادب کی تاریخ میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے کہ اس کتاب سے پہلے،وقت کے موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔مثنویِ رسولؐ کا اسلوب بھی منفرد ہے۔صفوت کی دو کتابیں انگریزی زبان میں بھی ہیں۔Tiambac اور Mars۔یہ دونوں کتابیں منقولات میں نہیں،معقولات کی مد میں آتی ہیں اور صفوت کی ژرف نگاہی کا اعلان کرتی ہیں۔واہ صفوت واہ!

صفوت کے والدین کا تعلق خیر آباد کے ایک فاروقی گھرانہ سے تھا۔ یوں وہ ہندوستان کا دم بھرتا تھا لیکن اس کے بچپن اور نوجوانی کے دن لاہور میں گزرے تھے۔ یوں وہ پاکستان پر فدا تھا۔ صفوت کی جوانی امریکا کی باہوں میں سُرخرو ہوئی تھی۔ وہ امریکی شہریت رکھتا تھا۔ وہ امریکی تہذیب کی فراخ دلی کا قدر دان تھا۔ اُسے امریکا بھی خوب عزیز تھا۔ تین ملکوں میں بٹ جانے والا صفوت خود کو کسی خول میں بند کر لینے کا روادار نہ تھا۔ واہ صفوت واہ!

آسمانی ستاروں اور سیّاروں سے خاص شغف رکھنے والا صفوت، ہُنر دوست داری سے بھی خاص شغف رکھتا تھا۔ اس کی شناسائی تو بہت سے ادبی وغیر ادبی احباب سے تھی، لیکن اس کے قریبی، ادبی/صحافتی احباب میں، انجم و خلیل الرحمان (مدیران ہفت روزہ اردو ٹائمز، نیویارک شہر) ڈاکٹر عبدالرحمان عبؔد، وکیل احمد انصاری، احمد خلیل چودھری، رئیس وارثی، ڈاکٹر یحییٰ نشیط سیّد، غلام مرتضیٰ راہی اور ف۔سین۔ اعجاز (مدیر، رسالہ انشاء، کولکتہ) کے نام نسبتاً نمایاں تر ہیں۔ شاعر زاہد سعید اور شاعرہ فرحت زاہد سے صفوت اور فوزیہ کا رشتہ گھریلو نوعیت کا تھا۔ اردو ٹائمز میں صفوت کے کالمز برسوں ''فکرِ فردا'' کے عنوان سے چھپتے اور انشاء کو صفوت کا مختلف النوع کلام باقاعدگی سے چھاپنے کا اعزاز ملا۔ ذرا غور کیجیے امریکا کی بے حد مصروف زندگی، ریاست کنے ٹی کٹ، نیویارک شہر اور کولکتہ اور کہاں صفوت علی۔ اس ضمن میں گلزار جاوید صاحب کا نام بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے مثنویِ وقت کے ابتدائی ابواب اپنے مقتدر رسالہ چہارسو میں چھاپ کر ادب نوازی کا حق ادا کیا تھا۔ بعدہٗ صفوت کا کلام اس رسالہ میں باقاعدگی سے چھپتا رہا تھا۔ ان احباب، اخبار اور سالوں سے صفوت کا تعلق تحریروں تک محدود نہ تھا صفوت نے ان سب سے دوست داری کا حق بھی ادا کیا تھا۔ واہ صفوت واہ!

مجھ سے صفوت کا رشتہ دوسروں سے الگ نوعیت کا تھا۔ نیویارک شہر کے ایک اعلیٰ شائق ادب، حضرت سلطان محمود خان صاحب (اب مرحوم) ٹمپل یونیورسٹی، فلاڈیلفیا میں صفوت کے ساتھ تھے۔ خان صاحب موصوف نے صفوت کو مجھ سے متعارف کرایا تھا۔ صفوت اُس وقت شعر نہ کہتا تھا۔ بعدہٗ اُس نے میرے ساتھ مشاعروں میں بہ حیثیت سامع شرکت کرنا شروع کی۔ اس کا جوہرِ شعر گوئی چمکا تو اُس نے ڈاکٹر مظفر شکوہ صاحب (مرحوم) کی شاگردی اختیار کی۔ مجھ سے اُس کا رشتہ شخصی بھی تھا، ادبی بھی تھا اور گھریلو بھی تھا۔ اُس کی پانچوں کتابیں میری نگرانی میں شائع ہوئی ہیں۔ وہ اپنے مسودات یہ کہہ کر مجھے دے دیتا تھا ''مامون بھائی! ذرا دیکھئے'' میں اُس کا استاد تھا اور نہ ہی وہ میرا شاگرد تھا۔ ہم دونوں میں ''بڑے، چھوٹے'' کا ایک رشتہ تھا۔ وہ مجھے بڑا مانتا تھا۔ وہ مجھے فون کرتا تھا تو میرے ہیلو کہنے پر نہایت ادب کے ساتھ ایک پُر مزاح سوال کرتا تھا۔۔۔ ''علامہ مامون ایمؔن صاحب تشریف رکھتے ہیں؟'' ہماری باہمی گفتگو میں، اردو زبان وادب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اُس کی عام گفتگو میں اِدھر اُدھر کے ''چٹکلے'' بھی ہوتے تھے کہ صفوت کا مزاج خشک نہ تھا۔ واہ صفوت واہ!

صفوت نامی یہ ہر دل عزیز شخص اپنی زندگی کے بیش تر شعبوں کی پذیرائی میں کامیاب تھا۔۔۔ ماں اور باپ کی شفقت کا ترسیدہ بیٹا، دل دادہ شوہر، ایک بیٹے اور تین بیٹیوں کا شفیق باپ، دو ننھے منّے، پیارے پیارے نواسوں کا جی جان سے قربان نانا، دین پسند کلمہ گو، احباب کا پُر خلوص حبیب، طرح دار، دل نواز شخصیت کا حامل۔

صفوت نے دیارِ غیر کو اپنا دیار بنایا اور اپنی زندگی کو محنت، توجہ، تن دہی اور ربّ العزت کے احسان و کرم سے خود کو بھیڑ میں تنہا و ممتاز نظر آنے کی سعی میں کامیاب ٹھہرایا، زندگی کو بامعنی و بامقصد صورت دی، دینی عقیدہ سلامت رکھا اور دُنیاوی معاملات سے وابستہ سفر کی راہ کو سراب نہ بننے دیا۔ واہ صفوت واہ!

Y2K نامی منصوبہ سے فراغت کے بعد صفوت نے فزکس، حساب، کمپیوٹر اور علمِ نجوم سے بالکل الگ ایک میدان میں قدم رکھا۔ اُس نے بوڑھے/بیمار مردوں اور عورتوں کی رہائش اور نگہداشت کرنے والے کئی ادارے ''Old People's Homes'' کھولے۔ یوں وہ رزقِ حلال کی فراہمی کے ساتھ ساتھ توجہ اور کرم گستری کے طالب و خواہاں، مجبور و بیمار عوام الناس کی خدمت کا اہل ٹھہرا۔ یہ ادارے انتظامیہ کے ضمن میں، صفوت کو رات، دن مصروفِ کار رکھتے تھے۔ اِدھر جا، اُدھر جا، یہ دیکھو، وہ دیکھو، اس سے رابطہ کر، اُس سے رابطہ کر۔ یہ معاملہ سلجھا، وہ معاملہ سُلجھا وغیرہ۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسے روزانہ ڈھائی، تین سو میلوں کی ڈرائیونگ لازماً کرنا پڑتی تھی۔ وہ مجھ سے کہتا تھا ''مامون بھائی! یہ ذمہ داریاں میری جان کے دَرپے ہیں۔'' ایک طرف شوگر کا موذی مرض، دوسری طرف دل کا جان لیوا عارضہ۔ صفوت نے اُن امتحانات کا مقابلہ پوری ہمّت سے کیا۔ وہ بہر حال گوشت، پوست کا بنا ایک انسان تھا۔ اُس کے لیے اُن امتحانات کا مزید مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ بے چہرہ موت بھی باچہرہ سانسوں کا تواتر روکنے کے لیے لحہ مقرر کی خاموشی نواز صدا لیے، صفوت کے دروازہ حیات پر دستک دینے کے لیے بے قرار تھی۔ موت جیت گئی اور صفوت ہار گیا۔ آہ صفوت، آہ!

بہت سے افراد رب کے وجود کا انکار کرتے ہیں، ممکن استدلال اور ثبوت کے ساتھ۔ ایسے افراد مجوّزہ انکار میں شک اور شبہ کے عوامل کی گنجائش نہیں رکھتے، لیکن دنیا نے آج تک ایسا کوئی فرد نہیں دیکھا جو موت کو ایک حقیقت نہ مانتا ہو، موت کو برحق و ناگزیر نہ جانتا ہو۔

بلاشبہ موت اپنا کام کسی نہ کسی بہانے سے پورا کر لیتی ہے۔

اب صفوت ہم میں موجود نہیں۔ شمالی امریکا ایک عمدہ انسان، قابل تخلیق کار اور پیشہ ور شخص سے محروم ہوا ہے۔ اے ربّ العزّت! صفوت علی کو اپنی امان میں رکھ۔ آمین ثم آمین۔

☆

صبح دم میں نے جو دیکھا

ڈاکٹر ایس۔ایم۔معین قریشی
(کراچی)

کہا جاتا ہے کہ شادی ''کچھ دو، کچھ لو'' کے اصول پر تادیر قائم رہتی ہے۔مراد یہ ہے کہ مرد دیتا رہے اور عورت لیتی رہے۔تاہم بعض شادیاں مرد کی مسلسل مالی، جسمانی اور جذباتی ''سرمایہ کاری'' کے باوجود کامیاب نہیں ہوتیں اور پاکستان کی اسمبلیوں کی طرح یکلخت ٹوٹ جاتی ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ جوڑے آسمانوں میں بنتے ہیں تو پھر جرمنی کے کاشت کار وولفانگ زوبر (Wolfang Zober) کو چاہیے تھا کہ اینڈی وکٹوریہ(Andy Victoria) کو بلاچون وچرا قبول کر لیتا جس سے اس نے انٹرنیٹ پر محبت کے نتیجے میں شادی کی تھی۔55 سالہ زوبر بڑی سادگی سے کہتا ہے''میں زیادہ عورتوں سے نہیں ملتا اس لیے کہ میرا بیشتر وقت اپنے کھیتوں پر گزرتا ہے۔لیکن جب ایک دن ''نیٹ چیٹنگ'' کے دوران میں نے اینڈی کو اپنے مانیٹر پر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔دل قابو میں نہ رہا اور اس کے بعد دماغ میں ہر وقت اینڈی کا خیال کلبلانے لگا۔''

کنوارے زوبر نے پہلی بار محسوس کیا کہ زندگی کھیت کھلیان ،ڈھورڈنگر، ٹریکٹر اور ٹیوب ویل سے بڑھ کر ایک ایسی ''کشش ثقل'' کا نام بھی ہے جسے جنسی کشش سے تعبیر کیا گیا ہے۔کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر نیوٹن کے سر پر گرنے والا سیب اس کے خیالات کو منتشر نہ کر دیتا تو وہ اسی (جنسی) کشش کا کوئی اچھا سا قانون دریافت کرتا۔(بعد میں یہ فرضِ کفایہ بے چارے فرائڈ کو ادا کرنا پڑا۔) زوبر کی حالت ایک پاکستانی گیت کے بولوں کی تذکیر کر کے یوں بیان کی جاسکتی ہے:

آپ سے پہلے نظر میں کچھ نہ تھا اپنے سوا
اب جدھر بھی ''دیکھتا'' ہوں جلوہ فرما آپ ہیں

زوبر نے اپنی بے خودی (جو بے سبب نہیں تھی) کا ذکر اپنے ایک دوست سے کیا تو اس نے مشورہ دیا کہ تم دونوں کو اب اپنے اپنے اسکرین سے باہر نکل آنا چاہیے۔چنانچہ زوبر نے اپنی الیکٹرانک محبوبہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔شاید دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔اینڈی نے رضا مندی کا اظہار کر دیا۔چنانچہ ان کی ملاقات زوبر کے قصبے نیومبری کے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں ہوئی۔زوبر کے لیے یہ بات انتہائی باعث اطمینان ومسرت تھی کہ انٹرنیٹ پر قائم ہونے والے اکثر تعلقات کے برعکس،اس نے اینڈی کو جیسا اپنے کمپیوٹر کے مانیٹر پر دیکھا تھا حقیقت میں بھی اسے ویسا ہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ پایا۔اسے اس انتخاب پر ناز تھا کہ وہ اپنے عزیز واقارب اور دوست احباب کو بتا سکے گا۔

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
(فیضؔ)

البتہ اینڈی کے اس انکشاف پر اس کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا کہ وہ دو بچوں کی ماں ہے جو اس کے متروک اور مفرور ''بوائے فرینڈ'' سے ہیں۔زوبر نے اس ''خامی'' کو نظر انداز کر دیا کیوں کہ وہ خود اینڈی سے عمر میں 18 سال بڑا تھا۔پھر اینڈی کے خدوخال، عادات واطوار، حسب نسب، مالی حالات سب کچھ اسے دیوانہ بنانے کے لیے کافی تھے۔

مغرب میں جوڑے کئی انداز سے باہم ''فیض رسانی'' کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ایک صورت دوستی کی ہے۔دونوں ایک دوسرے کے دوست کہلاتے ہیں اور چونکہ دوستوں کے درمیان کوئی پردہ اور تکلف نہیں ہوتا لہٰذا مشترکہ رضامندی سے جب چاہتے ہیں ''من تُو شدم،تُو من شدی'' کے درجے پر فائز ہو جاتے ہیں اور جب دل بھر جاتا ہے تو پورے خلوص کے ساتھ ''تو نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی'' کے آزمودہ اصول پر عمل کرتے ہیں۔دوسری صورت بغیر نکاح کے میاں بیوی کی حیثیت سے ساتھ رہنے کی ہے۔فریقین آپس میں ''سماجی شراکت دار'' (Social partners) کہلاتے ہیں۔ان تعلقات پر شراکت داری کے آفاقی قانون کا اطلاق ہوتا ہے یعنی کوئی بھی فریق الگ ہو کر ''کمپنی'' توڑ سکتا ہے۔کسی پر کوئی سماجی یا معاشی ذمے داری نہیں آتی۔دونوں کی راہیں اور منزلیں مختلف ہو جاتی ہیں اور اس طرح کہ ع نہ گلہ ہے دوستوں کا،نہ شکایتِ زمانہ۔

تیسری صورت، جس کی نوبت شاذونادر ہی آتی ہے،شادی کی ہے جسے وہاں کے بعض دقیانوسی خیالات کے لوگ اب بھی کبھی کبھار اپنا کر اپنے پچھتاوے کا سامان کر لیتے ہیں۔مغربی ملکوں میں ساٹھ سے ستر فی صد شادیاں طلاق پر منتج ہوتی ہیں۔مرد کے لیے شادی سے زیادہ مہنگی طلاق پڑتی ہے۔اس مظلوم کو شادی کا واحد فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ''لغت'' کچھ بہتر ہو جاتی ہے ورنہ اسے اپنی آزادی کے لیے بھاری رقم بطور ''تاوان'' سابقہ بیوی کو دینی ہوتی ہے۔ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ ''شرعی مہر'' منہ پر مارا اور ایک دو تین کر کے بیوی سے جان چھڑالی یا ایسے حالات پیدا کر دیے کہ وہ بے چاری ''بتّیس روپے'' سے بھی دست بردار ہو کر خلع حاصل کر لے۔

زوبر اور اینڈی کے رومانوی تعلقات (Love affairs) میں دونوں جانب سے سنجیدگی اور شائستگی کا مظاہرہ ہوا اور انہوں نے براہ راست شادی کا فیصلہ کر لیا۔مشہور انگریز ادیب آسکر وائلڈ کا بھی یہی خیال تھا۔بقول اس کے

''میں طویل عرصے کی منگنی وغیرہ کا قائل نہیں۔اس سے طرفین کو موقع ملتا ہے کہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیں اور سمجھ لینے کے بعد کوئی نا سمجھ ہی شادی کی حماقت کرسکتا ہے۔''اس جوڑے نے جزائر بہاماز میں ہنی مون کا پروگرام بنایا۔اینڈی کو اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ تردد تھا جسے زوبر نے یہ یقین دلا کر دور کردیا کہ وہ انہیں اپنے بچوں جیسا پیار دے گا۔شادی سے پہلے اس پہلی اور آخری ملاقات کے بعد اینڈی اور زوبر ایک دوسرے سے گرم جوشی سے بغلگیر ہوئے اور مغرب کے بقیہ'' آدابِ رخصتِ محفل'' بھی کماحقہٗ نبھائے۔پھر دونوں شادی کے انتظامات میں مصروف ہوگئے۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔زوبر چونکہ پہلی اننگز کھیلنے والا تھا اس لیے اس کی طرف سے دھوم تھی اور اینڈی کی طرف سے صرف'' دھام''! زوبر کے والدین بہت خوش تھے کہ ان کے بیٹے نے دیرآید درست آید کے بمصداق بالآخر ازدواجی زراعت کی فکر بھی کرلی۔زوبر نے بتایا کہ عروسی جوڑے میں اینڈی کسی حور پری سے کم نہیں لگ رہی تھی۔وہ کیوں کم لگتی ؟اس کے دل کی انجمن میں بھی تو کوئی حُسن بن کے آرہا تھا۔دونوں نے پادری سے دعائیں اور دوستوں سے تحائف وصول کیے اور خوشی خوشی چرچ چھوڑا۔سب کچھ ٹھیک جارہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد یہ جوڑا گھر پہنچا تو... آندھیاں غم کی یوں چلیں، باغ اجڑ کے رہ گیا۔مغرب میں گھونگھٹ تو اٹھایا نہیں جاتا اس لیے کہ ڈالا ہی نہیں جاتا۔دولھا دلھن ان تکلفات کے بغیر ہی عقد کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کر لیتے ہیں لیکن وہاں ''حجلہ عروسی'' میں کچھ ایسا ہوگیا کہ اینڈی پر رات اور زوبر پر اینڈی بھاری ہوگئی۔اگلے روز اینڈی نے جب اس گھر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا تو اس طرح کہ

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہاہے کوئی شب غم گزار کے

یہ کایا کیوں پلٹ گئی؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ:

☆ اینڈی نے کوئی ناجائز مطالبہ کردیا تھا؟

☆ زوبر پر اینڈی کی کوئی موذی بیماری آشکارا ہوگئی تھی؟

☆ اینڈی نے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی جس سے زوبر یا اس کے گھر والوں کے جذبات مجروح ہوئے؟

☆ اینڈی نے زوبر کے ساتھ کسی قسم کے عدم تعاون یا کسی عارضی ''فنی خرابی'' کا اظہار کیا تھا؟

☆ زوبر کو اینڈی کے مزاج، اخلاق یا کردار کے بارے میں کوئی شکایت پیدا ہوگئی تھی؟

ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔اس تعلق کے ٹوٹنے کی ایک اور صرف ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ جب بھولے بھالے زوبر نے وصل کی منزل کی جانب ''مثبت پیش رفت'' کی تو اس نے دیکھا کہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں، لطف و کرم، عجز وانکسار، خلوصِ نیت، خودسپردگی اور خاکساری کے باوجود اینڈی بھی اسی کی طرح بلکہ اس سے جوان تر 37 سالہ مرد تھا!وہ جہیز میں آئے ہوئے بچوں کی ماں نہیں بلکہ باپ تھا۔شادی کے دوسرے دن جب زوبر کے دوست احباب (حسبِ دستور) حجلہ عروسی کا آنکھوں دیکھا حال سننے کے لیے بے تاب تھے تو اس نے آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان انہیں بتایا'' جب اینڈی نے مجھ سے کہا کہ وہ اینڈی وکٹوریہ نہیں بلکہ ولیم ٹیری ہے تو میری کمر تلے سے بستر کھسک گیا۔وہ کُتا مجھ سے نیٹ پر ''چٹینگ'' نہیں بلکہ ''چیٹنگ'' کیا کرتا تھا۔اُس کمینے نے شادی کا ڈھونگ اس لیے رچایا تھا کہ وہ تصویر کا'' دوسرا رخ'' بھی دیکھنا چاہتا تھا۔میرے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں۔''

ہمارے ایک بزرگ مزاح گو (تشنہ بریلوی مرحوم) نے اس داستانِ الم کو چار مصرعوں میں یوں رقم کیا:

دوستو! وصل کی شب اک تماشا نکلی
میری دُلھن مری زوجہ بھی عجوبہ نکلی
رات تو ہم نے گزاری بڑے ارمانوں سے
صبح دم میں نے جو دیکھا تو وہ لڑکا نکلی

اور اس پورے ڈرامے کو کراچی والوں کے مشہور آٹھ لفظی محاورے میں یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ: کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے!

- بقیہ -

شجر کے طیور

عمر بھر ایک شجر پر کہاں رہتے ہیں طیور
ان کی فطرت میں ہے اشجار بدلتے رہنا
لرز رہا ہے اندھیروں کے خوف سے شاید
چراغِ راہ اُجالوں سے ہار جائے گا
غریبِ شہر مسلسل بھٹک رہا ہے یہاں
امیرِ شہر کی برسوں سے رہ نمائی ہے
اہلِ دانش میں اک ایسا بھی قبیلہ ہے سروش
بیچ دیتا ہے زباں بھی جو خیالات کے ساتھ
عاری ہے جب وہ جذبہ واحساس سے تو پھر
اپنی زباں سے اس کی میں تذلیل کیا کروں
ہمیشہ رشتہ رہے گا تُم سے
نجومیوں کے حساب میں تھا

☆

ایک صدی کا قصّہ
نرگس

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

دلیپا بائی الہ آباد کی ایک مشہور طوائف تھی۔ وہ خاندانی طوائف نہیں تھی بلکہ ایک اچھے خاصے برہمن گھرانے کی نژاد تھی جسے رنڈی خانوں کے دلال گھر سے اغوا کر کے لے گئے تھے اور اُسے کوٹھے کی زینت بنا دیا تھا۔ اُسکے کوٹھے پر بڑے بڑے لوگ آجایا کرتے تھے جن میں ایک موتی لال نہرو بھی تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جس بچی کو اُس نے بنارس میں جنم دیا وہ موتی لال نہرو کی ناجائز اولاد تھی۔ اس بچی کا نام جیا دیوی رکھا گیا۔ دیپا بائی اپنی بچی کو لے کر الہ آباد سے کلکتہ منتقل ہوئی جہاں ہندوستان کے بہترین ٹھمری گلوکار محی الدین خان کی نگرانی میں اُسنے کلاسیکل سنگیت کی ٹریننگ لی۔ جب وہ جوان ہوئی تو ایک عمر رسیدہ گجراتی بیوپاری نروتم داس کا اُس پر دل آگیا۔ اُس نے جیا دیوی سے شادی کر ڈالی۔ اس شادی سے اُنکا ایک بیٹا ہوا۔ یہ شادی زیادہ دنوں تک نہیں چلی۔ جیا دیوی کو اپنے گروپ میں ہارمونیم بجانے والے سازندے میر خان سے پیار ہو گیا۔ دونوں نے نکاح کر ڈالا۔ یہاں سے جیا دیوی کا نام بدل کر جدن بائی ہو گیا۔ اس شادی سے بھی اُنکا ایک بیٹا ہوا جس کا نام اُنہوں نے اختر حسین رکھ دیا۔ بڑے بیٹے کا نام انور حسین رکھ دیا گیا۔ یہ شادی بھی بہت جلد ٹوٹ گئی۔ اسکے بعد جدن بائی کی ملاقات ایک رئیس زادے اُتم چند موہن چند سے ہوئی جو کہ راولپنڈی کے موہیال تیاگی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جدن بائی ایک طوائف کی بیٹی تھی۔ رئیس زادوں کو پھانسنے کے سبھی گر وہ اچھی طرح سے جانتی تھی۔ موہن بابو اُسکے دام الفت میں ایسا پھنس کر رہ گئے کہ اُسکے گھر والوں نے اُسے نہ صرف اپنے خاندان سے الگ کر دیا بلکہ جائیداد سے بھی عاق کر دیا۔ موہن بابو جو ڈاکٹر بننا چاہتے تھے وہ جدن بھائی کے عشق میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ اُنکی چاہت میں نہ صرف ڈاکٹری قربان کی بلکہ اُنہوں نے اپنا دھرم تیاگ کر اسلام قبول کر لیا اور اپنا نیا نام عبدل رشید رکھ دیا۔ ایک جون 1929ء کو کلکتہ میں اُنکے یہاں ایک بیٹی کا جنم ہوا جس کا پہلے تجشوری نام رکھا گیا۔ بعد میں یہ نام بدل کر فاطمہ رشید رکھ دیا گیا۔ جدن بائی بڑی رنگین عورت تھی۔ جس زمانے میں ہیروئنیں کوٹھوں سے آجایا کرتی تھیں اُسی زمانے میں اُس نے بھی اس چکا چوند بھری دنیا میں قدم رکھا۔ اُسنے اپنے فلمی سفر کی شروعات اداکارہ کے طور پر کی۔ اُسکے بعد اُسنے اپنی فلم کمپنی کھولی جس کا نام ''سنگیتا موی ٹون'' رکھا گیا۔ اس بینر کے تحت اُسنے چار فلمیں بنائیں۔ اُسنے ہدایت کاری اور موسیقاری پر بھی اپنے ہاتھ آزمائے۔ جب شوبھنا سمرتھ اور دیوکا رانی جیسی اچھے اور متمول گھرانوں کی اداکاروں نے فلمی دنیا میں قدم رکھا تو طوائفوں کے دن لد گئے۔ جدن بائی بھی گوشہ گمنامی میں چلی گئی۔ عادتیں شاہانہ تھیں۔ آمدنی صفر کے برابر تھی۔ ایسے میں وہ کیسے جئیں۔ فلمی دنیا میں لوگ اُسے جانتے تھے۔ اُس نے جوڑ توڑ کر کے ایک اور فلم بنائی جس کا نام ''تلاش حق'' تھا۔ جس میں جدن بھائی نے نہ صرف یعقوب کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا بلکہ اس فلم کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔ 1935 میں ریلیز ہونے والی فلم ''تلاش حق'' میں اُسنے اپنی چھ سال کی بچی کو بھی ایکٹنگ کرنے پر مجبور کیا۔ ہر انسان کی طرح اس بچی نے بھی کئی ایک خواب اپنے من میں سجا کے رکھے تھے۔ وہ بڑی ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ لوگوں کی سیوا کرنا چاہتی تھی پر اُسکی ماں نے اُسکے سبھی خواب روند ڈالے۔ اس فلم کی ریلیز سے پہلے فاطمہ رشید کو ایک نیا نام دیا گیا۔ بی بی نرگس۔ فلم تو نہیں چلی البتہ نرگس نے اپنی پہلی فلم سے ہی فلم بینوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

نرگس اب اُنکی روٹی روزی کا وسیلہ بن کر رہ گئی تھی۔ ''تلاش حق'' کے بعد اُسنے ایک اور فلم کی جس کا نام ''تمنا'' تھا۔ اس فلم کو چمن لال ترویدی نے پرڈیوس کیا تھا اور اسکے ہدایت کار تھے مجمدار۔ یہ فلم بھی کچھ خاص کامیاب نہ رہی تاہم اس میں بی بی نرگس کو خوب پسند کیا گیا۔ نرگس لڑکپن سے عنفوان شباب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک دن محبوب خان کی طرف سے نرگس کو بلاوا آگیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ محض چودہ سال کی ایک نازک سی کلی تھی، فلم ساز و ہدایت کار محبوب خان نے اُسے اپنی فلم ''تقدیر'' کے لئے اُس زمانے کے قد آور اداکار موتی لال کے سامنے بطور ہیروئن کھڑا کر دیا۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو فلم بین اس نوخیز اداکارہ کی اداکاری دیکھ کے دانتوں تلے اُنگلی دبا کر رہ گئے۔ اُسنے ایک نابالغ لڑکی ہونے کے باوجود اپنی عمر سے بیس سال بڑے مرد کے ساتھ جس نفاست اور پراعتمادی کے ساتھ کام کیا تھا۔ اُسے دیکھ کے فلمی پنڈت بھی عش عش کر اُٹھے۔ اس فلم نے نرگس کی تقدیر ہی بدل کے رکھ دی۔ نرگس کی نکہت ونزہت ہر اور پھیلنے لگی۔ اُسے دھڑا دھڑ فلمیں ملنے لگیں۔

نرگس ایک آزاد خیال لڑکی تھی۔ وہ دوسری ہیروئینوں سے قدرے مختلف تھی۔ اُسنے باغیانہ طبعیت پائی تھی۔ وہ اُس دور میں عہد شکنی پر اُتر آئی تھی جب کہ ہندی فلموں کی زنانہ اداکارئیں ہیرو سے دس گز دور رہا کرتی تھیں۔ وہ کیمرے کے سامنے ہوں یا کیمرے کے پیچھے وہ ہر دم روایتی لباس میں نظر آتی تھیں اور ہر فریم میں آدرش وادی دکھائی دینے کی کوشش کرتی رہتی تھیں۔ وہ نوخیز ہیروئن ایسی تھی جس نے اس خول کو توڑ کر قدامت پسند روایتوں کی دھجیاں اُڑا دیں۔ اُسنے نہ صرف اپنے بال چھوٹے کروائے بلکہ سیلیکس اور ٹی شارٹ پہن کر وہ بے خوف گھوما کرتی تھی۔ اُس نے بڑی بیباکی اور نڈرتا کے ساتھ ایسے رومانی مناظر ادا کئے جنہیں ادا کرنا تو دور سوچتے ہوئے بھی دوسری ہیروئنوں کو لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

سن 1945 میں اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''ہمایوں''، ''بیسوی صدی'' اور ''رامائنی''۔ 1946 میں اُسی کے نام پر بنی فلم ''نرگس'' اور 1947 میں ''مہندی''۔ اُسکی زندگی کا خوشگوار دور شروع ہو چکا تھا۔ سبھی ٹاپ کے ہیرو اُسکے ساتھ کام کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ جدن بائی کے گھر میں ہن برسنے لگا تھا۔

1948 میں دلیپ کمار کے ساتھ اُسکی پہلی فلم ''میلہ'' ریلیز ہوئی۔ جس نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دئے۔ 1948 میں اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''انوکھا پیار''، ''انجمن'' اور'' آگ''۔'' آگ'' کچھ خاص نہ چلی البتہ راج کپور اور نرگس ایک دوسرے کے بیحد قریب آ گئے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب راج کپور جدو جہد کے دور سے گزر رہا تھا۔ اُسنے اپنا بینر کھڑا کیا تھا جس کے تحت اُسنے پہلی فلم '' آگ'' بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُسنے ابھی تک اپنی کوئی پہچان نہ بنائی تھی۔ وہ پرتھوی راج کپور کے صاحبزادے کے طور پر جانا جاتا تھا۔ راجکپور کے لئے اب سب سے بڑا مسلہ اداکاروں کا چناؤ تھا۔ کوئی بھی ہیروئن اس ناتجربہ کار ہدایت کار کے ساتھ کام کرنے کے لئے راضی نہیں تھی۔ ایک دن وہ ایک اداکارہ کا پتا پوچھتے پوچھتے غلطی سے نرگس کے گھر تک پہونچ گیا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس بنگلے میں اُس کی قسمت چھپی ہے۔ جب اُسنے کال بیل بجائی تو دروازہ خود نرگس نے کھولا۔ وہ اُسوقت پکوڑے تل رہی تھی۔ اُسکے ہاتھ بیسن کے آٹے سے اٹے پڑے تھے۔ اُسنے جب ایک خوبرو نوجواں کو اپنے سامنے پایا تو اُسنے غصے میں پوچھا کہ اُسے کیا چاہیے۔ راج کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ الفاظ جیسے حلق میں جا کر اٹک گئے تھے۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پایا بس وارفتگی سے نرگس کو دیکھتا رہ گیا۔ نرگس نے تنگ کر اپنے بالوں کی بکھری لٹ کو پیچھے کر دیا تو اُسکے بالوں پر بیسن کا آٹا لگ گیا۔ برسوں بعد اُسنے یہ سین من وعن اپنی فلم ''بوبی'' میں پیش کیا۔ یہ پہلی ملاقات راج کپور کے لئے خوش آئندہ ثابت ہوئی۔ اُسنے جدن بائی کو قائل کر کے نرگس کو اپنی پہلی فلم '' آگ'' میں کام کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ساتھ ہی اُسنے کامنی کوشل اور اپنے سالے پریم ناتھ کو بھی اس فلم میں کاسٹ کیا۔ یہ راج کی پہلی فلم تھی جسمیں وہ خود ہی پرڈیوسر تھا، خود ہی ہدایت کار تھا اور خود ہی ہیرو تھا۔ فلم بری طرح پٹ گئی۔ اس فلم کی ناکامی سے راج کپور نے ہمت نہیں ہاری۔ اُسنے دوسری فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ راما نند ساگر نے اسے ایک لو اسٹوری سنائی جو اسے بیحد پسند آ گئی۔ اُسنے اس کہانی پر اگلی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ '' آگ'' کی ناکامی کے بعد کوئی بھی ہیروئن اُسکے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار نہ تھی سوائے نرگس کے۔ اسی بیچ اُسنے ایک نئی لڑکی نمی کو ''برسات'' میں نرگس کے ساتھ پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''برسات'' جب ریلیز ہوئی تو اُسنے بزنس کے سبھی ریکارڈ توڑ دئے۔ نرگس اور راج کپور کی جوڑی فلم بینوں کی محبوب جوڑی بن گئی۔ اس فلم نے فلمی دنیا کو موسیقار شنکر جے کشن اور گیت کار شیلندر اور حسرت دئے، جن کے گانوں اور سنگیت نے ملک بھر میں دھوم مچائی۔ اس فلم کا گانا ہوا میں اُڑتا جائے میرا لال ڈوپٹا مل مل کا پورے دیش میں لہرانے لگا۔

اسی سال اُنکی ایک اور فلم ''انداز'' بھی ریلیز ہوئی جسمیں تکونی پریم کہانی تھی جسے محبوب خان نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ اسمیں وہ دلیپ کمار اور راج کپور کے ساتھ جلوہ افروز تھی۔ یہ فلم بھی خوب چلی۔ اس فلم نے راج کپور کو بطور اداکار شہرت کی چوٹی پر پہونچا دیا۔ اس تکونی پریم کہانی میں راج کپور نرگس کا پیار پاتا ہے جب کہ دلیپ کمار ناکامی عشق کے سبب اپنی جان دیتا ہے۔ اس فلم کی فلمبندی کے دوران انکے دل میں پیار کا بیج نمو پا گیا۔ کہتے ہیں نا کہ پیار اندھا ہوتا ہے وہ یہ سب کچھ جان کر بھی کہ راج کپور شادی شدہ ہے اور کئی بچوں کا باپ ہے وہ اُسے اپنا دل دے بیٹھی۔

نرگس راج کپور کے پیار میں ایسے ڈوب چکی تھی کہ اُسکی صبح آر کے اسٹوڈیو سے شروع ہوتی تھی اور آر کے اسٹوڈیو میں ختم ہوتی تھی۔ وہ اپنے محبوب سے ایک پل بھی دور رہ نہیں پاتی تھی۔ اُسکی دیوانگی دیکھ کر جدن بائی کافی فکر مند اور پریشان رہتی تھی۔ اُسنے چاہا کہ دلیپ کمار سے نرگس کی شادی ہو جائے مگر یہ بیل منڈھے چڑھ نہ پائی۔ راج کپور اُنکا جگری دوست تھا۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ بے وفائی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جدن بائی نے اُسے راج کپور کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دیا مگر وہ کہاں کسی کی سننے والی تھی۔ وہ تو فطرت سے باغی تھی۔ گھر والے اُسے راج کپور سے جتنا دور رکھنے کی کوشش کرتے تھے وہ اُسی شدت سے راج کپور کے قریب آتی جا رہی تھی۔ اُسکے گھر والے اُسے راج کپور سے دور رکھنے کے لئے کیا کیا جتن کر رہے ہیں وہ ان ساری باتوں سے بے خبر اپنے پیار کی دنیا میں گم تھی۔

دلیپ کمار کے ساتھ نرگس نے کئی فلمیں کیں جو کہ باکس آفس پر بیحد کامیاب رہیں، جیسے ''جوگن''، ''بابل''، ''ہلچل''، ''دیدار'' اور ''شکست''۔ مگر اُنکے دل میں نرگس کے لئے کبھی وہ احساسات یا جذبات نہیں پیدا ہوئے جو اُنہیں نرگس کی طرف کھینچ سکتے تھے۔ اصل میں وہ خود مدھوبالا کے عشق میں گرفتار تھے اسلئے وہ نرگس کی طرف کبھی اُس نظر سے دیکھ ہی نہیں پائے۔ راج کپور نے کامیابی کا فارمولہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ اُنکی جوڑی کو لوگوں نے پسندیدگی کی سند بخش دی تھی۔ جب 1951 میں نرگس کے ساتھ اُنکی فلم '' آوارہ'' ریلیز ہوئی تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ فلم ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں دھوم مچا دے گی۔ اس فلم کا یہ گانا '' آوارہ ہوں'' سویٹ روس کا دوسرا قومی ترانہ بن کر رہ گیا تھا۔ '' آوارہ'' نے روسیوں کو راج کپور اور نرگس کا دیوانہ بنا ڈالا تھا۔ جب راج کپور اپنی ٹیم کو لے کر سویٹ روس چلے گئے تو اس ٹیم میں نرگس بھی شامل تھی۔ ہزاروں روسی اُنکے خیر مقدم کے لئے اُنکے ہوٹل کے باہر کھڑے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس ہوٹل میں وہ ٹھہرے وہاں کے رجسٹر میں اُنہوں نے اپنا نام مسٹر اور مسز راج کپور درج کیا۔ یہ تھی پیار کی انتہا۔ نرگس راج کپور پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دیکر اُس سے شادی کر ڈالے لیکن راج کپور اُسے ٹالتا جا رہا تھا۔

راج کپور یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ آر کے فلمز کو ملنے والی کامیابی میں نرگس کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس لئے وہ نرگس کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا۔

'' آوارہ'' کی آفاقی کامیابی کے بعد راج کپور نے ''شری چار سو بیس'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہی رنگ، وہی مزاج، وہی چال جو ناظرین کو فلم '' آوارہ'' میں دیکھنے کو ملی تھی۔ اس فلم میں بمبئی کی کالی راتوں کو پردہ سیمیں پر پیش

کیا گیا تھا۔اس فلم کی موسیقی نے فلم کو چار چاند لگائے تھے۔ایک سے بڑھکر ایک گانا۔شنکر جے کشن کے بہترین نغمے اس فلم میں سننے کو ملے تھے۔ایک گانا جس کے ایک شاٹ میں راجکپور نے اپنے تین بچوں کو رین کوٹ پہنے بارش میں بھیگتے ہوئے دکھایا تھا وہ تھا ''پیار ہوا اقرار ہوا۔پیار سے پھر کیوں ڈرتا ہے دل''۔اس گانے کو سن کر ایسا لگتا تھا جیسے دو پریمی اپنا حال دل بیان کر رہے ہوں اسمیں راج کپور نرگس کے علاوہ محبوب کی کھوج نادرہ کو بھی ایک اہم رول میں سائن کیا گیا تھا۔اس فلم نے بھی کامیابی کے ڈنکے بجائے۔

نرگس نے راجکپور کے ساتھ آر۔کے۔بینر سے باہر جو فلمیں کیں وہ سب کی سب کامیاب فلمیں تھیں ۔ان میں ''جان پہچان'' ''امبر'' ''آشیانہ'' ''بے وفا'' ''پاپی'' ''دھن'' اور ''چوری چوری'' تھی۔ ان سبھی فلموں میں اُنکی اداکاری فطری تھی۔فلم ''چوری چوری'' میں تو وہ ہر شاٹ میں پیار کے خمار میں ڈوبے ہوئے نظر آتے تھے۔''چوری چوری'' کا سنگیت بھی شنکر جے کشن نے ہی دیا تھا۔اس فلم کی صدا بہار موسیقی نے ''چوری چوری'' کو مقبولیت کی معراج تک پہونچا دیا تھا۔

نرگس اپنا بیشتر وقت آر۔کے۔اسٹوڈیو میں گزارا کرتی تھی جو کہ چمبور میں ہے۔آر۔کے۔بینر کے لئے اُسنے نرگس کے ساتھ مل کر جتنی بھی فلمیں بنائیں وہ بے پناہ کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ان فلموں نے نہ صرف اُسے ایک اداکار کے طور پر بلکہ ایک کامیاب ہدایت کار اور فلمساز کے اُسے شہرت کی بلندیوں تک پہونچا دیا۔کہا جاتا ہے کہ اس کامیابی کے پس پشت نرگس کا بھی ہاتھ تھا۔نرگس قدم قدم پر اُسکے ساتھ تھی۔آر۔کے فلمز کا جو لوگو تھا وہ بھی نرگس اور راجکپور کا تھا جسے فلم ''آوارہ'' کے ایک شاٹ سے لیا گیا تھا جہاں نرگس کو راجکپور نے کمر سے تھاما ہوا ہے۔جسطرح دلیپ کمار اور مدھو بالا کی جوڑی کو فلم بین خوب پسند کرتے تھے اسی طرح راج کپور اور نرگس کی جوڑی کو بھی ناظرین نے خوب پسند کیا۔انہوں نے جتنی بھی فلمیں ساتھ میں کیں اُن میں انکی فطری اداکاری من کو موہ لیتی تھی۔

شادی کو لے کر راج کپور اور نرگس کے بیچ تناتنی چل رہی تھی۔نرگس کی یہ شرط تھی کہ وہ اپنی پہلی بیوی کرشنا کپور کو طلاق دے دے۔راج کپور کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بات کو ٹال جاتا تھا۔نرگس اتنی معصوم تھی کہ وہ راج کپور کو سمجھ ہی نہیں پائی۔وہ تو اُسے اپنے مفاد کے لئے استعمال کر رہا تھا۔دراصل وہ اپنی بیوی سے الگ ہونے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ ایک دن راج کپور کی زبان پھسل گئی۔اُس نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ اصلی گھر والی تو وہ ہوتی ہے جو بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ باقی سب ایسے ہی ہوتی ہیں ۔نرگس نے جب یہ انٹرویو پڑھا تو اُس کے دل کو بڑی گہری ٹھیس لگی۔اُسوقت اُس کے پاس کام بھی نہیں تھا۔وہ تو راج کپور کی ہی فلموں میں کام کر رہی تھی۔خوش قسمتی سے اُن ہی دنوں اُسکے پاس محبوب خان کی ''مدر انڈیا'' کی آفر آگئی۔نرگس نے وہ آفر فوراً لپک لی اور راج کپور سے کنارہ کرنے کی کوشش کی۔راج کپور نے اُسے منانے کی انتھک کوشش کی مگر نرگس اسقدر گھائل تھی کہ وہ اُسکے خشوع وخضوع کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئی۔وہ اسقدر مایوس اور دل برداشتہ ہو چکی تھی کہ کئی بار اُسنے خودکشی کرنے کی سوچی۔تقدیر کا کھیل دیکھئے کہ ''مدر انڈیا'' کی شوٹنگ کے دوران وہ آگ میں گھر گئی۔سنیل دت نے اپنی جان جھوکھم میں ڈال کر اُسے بچا لیا۔اس حادثے نے اُسے ایک نئی زندگی دی۔وہ سنیل دت سے پیار کرنے لگی۔وہ جلد سے جلد شادی کے بندھن میں بندھ جانا چاہتے تھے لیکن محبوب خان اُنکے اس فیصلے کے حق میں نہیں تھے۔وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ مدر انڈیا کی ریلیز سے پہلے شادی کے بندھن میں بندھ جائیں۔اُنہیں یہ ڈر تھا کہ اس سے فلم کے بزنس پر کافی منفی اثر پڑے گا کیونکہ اس فلم میں وہ ماں بیٹے کا کردار نبھا رہے تھے۔محبوب صاحب کی فلم اکتوبر 1957 میں ریلیز ہوئی۔''مدر انڈیا'' ایک ایسی فلم ہے جو نرگس کے فلمی سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اتنی دمدار اور فطری اداکاری کے سبب نرگس نے اداکاری کے معراج کو چھو لیا تھا۔اس فلم نے اُسے دنیا کی بہترین اداکاروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔اس فلم کے لئے اُسے بے شمار اعزازات سے نوازا گیا۔اُسے حکومت ہند کی طرف سے بہترین اداکارہ کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔اسی طرح فلم فیر ایوارڈ میں بھی اُسے بہترین اداکارہ کے طور پر اعزاز سے نوازا گیا۔اس فلم کی ریلیز کے چار پانچ ماہ بعد یعنی نرگس اور سنیل دت 11 مارچ 1958 کو ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔

سنیل دت سے شادی ہونے کے بعد اُسنے اداکاری کو خیر باد کہہ دیا اور وہ گھر گرہستی کے سپنے سجونے لگی۔مالک نے اُسکی گود بہت جلد بھر دی۔اُسنے تین بچوں کو جنم دیا۔ایک بیٹا اور دو بیٹیاں۔اسی بیچ اُنہوں نے ''اجنتا آرٹس کلچرل ٹروپ'' کو تشکیل دیا۔انہوں نے کچھ نامی کلاکاروں اور گلوکاروں کو اسمیں شامل کر کے سرحدی علاقوں میں فوجیوں کے روبرو کچھ رنگا رنگ پروگرام پیش کئے۔بنگلہ دیش کے معرض وجود میں آنے کے بعد 1971 میں اجنتا آرٹس کلچرل ٹروپ نے ڈھاکہ میں پہلی بار ایک رنگارنگ پروگرام پیش کیا۔اُن کی اس کوشش کو کافی سراہا گیا۔بعدازاں نرگس نے Spastics Society of India نامی تنظیم کی سرپرستی کی۔اُسکی اس بے لوث خدمت کے عوض اُسے 1980 میں راجیہ سبھا ممبر کے طور پر نامزد کیا گیا۔

اُنکا پہلوٹھی کا بیٹا سنجے جوان ہو چکا تھا۔سنیل دت اُسے فلموں میں لانچ کرنا چاہتے تھے۔ماں کا بھی بیٹے کو سینما کے پردے پر دیکھنے کا بڑا ارمان تھا۔سنجے کو لیکر سنیل دت نے فلم ''راکی'' کی فلمبندی بڑے شدومد کے ساتھ شروع کی۔ادھر فلم کی شوٹنگ اختتام پزیر ہونے والی تھی اُدھر نرگس اچانک بیمار پڑ گئی۔ڈاکٹروں نے جب مرض کی تشخیص کی تو پتا چلا کہ نرگس pancreatic Cancer کے موذی مرض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ ہندوستان میں اسکا ہر طرح سے علاج کرنے کی کوشش کی گئی۔جب اُسے کوئی افاقہ نہ ہوا تو سنیل دت اُسے مزید علاج کے لئے امریکہ لے کر گیا۔وہاں بھی نتیجہ کچھ اُمید افروز نہ رہا۔نرگس

دھیرے دھیرے موت کے منہ میں چلی جارہی تھی۔سنیل دت نے اپنی بیوی کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا مگر اُسکی ساری کوششیں ثمر آور ثابت نہ ہوئیں۔2 مئی 1981 کو وہ کوما میں چلی گئی۔ اگلے روز اُس نے اس جہان فانی کو الوداع کہہ دیا۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُسکی موت کے ٹھیک چار روز بعد اُسکے بیٹے کی فلم کا پریمیر تھا۔ یعنی 7 مئی 1981 کو فلم ''راکی'' کا پریمیر شو ہوا۔ وہ جسے بیٹے کو فلمی پردے پر دیکھنے کا بڑا ارمان تھا اپنے دل میں یہ حسرت لئے وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اُسکی روح کی تسکین کے لئے اُسکے لئے تھیٹر میں ایک خالی سیٹ رکھی گئی۔

جب ہندو رسم و ریتی کے مطابق اُسکے آخری رسومات انجام دئے جا رہے تھے تبھی سنیل دت باہر آگئے اور اُسنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے کہا کہ نرگس شمشان نہیں جائے گی بلکہ وہ قبرستان جائے گی۔ کچھ وقت پہلے نرگس نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ جب اُسکی موت ہوجائے تو اُسے ماں کی قبر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ سنیل دت نے اپنی بیوی کی آخری خواہش پوری کی اور اُسے میرین لائنز کے بڑے قبرستان میں ماں کی قبر کے پہلو میں دفنا دیا گیا۔ نرگس کی یاد میں باندرہ ممبئی کی ایک سڑک کا نام نرگس دت رکھا گیا۔

نرگس نے شادی کے بعد صرف ایک فلم کی۔ اُسکی اس آخری فلم کا نام ''رات اور دن'' تھا۔ یہ فلم اُسکے بھائی اختر حسین نے پرڈیوس کی تھی۔ اس فلم کے لئے اُسے بہترین اداکارہ کے اعزاز سے نوازا گیا۔ وہ پہلی ایسی ہیروئن ہے جسے پدم بھوشن کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اُسکی ازدواجی زندگی بڑی خوشحال رہی۔ سنیل دت اُسے بیحد پیار کرتے تھے۔ ماضی کے ناکام عشق کے قصے اُنکی شادی شدہ زندگی کے آڑے کبھی نہیں آئے۔ وہ اپنے پریوار کے ساتھ بہت خوش تھی۔ اُسکی بڑی بیٹی نمرتا کی شادی راجندر کمار کے بیٹے کمار گورو سے ہوئی ہے۔ اُنکا بیٹا سنجے دت ایک نامی ایکٹر ہے۔ اُنکی چھوٹی بیٹی پریا اپنے باپ کے فلاحی کاموں میں ہمیشہ اُسکے ساتھ رہا کرتی تھی۔ سنیل دت کی موت سے چند سال پہلے اُسنے بھی شادی کر ڈالی۔ نرگس جسمانی طور اب ہم میں موجود نہ ہو مگر اُسکی فلمیں اور اُسکی فطری اداکاری ہمیشہ ہمیں اُسکی یاد دلاتی رہے گی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جنگ آخر جنگ ہے

عشاق کشتوری

(جموں، کشمیر)

ہے فضائے امن میں آلودگی
پُر مجادل ہے یہاں ماحول پھر
ہو نہ ہو پھر سے وبا پھیلے کوئی
بے سبب مخلوق کا ہو پھر زیاں
ہے نہیں لازم کہ مابعین جنگ ہو
جنگ آخر جنگ ہے جنگ کو ہے کیا
جا بجا بکھریں گے پھر یہ جسم و سر
خاک میں لتھڑیں گے پھر معصوم رُو
مسجد و مندر کے پھر دیوار و در
شکلِ آدم کے لئے ہوں بے صبر
خون کا جہلم بہے یا سندھ پھر
رنگ میں ہوں گے یہ دونوں ایک رنگ
پھر شبستانوں کا بدلے گا مزاج
کونپلیں ہوں گی سراسر نیم جاں
اور ہوں گی بستیاں ماتم کدہ
الخلق کلھم عیاں اللہ ہے جب
پھر یہ دعوائے جدل ہے کس لئے
جب کبھی کھاتی زمیں ہے ضربِ جنگ
مدتوں رہتی ہے یہ پامال سر
توڑتی ہیں دم سبھی زرخیزیاں
اور ہوتا ہے دہقاں محتاجِ مال
تین جنگوں کا ہوں میں شاہد عُشاق
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے بس
حشر سامانی کا ماخذ جنگ ہے
جگر گوشوں کے فراقِ وصل میں
کتنی ماؤں کے ابھی ہیں دید تر
مریم و سیتا یہاں بیوہ ہوئیں
باپ کے سائے سے بچے محروم بھی
لاکھ بہتر ہے کہ اب بھی سوچ لیں
جنگ آخر جنگ ہے جنگ کو ہے کیا

○

رس رابطے

جستجو،ترتیب،تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، والہانہ تسلیمات۔

مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' کیسے ملتا ہے۔آپ کے معتبر عالمی جریدے ''چہارسُو'' کے دو پیکٹ ملنے کے بعد پتہ چلا کہ ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ایسے ملتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ یہ اعزاز مجھے اس شخص نے عطا کیا ہے جو اپنی ذات میں خود ایک مستند ادارہ ہے۔ ''چہارسُو'' کے چند گذشتہ شمارے دیکھ کر میں ان لوگوں کی قسمت پر رشک کرتا تھا جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں مگر ہزاروں لاکھوں لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود آپ کے انصاف کے ترازو پر تلے ہوئے ہیں۔ اور جن کی دلکش تصاویر سے آپ کا سرورق اور جن کے قابل قدر ناموں سے آپ کا صفحہ قرطاس اعزاز جگمگاتا ہے۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن آپ کی جوہر شناس نظر مجھ پر بھی پڑے گی اور مجھے اس اعزاز سے نوازا جائے گا جس کا سان گمان بھی نہ تھا۔ آپ سامنے ہوتے تو وہ آنکھیں چومتا جنھوں نے مجھے میرے اندر سے نکالا۔ اب ادبی دنیا جو بھی فیصلہ کرے میرے سر آنکھوں پر۔ اس سے قبل کلاسیک لاہور کے محترم آغا امیر حسین نے مجھ پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا تھا اس وقت تک مختلف اصناف میں نہ میری اتنی کتابیں تھیں نہ اتنا کام مجھ پر کیا گیا تھا۔ الحمدللہ، کہ آپ نے اس وقت اس فقیر کی کٹیا کا دروازہ تھپتھپایا جب یہ احقر گلے گلے تک اپنے کاغذات اور کتب کے انبار میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھ درویش کے پاس جو تھوڑا بہت مواد تھا، حاضر خدمت کیا۔ آفریں ہے آپ پر کہ ایک ریسرچ اسکالر کی طرح آپ نے خود مجھے ڈھونڈا مجتمع کیا۔ اور اچھی طرح تحقیق کے بعد تفتیش نامہ بھیجا۔ جی خوش ہوا کہ صحیح معنوں میں ایک غیر جانب دار، ایک ایماندار، صاحبِ مطالعہ سے مخاطبت کا شرف حاصل ہو رہا ہے ورنہ تو ہمارے ہاں عموماً جیسے انٹرویو ہوتے ہیں وہ آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی تھوڑا بہت سمجھنے لگا ہوں۔

اللہ جانتا ہے مجھے آج دن تک پتہ نہ چل سکا کہ ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ملتا کیسے ہے۔ کون سے اسٹامپ پیپرز، کون سے فارم بھرنے پڑتے ہیں۔ کس دفتر میں کس کی ریکمنڈیشن کے لیے جانا پڑتا ہے۔ کن لوگوں کی گڈ بکس میں رہنا پڑتا ہے۔ کتنی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ کن کن میزوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ سفارش کس کی ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ کیونکہ میں کئی ایسے پرائیڈ آف پرفارمنس دیکھ چکا ہوں جنہیں دیکھ کر مجھے ممتاز مفتی صاحب کے ''علی پور کا ایلی'' کے اولین صفحات کا یہ اعلان یاد آ جاتا ہے ''یہ کتاب کسی انعام کے لیے نہ بھیجی جائے'' ہائے کیا لوگ تھے جو انعام سے بھاگتے تھے، وائے کیا لوگ ہیں جو انعام کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ میری سب سے چھوٹی ہمشیرہ تین چار ماہ سے ہفتے میں دو بار ڈائیلاسس کے مراحل سے گزر رہی تھی، پچھلے ہفتے اچانک اس کی حالت بگڑ گئی۔ اس حد تک کہ اسے اتفاق سے ہاسپٹل کے ICU میں داخل کرانا پڑا۔ اسی دوران آپ کے پیکٹ ملے۔ ایک پاؤں ہاسپٹل میں دوسرا فارمیسی میں، جن جانکسل لمحات سے پورا گھر گزرا اسے کیا بیان کروں۔ بارے، پروردگار کے فضل و کرم اور احسان عظیم کے ساتھ ساتھ آپ جیسے درد دل رکھنے والوں کی دعاؤں میں اب وہ ICU سے پرائیویٹ روم میں بخیر و عافیت شفٹ ہو گئی ہے تو آپ کی خدمت میں دست بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ دعا کیجیے وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو کر گھر آ جائے میرے بچے اس سے بہت مانوس ہیں، اس کے بغیر گھر سونا سونا لگتا ہے۔ میں کبھی کسی مریض سے اس کی بیماری کا حال پوچھ کر اسے بیمار ہونے کا احساس نہیں دلاتا، ہمیشہ کہتا ہوں ''ماشاءاللہ بھئی، آج تو بہت خوش اور توانا دکھائی دے رہے ہو۔'' اپنی چھوٹی ہمشیرہ سے بھی میں یہی کہتا رہا۔ لیکن جو آنسو میرے فرشِ دل پر ٹپ ٹپ بہہ رہے تھے خدا کا شکر ہے کہ وہ کسی آنکھ نے نہیں دیکھے۔ شائد وقت نے میرے آنسوؤں کا رخ موڑ دیا ہے اب وہ باہر نہیں گرتے، اندر گرتے ہیں۔

اللہ آپ کو ہر دکھ، تکلیف، اذیت اور کوفت سے محفوظ رکھے۔ میں ایک کندۂ ناتراش، فقیر بے نوا، گدائے بے حال، آشفتہ سر، اس انعام عظیم کی عطا پر سب سے پہلے اللہ رب العزت کا اور پھر آپ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون ہوں۔ ممنون بہت چھوٹا سا لفظ لگتا ہے، شکر گزار بھی یونہی سا ہے۔ شاید احسان مند قدرے موزوں ہو۔ تو یقین جانیے آپ میرے محسن ہیں اور میں بندۂ ناچیز آپ کا احسان مند ہوں۔

اعتبار ساجد (لاہور)

عزیز گرامی گلزار جاوید صاحب۔ دعائے صحت، عافیت و خرامی۔

نیا چہارسو ملا (بلکہ ملے) رسالہ کیا ہے ایک کلب ہے جس کے ممبر بننے کی کوئی فیس نہیں اور جس میں آنے والے سب ایک دوسرے کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ کسی کو دوسرے سے کوئی بے جا توقع نہیں۔ عمر اور بیماری ستا رہی ہیں۔ صبح کا وقت شدید کمزوری کا ہوتا ہے صوفے میں سست پڑا اخبار پڑھتا رہتا ہوں۔ بارہ ایک کے بعد طبیعت کچھ کام کرنے پر مائل ہوتی ہے۔ اردو املا سے متعلق ایک مضمون پر کام کر رہا ہوں۔ یہ ہو جائے تو مزید جائزہ لوں گا کہ خودنوشت کا کام جاری رہنا چاہیے یعنی ''میرے دَور کی دنیا'' یا نہیں۔ میری اپنی ذات میں پڑھنے والوں کے لیے بہت کم دلچسپی کا سامان ہوگا البتہ آپ کے لیے خوشی کی خبر یہ ہے کہ آپ کی بھابی ڈاکٹر طاہرہ بھی چہارسو دلچسپی سے پڑھتی ہیں۔ ہم دونوں کی طرف سے چہارسو کے تمام ممبران کلب اور اہلِ خانہ کو دعائیں۔

اکادمی ادبیات کے تحت جو انٹرنیشنل کانفرنس ہو رہی ہے اُس میں مجھے کوئی شیلڈ نما اعزاز سے نوازا جا رہا ہے۔ میں نے اکادمی کے چیئرمین سے درخواست کی ہے کہ میری جگہ میرے عزیز دوست گلزار جاوید صاحب یہ اعزاز قبول کر لیں تو کوئی مضائقے والی بات نہیں۔

حسن منظر (کراچی)

میرے گلزار، خوش رہو۔

تم نے تو اپنی مثال خود ہی قائم کر کے کم از کم مجھے تو حیران کر دیا ہے۔ بھائی ہر شمارے میں نظم، غزل، افسانے، مضامین مگر دیکھنے اور پڑھنے میں ہر شمارے کا مزہ الگ۔ میں تو یہاں یہی مصرعہ لکھ سکتا ہوں:

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

اعتبار ساجد شکل سے نوجوان لگتے ہیں اس لیے جناب نہیں لگا رہا بہت خوب لکھتے ہیں۔ شاعری، افسانہ اور مزاح پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میری طرف سے ڈھیروں دعائیں اور مستقبل کے لیے نیک تمنائیں پہنچا دیجیے۔ میرا خوبصورت لڑکا ڈاکٹر فیروز عالم اتنے خوبصورت تراجم کر رہا ہے کہ اگر یہ کام کسی اور زبان میں کیا جاتا تو اب تک فیروز عالم کو ڈھونڈنا کارِ دارد ہو جاتا۔ پروین شیر بھی میری اولاد کی جگہ ہیں سو اُن کے لیے بھی آداب والقاب کے بغیر ڈھیر ساری دعائیں۔ یہ لڑکی کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے اور کیسی کیسی معلومات ڈھونڈ کر لے آتی ہے کہ حیران ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بنتا۔ دیپک کنول نے الگ ایک دنیا سجائی ہوئی ہے جن لوگوں کو ہم نے قریب سے دیکھا اور شناسائی بھی رہی اُن کے بارے میں ایسی نایاب اور فکر انگیز معلومات فراہم کرتے ہیں کہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص آدمی ہے کہ کوہ قاف کا جن۔ ڈاکٹر ریاض انتہائی خوبصورت انسان ہیں اُن کی شاعری بھی اُنہی کی طرح دل موہ لیتی ہے۔

جس تخلیق کا ذکر سب سے پہلے کرنا چاہیے تھا اُس کا آخر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ زیرِ نظر شمارے میں مجھے سب سے زیادہ وہ یعنی محترمہ بشریٰ رحمٰن کا افسانہ ''یہ گھر میں نے بنایا ہے'' بے انتہا پسند آیا۔ اس پسندیدگی میں تقاضائے عمر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر مصنفہ نے نئے موضوع کو جس انفرادیت سے برتا ہے اُس کے لیے بشریٰ جی کو میری طرف سے ڈھیروں دعائیں۔ رس رابطے کا میلہ تم نے اس طرح لُوٹا ہے کہ میں ''فرحت باجی'' کو دوبارہ پڑھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ رؤف خیر صاحب نے ادیبوں کے حالات لکھ کے ہمارے بڑھاپے کو للکارا ہے اور خوب للکارا ہے۔ اُنہیں کہیے کہ اسی طرح ادیبوں کے مسائل کو تلاش کر کے لکھتے رہیے شاید کوئی سویا ہوا ضمیر جاگ جائے۔ آپا جمیلہ شبنم بھلے ہی مجھ سے عمر میں چھوٹی ہوں لیکن اُن کے نام کے ساتھ آپا لگا کر جو لطف آتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اُن کے قلم میں قدرت نے خاص طرح کی لذت بھر دی ہے وہ کچھ بھی لکھیں پڑھنے والے کو مسحور کر دیتی ہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم

تازہ شمارے میں میرے پرانے شناسا اعتبار ساجد پر قرطاس اعزاز دیکھ کر مسرت ہوئی جنھوں نے میری پہلی کتاب پر ایک خوبصورت تبصرہ لکھ کر ہفتہ وار ''اخبار خواتین'' میں شائع کروایا تھا بعد میں ''عوامی منشور'' کے دفتر میں مرحوم ذکی عباس نے اُن سے ملاقات کروائی تو بہت ساری باتیں بھی ہوئیں۔ اعتبار ساجد واقعی پر فن پر دسترس رکھتے ہیں جس کا ثبوت ''چہارسُو'' کا یہ تازہ شمارہ ہے فی الحال اُن کے یہ دو شعر پیش خدمت ہیں:

بالآخر یہ حسیں منظر مٹا دینا ہی پڑتا ہے
کسی کے سر کو شانے سے ہٹا دینا ہی پڑتا ہے
کسی دیرآشنا کو جھوٹے سچے کچھ حوالوں سے
تعارف کے لیے سب سے ملا دینا ہی پڑتا ہے

اللہ تعالیٰ انہیں زندگی کی خوشیوں کے ساتھ ایک طویل وصحت مند عمر عطا فرمائے، آمین۔ دیپک کنول نے بلراج ساہنی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، ہر حال آنجہانی کی پیشتر زندگی عُسرت میں گزارنے کے باوجود اُن کا تاریخی کردار ''دو بیگھہ زمین'' میں ناقابل فراموش ہے۔ اس بار بشریٰ رحمٰن سے ملاقات چہارسو میں عرصے کے بعد ہوئی لیکن اُن کے افسانے ''یہ گھر میں نے بنایا ہے'' نے یہ کمی کسی حد تک پوری کی ہے۔ ناصر بغدادی کناڈا چلے گئے اور وہاں سے بھی افسانوں کا سلسلہ جاری رکھا ہے ''سوکھے گلاب'' میں نہ صرف ان کا اسلوب بدلا ہوا ہے بلکہ شروع سے آخر تک اس میں جس طرح Objective تکنک استعمال کی گئی ہے وہ انھی کا حصہ ہے اب آیئے رس رابطے کی جانب جس کا صفحہ ۱۱۷ تیسرا خط مکتوب نگار کے حوالے سے عمل نظر ہے فرماتے ہیں ''غالب عرفان نے تک بندی کی ہے انہیں چاہیے کہ کچھ دن آرام فرمائیں'' الفاظ پڑھ کر میں ہنس پڑا ''کرتے ہیں قتل ہاتھ میں تلوار بھی نہیں'' خط میں غزل کے بارے میں انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق الفاظ استعمال کیے ہیں اُسی غزل اور میری شاعری پر اُسی شمارے میں محترم یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)، ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور) سیمیں کرن (فیصل آباد) اور نوید سروش (میر پور خاص) نے مجھے تعریفی الفاظ سے نوازا ہے اور یہ سارے لوگ ادیب ہی نہیں مشہور ادیب ہیں! مجھے ہنسی اس لیے آئی کہ جو شخص ''سنگار دان'' اور ''سنگھار میز'' کا فرق نہیں جانتا اور ایک کہانی جو ''سنگھار میز'' کے اطراف گھومتی ہے کا نام ''سنگھار دان'' رکھ دے وہ شاعری پر تنقید کر رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کچھ عرصے قبل میں نے یہی تنقید آپ کے چہارسو میں کی تھی جو اصولی طور پر شائع بھی ہوئی ظاہر ہے یہ سچ اُن سے ہضم نہ ہو سکا اور اب میری غزل پر بے بنیاد عیب جوئی پر اُ گلا گیا۔۔۔ ایسے ہی کسی موقع پر کہا گیا میرا شعر مجھے آج بے اختیار یاد آ رہا ہے:

کسی کے طرز تکلم نے یہ کہا مجھ سے
کہ دل کا بغض تو زہر اب ہی اُگلتا ہے

غالب عرفان (کراچی)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

جناب اعتبار ساجد کے قرطاس اعزاز سے زیب و زینت پانے والا شمارہ موصول ہوا۔ ٹائٹل کچھ سمجھ سے بالاتر رہا شعری ونثری تصانیف وتصاویر کی بھی کمی رہی۔ رنگوں کی بہار شخصیت وفن پہ محیط متنوع زاویوں سے خراجِ تحسین ہے۔ اِذنِ حضوری، سبحان اللہ، پرسشِ حال بھی نہیں، جناب جونؔ ایلیا کے شعری مرتبے

ومزاجی منصب سے ہم آہنگ ہو کر ان کے نہایت فطری سکیچ کو سامنے لاتی ہے جو جیتا جاگتا تاثر دیتا ہے اُن کی خوبصورت غزل شعری مجموعے ''یعنی'' سے شاید مستعار ہے۔ ''براہِ راست'' کے تیکھے اور اچھوتے سوالات کے جوابات میں اعتبار ساجد صاحب نے جس طرح اپنے ادبی موقف اور شعری مطمعٔ نظر کو بیساختگی وپُر کاری سے اشعار سے واضح کیا اُس نے اس سلسلے کو ایک انوکھا رنگ وجداگانہ ڈھنگ دے ڈالا اور قاری کہہ اُٹھا۔

''ہمیں یقین ہوا ہم کو اعتبار آیا''

سبھی مضامین نے بحیثیت تخلیق کار مختلف ادبی جہات کے ساتھ بالخصوص اُستاد ہونے کے ناطے تعلیمی و تدریسی تجربات اور مشاہدات کی تفہیم میں معاونت کی۔ بعض نام ایسے بھی ادبی دنیا میں ملتے ہیں جن پر سراسر نسوانی نام کا گمان گزرتا ہے اور پڑھنے والے دلچسپ خوش فہمیوں میں گِھرے رہتے ہیں۔ ''نیاز مند کے خطوط'' ایسے ہی پر لطف پس منظر سے تخلیق ہوئے ہیں۔۔۔''اندر کی عورت'' کا اندرو باہر کا تضاد و تفاوت اپنی جگہ مگر کلائمکس پہ قلمی گرفت تاثر انگیز وتحیّر آمیز رہی۔۔۔

''کوئی دن زندگانی'' تشنہ بریلوی صاحب سے دانشورانہ دوستانہ مراسم اُن کی علم دوستی اور ادب پروری کے مظہر تھے جس کے در پردہ اُن کا جذبۂ اخلاص کارگر رہتا تھا۔ ''متاعِ کوثر وزمزم'' نابغۂ روزگار اپنے عہد میں ہمیشہ ناقدر شناسی ہی پاتے ہیں کہ وہ اپنے وقت سے بہت آگے ہوتے ہیں اور زمانے کو اُنہیں سمجھنے کی سمجھ ہی نہیں ہوتی۔ ساغر صدیقی صاحب کا لاحقہ وسابقہ بھی ایسے ناقدر شناسوں سے رہا شاید اسی لیے قاسمی صاحب نے کہا تھا ''اس کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں۔ مر گئے ہم تو زمانے بہت یاد کیا'' بعد از زندگانی سہی مگر کسی ادارے، تنظیم یا شاہراہ کو اُن سے موسوم کر کے ادب دوستی اور وسیع النظری کا ثبوت تو دیا جا سکتا ہے۔ ''زندہ مرحومین ادب'' بڑا عمدہ طنزیہ، استہزایہ اور مزاحیہ ہے جس میں زیر بحث شعرا واُدبا کی سچی تصویر کشی اور کھری ترجمانی ہے اور ویسے بھی آئینہ دیکھنا فطری عمل جبکہ دکھلانا بڑی مشاقی و چابکدستی چاہتا ہے۔ اعتبار ساجد صاحب کی تمام نظمیں زمینی حقائق سے جڑی ہوئی ناقابل تردید سچائیاں ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

عزیز برادر گلزار جاوید، السلام علیکم۔

برادر میں رس رابطے میں اپنی عدم شمولیت کی اس وجہ کے ضمن میں زیر نظر شمارے کے ایک تبصرہ نگار کی مثال پیش کرنا ضروری خیال کروں گا۔ جنہیں جریدہ میں شعری حصہ پسند آیا۔ اور پسند کی اس دیگ میں سے موصوف نے دو چاول (اشعار) نکال کر دکھائے ہیں اور دونوں اشعار کی پسندیدگی کی وجہ بھی بیان کی ہے جو خوش آئند ہے۔ تاہم اس شمارے میں ایک تیسرے شاعر غالب عرفان صاحب سے متعلق اپنی رائے میں فرماتے ہیں ''غالب عرفان نے تنگ بندی کی ہے'' اس کے ساتھ ہی جناب نے ایک نیک اور مفت مشورہ بھی ارشاد فرمایا ہے ''انہیں کچھ دن آرام کرنا چاہیے'' یہ وہی عیب ہے جس کا اظہار ہم نے شروع میں کیا کہ وہ ''تنگ بندی'' کیا ہے، کس وجہ سے آپ نے یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ یہ محض ایک ''سیاسی'' بیان ہے یا پھر نادان لونڈے کا طعنہ کہ ''جاؤ تم ہمیں اچھے نہیں لگتے'' رہا آرام کا مشورہ تو اس تنگ بندی کی زد میں کتنے لوگ آئیں گے کہ ''آرام گاہوں'' میں جگہ بھی نہ ملے گی۔

خیال آفاقی (کراچی)

پیارے گلزار بھائی، آداب۔

ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۱۶ کا شمارہ موصول ہو کر فردوسِ نظر ہوا۔ توجہ فرمائی کے لیے سپاس گزار ہوں۔ اعتبار ساجد صاحب کا کلام نہایت مرقع اور نثری تحریریں بھی بے حد جاندار ہیں۔ ان کے ''نیاز مند کے خطوط'' نے خاص طور پر بہت مزہ دیا اور ایک پُرانا دلچسپ واقعہ یاد آ گیا جب فراقؔ گورکھپوری جیسے اعلیٰ مرتبت شاعر بھی دلّی کے ایک شخص کے جھانسے میں آ گئے تھے جس نے کُماری شیلا کے فرضی نام سے انہیں کئی رُومان انگیز خطوط لکھے تھے اور فراقؔ صاحب بھی اس کاغذی محبت میں ایک طویل عرصے تک گرفتار رہے تھے۔

پچھلا شمارہ بھی اپنی علالت اور خانگی مصروفیات کے باوجود میں نے (دو چار اقساط میں) پڑھ لیا تھا مگر آپ کی خوب صورت جذباتی کہانی اور دیپک کنول صاحب کے تمّی کے بارے میں معلوماتی بیانیہ کے علاوہ اب اور کچھ یاد نہیں۔

اب کی بار سبھی افسانے بہت عمدہ ہیں۔ سیما پیروز، سید سعید نقوی، رونق جمال، میر صاحب حسن، کس کس کا نام لوں لیکن بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا افسانہ ''یہ گھر میں نے بنایا ہے'' بہر طور حاصل شمارہ ہے۔ تابش خانزادہ اور پروین شیر کی نئی قسطوں میں وہی تازگی محسوس ہوتی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے لیوٹالسٹائے کی کہانی ''God Sees the Truth but waits'' کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے۔

غالب عرفان اور کرامت بخاری صاحبان کے شخصی اور تنقیدی مضامین بہت معلوماتی ہیں۔ ڈاکٹر رؤف خیر اور آپا جمیلہ شبنم کے مضامین بہت چونکا دینے والے ہیں۔ اول الذکر صاحب کے دیرینہ انکشافات اور جمیلہ شبنم صاحبہ کی انسانی نفسیات پر مضبوط پکڑ ایک خوش گوار حیرت کا احساس دیتے ہیں۔

غزلیات ونظمیات میں حضرات اختر شاہجہاں پوری، غالب عرفان، حسن عسکری کاظمی، خیال آفاقی، اشرف جاوید، عارف شفیق، سہیلہ انعام صدیقی، حبیب الرحمٰن چوہان، عطاء الرحمٰن قاضی، عرش صہبائی، نوید سروش، کرامت بخاری، یوگیندر بہل تشنہ اور وشال کھلر نے مجھے متاثر کیا۔ بلراج ساہنی (مرحوم) پر دیپک کنول صاحب کا جامع مضمون ہمیشہ کی طرح بہت دل چسپ اور لائق تحسین ہے۔ موصوف سے میری استدعا ہے کہ باحیات فنکاروں کے موجودہ ڈاک پتے بھی ضرور درج فرما دیا کریں۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

برادرم گلزار جاوید جی

سلام مسنون۔ گذشتہ تین چار مہینے کافی پریشانیاں رہیں۔ زوجہ کی

بیماری تو خیر پچھلے دسمبر سے جاری ہے، اب اللہ کے فضل سے کچھ فرق پڑا ہے۔اگست میں برادرِ بزرگ ڈاکٹر محمد سلیم ملک کا انتقال چار پانچ دن کی بے ہوشی کے بعد ہو گیا جس کے بعد تو بری حالت ہو گئی۔ان کا گھر بھی آپ کے بہت نزدیک الہ آباد کی گلی نمبر ایک میں تھا، وہیں سے جنازہ اٹھا، میں خود چار پانچ دن وہاں رہا مگر یوں جیسے کہ کہیں نہیں رہا۔

ستمبر اکتوبر ۲۰۱۶ء کا شمارہ موصول ہوا تو ''زہریلا انسان'' کی تازہ قسط پڑھنے سے قبل پچھلے شمارے (عبدالصمد نمبر) کی تلاش کی مگر لگتا ہے وہ کہیں ڈاک میں مِس ہو گیا ہو گا،اب ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کر رہا ہوں کہ تسلسل کے ساتھ یہ دلچسپ ناول پڑھ سکوں۔

یاد پڑتا ہے کہ ڈاکٹر حسین پراچہ کے سفرنامے ''کنارے کنارے'' پر ایک نیم مزاحیہ مضمون آپ کی خدمت میں چار پانچ ماہ پہلے بھیجا تھا۔

تازہ شمارے میں اپنے گہرے دوست پروفیسر اعتبار ساجد کے بارے میں بہت سے اچھے اچھے مضامین اور ان کا خوبصورت کلام دیکھا۔انٹرویو اِس مرتبہ جانے کیوں کچھ مختصر اور نامکمل سا لگا۔ان کے کلامِ نظم ونثر کا انتخاب بھی کچھ بہتر ہو سکتا تھا۔اپنے انٹرویو میں انہوں نے منشایاد کے ان سے گریز کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ انہیں شمع اور آداب عرض میں شائع ہونے کا ذکر پسند نہیں آیا۔اس پر حیرت ہوئی ہے کیونکہ آج کے معروف شاعر اور ادیب جناب عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد بھی آداب عرض میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

قرطاسِ اعزاز کے سلسلے میں میں ایک مشورہ دینے کی جسارت کرنا چاہوں گا، اگر تین چار مہینے پہلے اس شخصیت کا اعلان کر دیا جائے جسے قرطاسِ اعزاز عطا ہونی ہے تو شاید اس کا کوئی قریبی دوست اس کی شخصیت کا کوئی ایسا گوشہ سامنے لا سکے جو عام نقّادوں کی نظروں میں نہ آ سکا ہو۔

میرے کلام کا انتخاب جو خاور اعجاز نے کیا ہے اسی ہفتے ''آسماں زیرِ زمیں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔جلد پیش کروں گا۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

گلزار جاوید بھائی،السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ اپنے ادبی وقار کے ساتھ نظر نواز ہوا۔حسبِ معمول سب سے پہلے خطوط کا مطالعہ کیا۔ یوگیندر بہل تشنہ،شموئل احمد، عذرا اصغر اور سیمیں کرن کے خط رسالے کے حوالے سے اہم ہیں۔اعتبار ساجد ہمارے عہد کے ایسے شاعر ہیں جن کا قلم مسلسل رواں ہے۔انہوں نے نظم کے ساتھ نثر میں بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔اعتبار ساجد کی غزل میں کلاسیکی رچاؤ بھی ہے اور جدید فکر کے ساتھ عصری مسائل کی ترجمانی بھی۔''براہِ راست'' میں آپ کے منفرد سوالات اور صاحبِ گوشہ کے کچھ کھرے جوابات نے اُن کی صاف گوئی اور ادب سے طویل گہری وابستگی ثابت کرتی ہے۔ جون ایلیا مرحوم پر اعتبار ساجد کی تحریر ''پرسش حال بھی نہیں'' مرحوم کی شخصیت کی انفرادیت اور بے ساختہ پن کو خوب صورتی سے پیش کرتی ہے۔احسان دانش،سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر انور سدید، خیال امروہوی،نظیر صدیقی کے مضامین اور احمد ندیم قاسمی،افتخار عارف،اے حمید،شان الحق حقی، پروفیسر مجتبیٰ حسین اور دیگر کے مضامین وتبصروں سے اقتباسات اعتبار ساجد کی شخصیت،فکر وفن اور اسلوب کے مختلف زاویے سامنے لاتے ہیں۔ایسے بڑے قلم کاروں کا اعتبار ساجد کی نظم ونثر پر قلم اُٹھانا،اُن کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔پروفیسر سلیمان باسط اور اقبال خورشید نے اعتبار ساجد کی ملتان سے محبت اور ملتان کے دوستوں کو یاد کیا ہے۔عائشہ ممتاز بھٹی نے غزلوں اور پروفیسر محمد رفیق احمد خان نے نظموں کا انتخاب بہت احتیاط سے کیا ہے جس میں ہر رنگ کھل رہا ہے۔اعتبار ساجد کی شخصیت کا ایک سچا اور دلچسپ روپ ''نیاز مند کے خطوط'' کی تحریر بھی جھوم رہی ہے شور مچا رہی ہے۔

یاد آیا بہت پہلے کراچی کے ایک غیر معروف اخبار نے شبنم رومانی اور شہزاد احمد مرحوم کے اسکنڈلز کی خبر شائع کی۔دوسرے دن شہزاد احمد مرحوم نے تردید کی۔کیا سادگی اور بے خبری ہے۔ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے لیو ٹالسٹائے کی کہانی ''خدا دیکھتا ہے مگر دیر سے'' کا ترجمہ فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے انتخاب کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔''ایوالفروچ'' کا کردار خدا پر یقین اور صبر وشکر کی علامت ہے۔ایوالفروچ کی معافی سے سیما نواچ کے ضمیر کی بیداری بھی اہم ہے۔پُر اثر کہانی ہے۔بیوی کا خواب، ایوانووچ اُسے سفید بالوں میں بھی نہ مل سکا۔دیپک کنول نے اس بار بلراج ساہنی کی داستانِ غم وکامیابی نذرِ قرطاس کی ہے۔بدرالدین اور بیٹے کی شوٹنگ کے واقعے عجیب اور دلچسپ ہیں۔بدرالدین (جانی واکیر) کی طرح مشہور شاعر اور فلمی نغمہ نگار حسرت جے پوری بھی بس کنڈیکٹر تھے۔دیپک کنول کے ابتدا میں یہ جملے حقیقت پر مبنی ہیں:

''بمبئی کی فلم انڈسٹری کو جتنے بھی بے مثال ادا کار ملے ہیں وہ لاہور، پشاور یا راولپنڈی کی زرخیز زمین کی پیداوار رہے ہیں''(ص۔۱۱۲)

موجودہ سیاسی منظر نامے میں دیپک کنول صاحب ہندوستانی حکومت کے عتاب میں نہ آ جائیں۔ڈاکٹر رؤف خیر نے طنزیہ فکاہی مضمون تحریر کیا کچھ مرحومین کے نام دیے ہیں جو اہلِ قلم زندہ ہیں (اُن کی نظر میں ادبی طور پر وہ مر چکے ہیں) اُن کے نام نہیں دیے۔آپا جمیلہ شبنم نے ''رازِ ذوقِ حیات'' میں زندگی کو با مقصد اور آسان بنانے کے لیے ستارے راہ میں بچھا دیے ہیں۔شائستہ عالم کی کہانی ''ریشماں'' ایک تلخ حقیقت ہے کہانی اختتام سے پہلے ہی کُھل گئی۔پروین شیر کے سفرنامے کی موجودہ قسط میں تکیل جزیرے، پہاڑوں پر چڑھنا اور اُترنا،معصوم بچوں کو پیسے دینے کی ممانعت، کوسکو کی سیر،آکسیجن کی کمی کے سبب کوکا پتیاں چبانا،سورج کے بیٹوں کو مرنے کے بعد بھی زندہ لوگوں کی طرح رکھنا، سبک سے دامن کے کھنڈرات، یہ سب بہت دلچسپ ہیں اور اندازِ تحریر نے چار چاند لگا دیے۔سیما پیروز کا خوب صورت افسانہ ''معمولی آدمی'' رشتوں کی بقا اور محبتوں کو نبھانے کی علامت ہے۔سید سعید نقوی کا افسانہ ''ریشہ نیستاں'' ایک معصوم اور

لاشعوری محبت کی ایسی کہانی ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ''تاج محل'' کی علامت کہانی کو معنوی اعتبار سے کہیں سے کہیں لے جاتی ہے مہاجر کیمپ سے نسیم کو لا کر گھر کی ملازمہ بنا لینا، یہ زاویہ مختلف ہے۔ افسانہ میں جزئیات ماحول کی زبردست وضاحت کرتی ہے۔ اچھا افسانہ ہے۔

محمود الحسن، حسن عسکری کاظمی، قیصر نجفی، خیال آفاقی، یونس صابر، شہاب صفدر، ابراہیم عدیل اور عطاء الرحمٰن قاضی کی غزلوں کے اشعار کی انفرادیت اور بے ساختہ پن متاثر کرتا ہے۔ عارف شفیق کی غزل ہمارے عہد کے اہم مسئلے کی عکاسی ہے مقطع ذرا مختلف ہے مگر کیا کہنے۔

میں بوڑھا ہو گیا ہوں پھر بھی ہر اک رات کو عارفؔ
مری ماں خواب میں آ کر مجھے لوری سناتی ہے

اشرف جاوید کی غزل کی ردیف ''میاں'' موجودہ سیاسی منظر نامے کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ محمود شام (ملٹن پونڈ پر کچھ نظمیں) ان مختصر نظموں نے دل میں فوراً جگہ بنا لی ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری کی نظم ''حرفِ تمنا کی ایجاد'' میں ایک تڑپ اور جستجو ہے جب کہ کرامت بخاری کی نظم ''ہمارا کیا ہے'' میں مستقبل کی فکر اور پس منظر میں اُمید کے چراغ روشن ہیں۔ یوگیندر بہل تشنہ کی ''پاکستانی دوستوں کے نام'' میں جذبہ بھی ہے اور جذبات بھی، محبت بھی ہے اور سوال بھی۔ میں اُن کے احساسات کی قدر کرتا ہوں۔ محشر بدایونی کا ایک شعر آپ کی نذر:

کرے دریا نہ پُل مسمار میرے ابھی کچھ لوگ ہیں اُس پار میرے

ایک میرا شعر

رکھنے ہیں اُن سے کچھ تو ابھی رابطے بحال
رہتے ہیں اپنے لوگ بھی ہندوستان میں

غالب عرفان صاحب نے ''کوئی دن زندگانی اور ہے'' میں ترقی پسند ادیب تشنہ بریلوی کو یاد کیا ہے۔ تشنہ مرحوم ایک محبت کرنے والی کھری شخصیت تھے انہوں نے میری کتاب ''ہم نشینی'' پر بڑے خلوص سے قطعات اور نظم لکھ کر ای میل کی تھی تحریر پُر اثر ہے۔ کرامت بخاری نے ''متاعِ کوثر و زمزم'' میں باکمال شاعر ساغر صدیقی کو یاد کیا ہے۔ شخصیت اور فکر پر مختصر مگر اچھا مضمون ہے۔

نوید سروش (میرپور خاص)

جنابِ گلزار جاوید صاحب، آداب۔

ماہنامہ ''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا، آپ کی محبتوں کی قرض دار ہوں۔۔۔ آج کافی عرصہ بعد آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں اپنی بیماری سے زیادہ انسانی رویوں نے مجھے علیل رکھا ہے۔۔۔ ڈاکٹر رینو بہل صاحبہ کی کتاب ''دستک'' بھی مجھ تک پہنچ گئی آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہو نہ سکا بہر حال آپ کا اور رینو جی کا بے حد شکریہ کہ آپ لوگوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ کتاب پڑھ رہی ہوں اور اُن کے خوبصورت افسانوں پر سر دھن رہی ہوں کہ اُن کے افسانے اُن کی زمین سے جڑے ہوئے ہیں اور یہ ہی اصلی فنکار کی پہچان ہے کہ وہ اپنی دھرتی، اپنی مٹی اور اپنے لوگوں کی بات کرتے ہیں۔

رومانہ رومی (کراچی)

جنابِ گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسُو کا تازہ شمارہ ستمبر، اکتوبر موصول ہوا، بے حد ممنون ہوں۔ ہر مرتبہ کسی نہ کسی بڑے قلمکار کو قرطاسِ اعزاز سے نوازنا چہارسُو کی پہچان ہے اس بار معروف شاعر اعتبار ساجد کے شعری کمالات سامنے لا کر آپ نے اردو ادب کی وسعت میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ چہارسُو میں شامل دیگر تحریریں بھی سراہانے کے قابل ہیں۔ لیکن خواہش کے باوجود تفصیل سے لکھنے سے قاصر ہوں کیونکہ آج کل فالج کے حملے کا شکار ہوں۔ احباب سے دعائے صحت یابی کی درخواست ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

جنابِ گلزار صاحب، آداب و نیاز۔

اس مرتبہ تو تازہ شمارہ امید سے پہلے ہی دستیاب ہو گیا۔ اعتبار ساجد باکمال شخصیت ہیں اور آپ کی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ چہارسُو کے ذریعے اُن کی نثری اور شعری تخلیقات پڑھنے کا موقع ملا۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے نئے طرز کے سوالات اور اُن کے دلچسپ جواب انٹرویو کو رنگین بنا گئے۔ جون ایلیا کے متعلق ان کا مضمون پڑھ کر معروف شاعر کی زندگی اور اُن کی شخصیت پڑھ کر اچھا لگا۔ عہد اپنے شاعر کے اندر ہوتا ہے، شاعر اپنے عہد کے اندر نہیں۔ بہت گہری بات کہہ گئے جون ایلیا صاحب۔ ''نیاز مند کے خطوط'' الگ طرح کے بے حد دلچسپ۔ بالکل صحیح فرمایا اُنہوں نے میرے خیال سے ایسے واقعات سے دو چار ہونا ہی پڑتا ہے خواتین ادیبوں کو۔ ''اندر کی عورت'' تو بھائی کمال کا افسانہ ہے۔ مختصر، رومانی اور جذبات کی عکاسی بے حد خوبصورت انداز میں۔ سچ کہوں تو یہ افسانہ پڑھ کر اُن کے افسانوں کا مجموعہ پڑھنے کا اشتیاق جاگ اُٹھا۔ شاعری میں کس کس پر داد دوں، یہ کہنا مشکل۔ بس دل سے بے ساختہ نکلا آفریں آفریں۔

اب بات کریں شمارے کے باقی حصے کی۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کا افسانہ ایک مدت بعد پڑھنے کو ملا۔ افسانہ بہت خوب ہے۔ عورت کی نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ ناصر بغدادی کا ''سوکھے گلاب'' دل چھو گیا۔ بہت خوبصورت اور عورتوں کی بے بسی اور معاشرے کی سنگدلی کس قدر اُسے تنہا زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سیما پیروز کا ''معمولی آدمی'' بھی دوستی اور محبت کی اچھی مثال ہے۔ ''ریشہ نیستاں'' سید سعید نقوی کا دلچسپ نفسیاتی افسانہ ہے۔ افسانے کے آخر تک تجسس بنا رہتا ہے۔ ایک چھوٹا بچہ بھی حسد میں اس قدر مبتلا ہو سکتا ہے، اسے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ شائستہ عالم کی کہانی اچھی لگی مگر اختتام چونکا دینے والا ہوتا تو کہانی کو چار چاند لگ جاتے۔ رونق جمال کا ''عید کا فرشتہ'' اور میر صاحب حسن کا ''آخری نشانی'' بھی عمدہ افسانے ہیں۔

آج کل دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیے ہوئے افسانے بھی چہارسُو میں پڑھنے کو مل رہے ہیں یہ بہت اچھا قدم ہے۔ اس طرح اردو پڑھنے

والے دوسری زبان میں لکھے اچھے ادب کا بھی لطف اُٹھا سکتے ہیں۔حنیف باوااور فیروز عالم کی کہانیاں قابل ستائش ہیں۔زہریلا سانپ پڑھ کرتو اشتیاق ہوتا ہے کہ جلد سے جلداس کی اگلی قسط بھی مل جائے۔دراصل تابش خانزادہ کا موضوع بڑا عجیب،ہٹ کراوردلچسپ ہے۔پروین شیر کا سفرنامہ ''چندسیپیاں سمندروں سے'' لکھنے کا انداز ایسا ہے کہ افسانے کا مزہ دیتا ہے۔فیاض احمد کا شوئل صاحب کے ناول ''گرداب'' پرلکھا تبصرہ بے حد کمال کا ہے۔انہوں نے جس گہرائی سے گرداب کا مطالعہ کیا ہےاس سے کہیں زیادہ گہرائی سے مضمون لکھا ہے۔گرداب پڑھ کر جتنا مزہ آیا تھا،اگراسے پہلے پڑھا ہوتا تو اشتیاق بھی بڑھ جاتا اور لطف بھی دوبالا ہوجاتا۔اتنے جی جان سے لکھے گئے تبصرے کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

غالب عرفان صاحب نے تشنہ بریلوی کوخراج عقیدت دے کر اپنی دوستی کا حق ادا کردیا۔کرامت بخاری صاحب کا ساغرصدیقی پرلکھا مضمون پڑھ کر اُن کی شاعری اور زندگی کے حالات معلوم ہوئے۔دنیا کی سنگدلی پرافسوس بھی ہوا کہ حسد کے مارے ہم عصر شعراء نے کس بے دردی سے چمکتے ستارے کو دھول میں ملنے دیا۔رؤف خیر کا ''زندہ مرحومین ادب'' خوب ہے۔آپا جمیلہ شبنم نے خوش رہنے کے اچھے طریقے بتائے ہیں۔بلراج ساہنی نے کتنی جدوجہد کی کامیاب کلاکار بننے کی،یہ اگرایک صدی کا قصہ نہ پڑھتی تو معلوم نہ ہوتا۔

نظمیں سبھی اپنے اپنے طرز کی اپنا رنگ بکھیر رہی ہیں۔محمود شام،ڈاکٹر ریاض احمد،شگفتہ نازلی،ڈاکٹر جواز جعفری،کرامت بخاری،یوگیندر بہل تشنہ اوروشال کھلر صاحب کی نظمیں اطمینان سے پڑھ کرلطف آیا۔غزلیات کی باری آخیر میں آتی ہے۔انہیں گھونٹ گھونٹ کر پینے میں مزہ آتا ہے۔شاعری کی محفل خوب سجی ہوئی ہے بس تھوڑا وقت درکار ہے۔آپ نے جس محنت سے چہارسو کا شمارہ نکالا ہےاس کے لیے شکریہ تو بنتا ہے۔اللہ آپ کو سلامت رکھے،صحت یاب رکھے اورآپ اسی طرح ہمیں نئے نئے ادب کے اُفق پر چمکتے روشن ستاروں سے آشنا کراتے رہیں۔دونوں طرف کے ادیبوں کو جوڑے رکھیں اور بھائی چارہ اسی طرح بنا رہے۔(آمین)

رینو بہل (چنڈی گڑھ،بھارت)

گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

ستمبر۔اکتوبر ۲۰۱۶ء کے ''چہارسُو'' اعتبار ساجد نمبر میں ایک قابل تعریف شاعر کوخراج تحسین پیش کیا گیا ہے جونثر سے شاعری کی طرف آئے اور اپنی نئی فکر،مشاہدات اور تجربات کو بے ساختگی اور سادگی سے بیان کر کے اردو غزل کو ایک نئے وقار سے نوازا۔اردو ادب کی مشہور شخصیات نے ان کی خوبصورت شاعری اوردلچسپ نثر کوسراہا ہے۔ان کی تحریر ''نیازمند کے خطوط'' اپنے منفرد انداز کی وجہ سے بہت پسند آئی۔

ناصر بغدادی نے اپنے افسانے ''سوکھے گلاب'' میں مشرقی معاشرے میں عورت کی مجبوریوں اورمحدود اختیارات کا نہایت جذباتی اور حقیقی انداز میں ذکر کیا ہے جسے پڑھ کر دیر تک اثرات ذہن پرنقش رہتے ہیں۔سیما پیروز نے ''معمولی آدمی'' میں سچی اور بے لوث دوستی کی ایک اعلیٰ مثال بیان کی ہے جواس دور میں نایاب ہے۔

شائستہ عالم نے اپنے افسانہ ''ریشماں'' میں سفاکی کا ایک ایسا واقعہ بیان کیا ہے جو ہمارے دیہاتی معاشرہ میں روزمرہ زندگی کی ایک ایسی المناک جھلک ہے جس کے تحت لوگ معمولی باتوں اورانا کی خاطر بڑی آسانی سے معصوم جانوں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ڈاکٹر فیروز عالم نے لیوٹالسٹائی کی تحریر کا ''خدادیکھتا ہے مگر دیر سے'' کے عنوان سے بہت موثر ترجمہ کیا ہے۔کہانی کی بنیاد وقوعہ سے پہلے نظر آنے والے ایک سچے خواب پر ہے جو بڑے کردار کی بیوی نے صرف ایک دن پہلے دیکھا اورسفر پر جانے سے منع بھی کیا لیکن اسے نظرانداز کردیا گیا۔پھر جو ہونا تھا وہ ہو کے رہا جو ایک ٹریجڈی ہے۔عام زندگی میں بھی بعض لوگوں کو واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے خواب میں ان کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔ماہرین نفسیات کے مطابق ایسے لوگ ''حواسِ خمسہ سے ماوراحسی ادراک'' Extra sensory perception کے حامل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر رؤف خیر کا مضمون ''زندہ مرحومین ادب'' ایک بہترین اور تحقیقی تحریر ہے جس میں انہوں نے ان شعراء کا خصوصی تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی جاری ادب یا شاعری سے تعلق چھوڑ دیا اور یوں زندہ مرحومین ادب شمار ہونے لگے۔شمارہ میں بہترین افسانوں اورمضامین کے علاوہ اچھی اور معیاری شاعری بھی شامل ہے۔یوگیندر بہل تشنہ صاحب نے ایک نظم ''پاکستانی دوستوں کے نام'' لکھی ہے جس میں انہوں نے اپنے پرخلوص جذبات کا اظہار کیا ہے۔تشنہ صاحب تقسیم ہند سے پہلے نوشہرہ میں بھی مقیم رہے۔جہاں سے وہ پشاور اور دیگر شہروں میں آتے جاتے رہے اور یوں پاکستان اور پاکستانی دوستوں کے لیے محبت کے جذبات رکھتے ہیں اور ہرقسم سے تعصب سے پاک ہیں۔اب وہ کینیڈا کے شہری ہیں لیکن خوبصورت یادوں کے سہارے زندہ ہیں۔ان کا شکریہ۔ چہارسو کا یہ بہترین شمارہ پیش کرنے پرآپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

عزیز گرامی گلزار جاوید صاحب،سلام مسنون۔

چہارسو شمارہ ستمبر،اکتوبر کی اشاعت اور قرطاسِ اعزاز برادرِ عزیز اعتبار ساجد کے حق میں آپ کی سخن فہمی کا نشان امتیاز ہے اور بقول شخصے ''حق بہ حق دار رسید'' کی خوبصورت آواز بلکہ آوازہ ہے کہ اس عہد بے تعبیر میں ایسی مثال پیش کرنا جادۂ حق پر قائم رہنا ہے،آپ اپنے نام کے حوالے سے ہمیشہ گلزارِ ادب میں جستجوئے رنگ و بو کی خاطر اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھتے ہیں۔برادرم اعتبار ساجد منجھے ہوئے شاعر اور نثر نگار ہیں۔

''براہِ راست'' میں آپ نے بہت سے سوالات کئے خصوصاً آپ کا یہ سوال کہ ''آپ کے ہاں جدید اور قدیم شعری رویے باہم متصادم کیوں دکھائی دیتے ہیں'' یا ایک اور دلچسپ سوال یہ بھی کیا کہ ''ایک خیال یہ ہے کہ آپ نے

شاعری کو محبت گردان کر حقیقی محبت کی پردہ پوشی کی ہے، قارئین پر اعتماد کیجیے اور آج کی نشست میں اپنی صوفیہ لورین کا تعارف کرا ہی دیجیے" اعتبار ساجد نے آپ کے چبھتے ہوئے سوالوں پر کسی برہمی کا اظہار نہیں کیا مگر شعر کا سہارا لیا اور کنایتہً کچھ کہہ گئے البتہ شاعر کا نام خود ہی اپنی طرف سے کچھ اور بتا دیا حالانکہ وہ شعر مصحفی کا ہے۔ خیر ایسا کبھی کبھار ہو جاتا ہے۔

میرا مضمون عنوان بدل کر لکھنے کا "شکریہ"۔ یہ مضمون اعتبار ساجد کے لیے لکھا جس نے اپنا تعارف دردمندی کے ساتھ اس طرح پیش کیا تھا کہ:

پرانا صوفہ ہوں گویا اٹھا کے لے جاؤ
سوائے میرے مرے گھر میں فالتو کیا ہے

بھلا ہم اپنے قیمتی اثاثے کو یوں ضائع کرنے کا ارتکاب کر سکتے ہیں، دراصل ہر بڑا شاعر زمانے کی بے مہری اور عدم توجہی پر شکوہ سنج رہا۔ میر تقی میر نے بھی کہا تھا کہ

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل
سارے عالم میں میں دکھلا لایا

موجودہ حکومت یا ماضی کی نام نہاد جمہوری حکومتیں ہوں یا فردِ واحد کا عہدِ اقتدار۔۔۔ شاعروں، قلم کاروں اور فنکاروں کی قدر و منزلت سے کہیں زیادہ سفارشی لوگوں کی "عزت افزائی" کا اہتمام کرتی ہیں، وہ بھی سیاسی مصلحتوں کے تابع فنون لطیفہ کے فروغ کی صرف تشہیر چاہتی ہیں ورنہ ملکی وسائل پر تصرف ان کا مشن رہا اور بس۔

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہار سو کا تازہ شمارہ ملا ہر چند پورا پرچہ قابل مطالعہ ہے مگر میں نے سب سے پہلے تابش صاحب کے ناول کا باب پڑھا۔ تابش خانزادہ کا ناول زہریلا انسان اک دلچسپ ناول ہے۔ سب سے بڑی خوبی تو یہ کہ یہ خود کو پڑھنے پہ مجبور کرتا ہے گو کہ موضوع پرانا۔۔۔ وش کنیا یا پتر کا concept نیا نہیں۔ مگر تابش صاحب نے اسے جس طرح فکشن کے ساتھ سائنسی حقائق کی زبان دی ہے اور مافوق الفطرت و غیر معمولی صلاحیت کو عام فہم و digestable بنایا یہ کاوش یقیناً قابل ستائش ہے مگر ایک چیز ضرور کھلی کہ یہ آغاز میں اک ایسے بچے کی داستان ہے جو اک مخصوص ماحول میں پلا بڑھا مگر زبان واستعارے وہ بین الاقوامی دے رہا ہے۔ گو کہ ناول میں واضح اشارے موجود کہ یہ ناول آگے سرحد سے باہر چلا جائے گا۔۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ رامو کی زندگی کے ابتدائی ابواب میں زبان و بیان کے استعارے اسی ماحول کی مطابقت لیے ہوتے۔۔ جیسے شہزادی کو دیکھ کر میری عاجزانہ رائے کے مطابق رامو کو مونا لیزا کی یاد نہیں آنی چاہیے۔ اس کے پاس کی دنیا۔۔۔ جانوروں کی دنیا۔۔۔ جنگلی انسانوں میں، اس علاقے کی زبان میں اسکی تشبیہات واستعارے تخلیق پانے چاہئیں۔۔ یہ عوامل یقیناً تخلیق کو مزید پرواز عطا کریں گے۔۔ اک خوبصورت تخلیق پہ تابش صاحب کو مبارکباد۔

سیمیں کرن (فیصل آباد)

برادرم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس مرتبہ قرطاس اعزاز پاکستان کے ممتاز ادیب، شاعر، کالم نویس اور مزاح نگار اعتبار ساجد کے نام تھا اور بہت خوب تھا۔ یہ شمارہ اعتبار ساجد اور ان پر لکھی گئی تحریروں کا ایک یادگار مرقع ثابت ہوگا۔ "منزل قلب ونظر" (محمد انعام الحق) سے مجھے صاحبِ اعزاز کے اعزازات کا علم ہوا جسے پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ ادب کی مختلف جہتوں میں ان کی کاوشیں قابل قدر ہیں۔ "پرسشِ حال" میں اعتبار ساجد نے جون ایلیا کے ایک ایسے انٹرویو کی دلچسپ روداد قلم بند کی ہے جو لیا نہ جاسکا۔ "براہِ راست" میں آپ نے حسبِ معمول ایک "کھوجی" کا کردار کامیابی سے ادا کیا اور اعتبار ساجد نے جوابات بھی برجستہ دیے البتہ ان سے جگر کے ایک شعر (ص ۱۳) میں چوک ہوگئی۔ درست شعر یوں ہے

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
مرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اعتبار ساجد پر لکھے گئے مضامین میں مجھے انور سدید صاحب کے "یادیں باقی۔۔۔" نے خاص طور پر متاثر کیا۔ "اندر کی عورت" (اعتبار ساجد) مختصر لیکن انتہائی دلچسپ افسانہ ہے جو تجسس سے بھرپور ہے۔ دیگر افسانوں میں "یہ گھر۔۔۔" (بشریٰ رحمن) "معمولی آدمی" (سیما پیروز) اور "عید کا فرشتہ" (رونق جمال) بہت پسند آئے۔ اعتبار ساجد کی مزاحیہ تحریر "نیاز مند کے خطوط" موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے زبردست ہے۔ البتہ اس میں انہوں نے اپنے ایک فرضی کردار کے کانوں میں "آلہ مکبر الصوت" لگا دیا جو دراصل LoudSpeaker کا ترجمہ ہے اور جو کانوں میں نہیں بلکہ منہ کے آگے لگتا ہے۔ کانوں میں Hearing Aid یا "آلہ ساعت" لگتا ہے۔ "چند سیپیاں۔۔۔" (پروین شیر) لائق ستائش ہے لیکن اگر وہ اسے ضمیر غائب کے بجائے واحد متکلم کے صیغے میں لکھتیں تو اس کی تاثیر دو چند ہو جاتی کیونکہ قاری تک براہ راست ابلاغ ہوتا۔ بہرحال یہ مصنف کا استحقاق ہے کہ وہ کون سا طرز نگارش اپناتا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یونان کے پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے انہیں خچر کی سہولت میسر نہ تھی۔ نہ جانے یہ کس زمانے کی بات ہے۔ میں گذشتہ اگست میں یونان گیا تھا۔ وہاں کے پہاڑوں پر چڑھ چڑھ اور اتر اتر کر اپنے گھٹنوں کو گھونٹ بیٹھا اور اب شاید بلاشک کے گھٹنے لگیں۔ "متاعِ کوثر۔۔۔" میں کرامت بخاری نے ہمارے عہد کے ایک مجذوب شاعر ساغر صدیقی کا احوال دل گداز انداز میں رقم کیا ہے اور مرحوم کے اچھے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ "ایک صدی کا قصہ" (دیپک کنول) میں اس بار بلراج ساہنی کا تعارف پیش کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا اور متاثر کن ہے۔ آپ نے اعتبار ساجد کی شاعری کے بھی بہت عمدہ نمونے شامل اشاعت کیے۔ استفہامیہ غزل خوب رہی۔ میں ادب سے آپ کی غیر متزلزل وابستگی کو سلام پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

...... میریاں نظماں ......

حنیف باوا پنجابی زبان داوڈّا کہانی کار اے، اوہ اوہناں چند کہانی کاراں وچ اِک ہے، جیہڑے میرے دل پسند نیں۔ سگوں میں اوہداناں بہت معتبر جانداہاں کیوں جے اوہدے موضوعات مختلف نیں۔ دھرتی دے قریب نیں تے ساڈے فوک اتہاس دی زبردست، متاثر کرن والی عکاسی کردے نیں۔ حنیف باوادی زبان بہت چجی تلی اے۔ اوہ لفظ ورتنا جاندا اے۔ اوہ لفظاں دی خوشبو داصحیح اتے اِک سُلکھنا ادیب اے۔

کجھ مہینے پہلاں حنیف باوا بارے ''چہارسُو'' رسالے نیں اِک خصوصی نمبر چھاپیا۔ مینوں دِلی خوشی ایس کارن ہوئی کہ اِک وڈے کہانی کار نوں اِک معتبر رسالے نے اپنا موضوع بنایا اے۔ عام طور تے لاہور توں دُور وسن والے ادیب شاعر ایتھے میڈیا تے اخباراں دے فرمائشی کالماں دی نذر ہو جاندے نیں۔ وڈے شہراں وچ اِک ادبی مافیا ہوندا اے جیہڑا اپنے حواریاں اتے ساتھیاں نوں اگے ودھاندا اے، جہناں وچ اکثر تیسرے درجے دے لکھاری ہوندے نیں۔ حنیف باوا نے مرکز توں دُور رہ کے اپنا کلّا ٹھوکیا اے۔۔۔ اوہنے پنجابی ادب وِچ بہت اُچیرا مقام بنا لیا اے۔ ایہہ اوہدے شاندار فن تے تخلیق گُناں پاروں اے۔

میں حنیف باوادی شاعری چونویں چونویں پڑھی اتے مینوں اوہ ایس میدان وچ وی اُچّے شملے والا جاپدا اے۔ اوہدی ڈِکشن بہت پُرکشش اے۔ اوہدا جذبہ تے مشاہدہ قابلِ تعریف اے۔ اوہ آسان تشبیہاں تے اِستعاریاں وِچ ڈونگھی گل کر جاندا اے۔ صوفی کلام دا دلدادہ ہوون دی وجہ توں اوہدے کلام وِچ انسان دوستی، محبت تے عشق دا گہرا اِدراک پایا جاندا اے۔ اوہدیاں کہانیاں وانگوں اوہ اپنے وسیب، رہتل، تاریخ تے لوک پس منظر نوں شعراں دی شکل دے کے حیران کُن حد تیکر متاثر کردا اے۔ اوہدی اِک لمی نظم ''شاہ حسین'' میرے ایس خیال دا ثبوت اے۔ ''نصرت بھٹو دا اوڑک''، اِک گہرے ملال دی نظم اے۔ حنیف باوادی نظم ''سُنیہا'' وِچ رومانی جذبہ دا اُگھا ثبوت اے۔

حنیف باوا پنجابی نظم دا اِک سچا نمائندہ اے۔ ......**فخر زمان**

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: مثال کتاب گھر، امین پور بازار، فیصل آباد۔

...... عالمی اردو ادب ......

پروین شاکر کے شعر کا مصرعہ ہے: بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

گفتگو کا موضوع اس مصرع کو بنانے کا سبب یہ ہے کہ آپ سے کچھ سچی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چہارسو نے ربع صدی کا سفر جس طرح اور جس انداز میں طے کیا اُس کے آپ شاہد ہیں۔ بہت سے لوگوں کو خوش ہونے کے بجائے ہم سے کسی نہ کسی شکل میں گلہ رہتا ہے۔ کبھی ملکوں کے حوالے سے، کبھی علاقائی حوالے سے، کبھی ذاتی حوالے سے اور کبھی قرطاسِ اعزاز کے انتخاب کے حوالے سے۔ زیادہ گلہ احباب کو اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم پڑوسی ملک (بھارت) جو ہمارا دشمن ہے کے اہلِ قلم کو اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہیں۔ چونکہ استادِ محترم سید ضمیر جعفری کی ہدایت کے مطابق نہ ہم کسی اعتراض کا جواب دیتے ہیں نہ کسی جتھہ بندی کا حصہ بنتے ہیں اور نہ کبھی کسی عزیز یا دوست سے کسی طرح کا تعاون طلب کرتے ہیں۔ اس لیے ہم نے کبھی کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا مگر آج عالمی اردو ادب کے مدیر جناب نند کشور وکرم کی اردو زبان اور پاکستانی ادباء کے حوالے سے خدمات کا ذکر کر کے یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ ہم نے اُن کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی ہندوستانی اہلِ قلم کی خدمت نہیں کی جتنی انہوں نے پاکستانی اہلِ قلم کی خدمت کی اور کر رہے ہیں۔ ہمارے دعویٰ کی روشنی میں زیرِ نظر شمارہ مجلد نہ سہی کمپیوٹر کاپی پر ملاحظہ فرما کر خود فیصلہ کیجیے کہ آیا ہم درست کہہ رہے ہیں یا غلط۔ بھائی نند کشور وکرم اور ہماری تمام تر محبت اور اُنسیت اردو زبان وادب سے ہے خواہ وہ کہیں بھی اور کسی بھی شکل میں لکھا جائے۔ اب دیکھیئے جناب عبداللہ جاوید، جناب جمیل الدین عالی اور محترمہ ادا جعفری پر پاکستان میں کسی جریدے نے خاص نمبر نکالا یا اُن کی خدمات کا اعتراف کیا۔ یہ کام کیا تو کس نے دہلی میں مقیم بھائی نند کشور وکرم نے۔ اگر ہم آپ کو وکرم صاحب کی عمر بتلائیں تو حیرت سے آپ کا منہ کھلا رہ جائے گا۔ ......**گلزار جاوید**

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: F-14/21، کرشن نگر، دہلی، بھارت۔

مت سہل ہمیں جانو

(آیئے میر پڑھے)

''مت سہل ہمیں جانو'' میں عبداللہ جاوید نے عصری، ادبی وسماجی رجحانات اور فکری ونظری عناصر کو میرؔ کے اشعار کی تفہیم کے لئے خوبی سے برتا ہے۔ عبداللہ جاوید خود شاعر ہیں اور ایک حساس اور باشعور انسان ہیں۔ میرؔ کے اس مطالعے سے ہمیں ان کے ذوق کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اوران کی تنقیدی بصیرت کا بھی۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ماشاءاللہ حافظہ بھی قوی ہے اس لئے وہ دوسرے اساتذہ کے اشعار اور دوسری زبانوں کے ادبی حوالوں کو بھی برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مطالعہ صرف تفہیم میرؔ تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ قاری کے وسیع ذوق کی سیرابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ وہ اس نوع کے وقیع کام اس کے بعد بھی جاری رکھیں۔
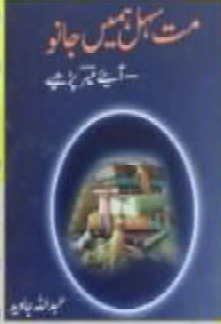
ڈاکٹر جمیل جالبی

ملنے کا پتہ: اکادمی بازیافت۔ آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی ۔ فون: ۳۲۷۵۱۴۲۸

آگ کا دریا ----- ایک مطالعہ

''آگ کا دریا'' جیسے ادبی شاہکاروں کے بارے میں ہماری تنقید کا لہجہ بالعموم بہت رسمی ہوتا ہے۔ اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ نقاد ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے در اصل اپنی قابلیت کا تاثر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ عبداللہ جاوید نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے بہت عام سے لہجے اور بہت سادگی سے اس ناول پر گفتگو کا آغاز کیا لیکن جلد ہی ان کی گفتہ رسی اور ناول کا گہرا مطالعہ ان کی گفتگو پر ہماری پوری توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ اس ناول کے بارے میں ان کے سوچنے کا انداز ہی نہیں اپنی رائے کے اظہار کا قرینہ تک مختلف ہے۔ ذمے داری سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ پوری کتاب اور اس کے جملہ ابواب پڑھنے کے لائق ہیں۔ اور ہمیں غور و فکر کے کئی زاویے فراہم کرتے ہیں۔ عبداللہ جاوید نے اپنی اس کتاب کو ناول کی رفیق مطالعہ کتاب کہا ہے۔ انگریزی میں ایسی کتابیں بہت لکھی گئی ہیں، لیکن ہمارے پاس ایسے کاموں کا کوئی رواج نہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ہماری تنقید کے باب میں ایک نئی کاوش اور ایک تازہ ہوا کے جھونکے کا درجہ رکھتی ہے۔

سیّد مظہر جمیل

ملنے کا پتہ: اکادمی بازیافت۔ آفس نمبر ۱۷، کتاب مارکیٹ، گلی نمبر ۳، اردو بازار، کراچی ۔ فون: ۳۲۷۵۱۴۲۸